ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

دار التالیف و الترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ حافظ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر بھی اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادت کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت اور حقارت کے بہت سے پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی بھی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۱۸×۲۲ ۔ صفحات ۵۶، قیمت ۳/-

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدارس اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہتے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک مجمع میں پڑھوا کر سنوایا۔ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۱۸×۲۲ ۔ صفحات ۱۰۰ ۔ قیمت ۵۰/۱

اسلامی تعلیم

حصہ اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے، اور مسائل ایسے آسان طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز [illegible] قیمت حصہ اول [illegible]، دوم [illegible]، سوم [illegible]، چہارم [illegible]

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین سے شائع ہوا تھا۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس پر مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے [illegible]

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے شاہ پریس شاہ گنج میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
12/= لو

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد
جامعۃ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے =/25
خصوصی معاون =/100
قیمت فی پرچہ 2/50

جلد ۱۳ | جنوری فروری و مارچ ۱۹۸۶ء مطابق رجب و شعبان ۱۴۰۶ھ | شمارہ ۵۴-۵۵

فہرست مضامین

(مجلس ادارت)

رشحات

مسلم پرسنل لا، کے سلسلہ میں "الرشاد" میں راقم الحروف نے سات مہینے کے اندر تقریباً اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، آج ہم دستور کے ایک خاص پہلو کی طرف مسلم پرسنل لا، بورڈ کے ممبران اور دوسرے علماء، اور اہل علم کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ دستور میں کچھ دفعات بنیادی حقوق — (Fundamental Rights) کے طور پر شامل ہیں، اور کچھ دفعات رہنما اصول (Directive Principles) کے طور پر شامل ہیں، قانون داں حضرات عام طور پر بنیادی حقوق کو راہنما اصول کے مقابلہ میں زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اور حکومت کے افراد اپنے مفاد کے تحت راہنما اصولوں کو اہمیت دیتے ہیں مگر بدقسمتی سے دونوں گروہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں انھیں پامال کیا ہے، جس کی تفصیل ہم گزشتہ پرچے میں کر چکے ہیں،

میری گزارش یہ ہے کہ ہماری کوشش یہ بھی ہونی چاہیے کہ پارلیمنٹ میں ایک بل اس بارے میں آجائے، کہ دستوری طور پر بنیادی حقوق کو راہنما اصولوں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت ہے، بنیادی حقوق کو اس لیے زیادہ اہمیت ہے کہ ان کی دستوری حیثیت دستور سازی کے وقت سے تسلیم شدہ ہے، اور بین الاقوامی حیثیت سے بھی ان کی اہمیت زیادہ ہے، اور راہنما اصولوں کی حیثیت مشورہ کی ہے، جو حکومت کے مزاج اور حالات کے تابع ہے، اگر دونوں کے درمیان یہ خط امتیاز کھینچ دیا جاتا تو آئندہ ہندوستان کی اقلیتوں کے دل میں تحفظ ہی نہیں بلکہ... تحفظ کا احساس بھی پیدا ہو جاتا، اور ان کے بہت سے شبہات آپ سے آپ دور ہو جاتے،

مسلم پرسنل لا، کے تحفظ کے لیے اس وقت مسلمانوں کے اندر جو جوش، ولولہ اور پرشور جذبہ دکھائی دے

رہا ہے، وہ ہر طرح لائق تحسین ہے، مگر اس سلسلہ میں ہمارے ذمہ داروں اور خاص طور پر علماء پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک یہ کہ منفی جوش اور جذبہ کو ہم زیادہ سے زیادہ مثبت رخ دے دیں یعنی ہم مسلمانوں کی عملی زندگی میں بھی شریعت کو نافذ کرنے کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دیں اور ان پر واضح کر دیں کہ اگر واقعی پوری شریعت ہماری زندگیوں میں دکھائی دیتی تو اس پر حکومت کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اس وقت مسلمانوں کے اندر جو مذہبی جذبات پیدا ہو گیے ہیں اور شریعت اور دینی قدروں کے احترام کا جو پرشور احساس زندہ ہوا ہے، اس سے اگر ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ہماری اس کوتاہی کی اللہ تعالٰے کے حضور میں سخت گرفت ہوگی،

دوسری ذمہ داری ہم پر یہ عائد ہوتی ہے کہ ہم نظر رکھیں کہ اس جذبہ کو سیاسی اور مفاد پرست لوگ نہ تو غلط رخ پر ڈال سکیں اور نہ اس کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کر سکیں، بارہا ایسا ہوا ہے کہ چند لوگ اصل مسئلہ سے توجہ ہٹا کر اس عمومی جذبہ کا رخ فروعی اور طبقہ واری مسائل کی طرف پھیر دیتے ہیں، اور بہت سے خدشات کا ہوا کھڑا کر کے اپنے کچھ سطحی مفادات کے لیے اس جذبہ کو سرد کر دیتے ہیں، خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک بہت بڑا ملی المیہ ہوگا۔

مسلمانوں کو ان حالات میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کرلینی چاہیے کہ ۳۷ برس سے ہماری سیکولر حکومت اور فرقہ پرست طاقتوں نے ہم کو منفی مسائل میں اس لیے الجھا رکھا ہے، تاکہ مثبت طور پر ملی ترقی کا کوئی کام ہم نہ کرسکیں، سب سے پہلے فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے، اردو زبان کو ختم کیا گیا کہ مسلمان اپنی اسلامی تہذیب سے کٹ جائے، مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ پیدا کیا گیا، مسلم پرسنل لا کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی، مذہبی مقامات کی بے حرمتی کی گئی، مگر ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مسلمان ان منفی مسائل سے بھی نبرد آزما ہوئے، اور علمی و دینی اور اقتصادی ترقی کے مثبت پروگرام سے بھی وہ غافل نہیں ہوئے، انھوں نے ہر محاذ پر منفی لڑائی کے ساتھ مثبت اقدامات بھی کیے، مگر ابھی ہمیں مزید اقدامات کرنے ہیں،

ہمیں سب سے پہلے اپنے تعلیمی محاذ کو مضبوط کرنا ہے، پورے ہندوستان میں اور خاص طور پر اتری ہندوستان میں مسلمانوں کو اردو زبان سے اپنا رشتہ زیادہ سے زیادہ رکھنا ہے، شرعی احکام کو

اپنی زندگی میں نافذ کرکے مسلم پرسنل لا کا عملاً مظاہرہ کرتا ہے، اپنی مسجدوں کو آباد رکھتا ہے تاکہ دوسروں کو اس میں مداخلت کی جرأت نہ پیدا ہو، ہمیں زیادہ سے زیادہ رفاہی ادارے اور غیر سودی بینک قائم کرنا ہے تاکہ مسلمان سودی قرضوں سے بچ سکیں، اور ان کی اقتصادی حالت درست ہو، اور برادران وطن رفاہی کاموں کے ذریعہ ہماری افادیت محسوس کرسکیں، ہم اس ملک میں لینے کی پوزیشن میں نہ رہیں بلکہ دینے کی پوزیشن میں رہنا پسند کریں۔

آزادی کے بعد سے اب تک لاکھوں مسلمان شہید کیے جا چکے ہیں، ہزاروں عورتیں بیوہ ہو چکی ہیں اور ہزاروں بچے شہید ہوئے ہیں، اور پچاسوں کروڑ کی مسلمانوں کی جائدادیں اور کاروبار اور دکانیں برباد ہو چکی ہیں، ان خونچکاں واقعات سے مسلمانوں کا دل چھلنی ہو گیا ہے، مگر اب تک خود مسلمان زیادہ تر صبر وضبط سے کام لیتے رہے ہیں، اور ہمارے راہنماؤں نے بچاؤ اور احتیاط کی اتنی زیادہ تلقین کی کہ مسلمانوں میں خوف و ہراس ہی نہیں بلکہ بزدلی پیدا ہونے لگی، مگر جب ان کے آخری قلعہ یعنی شریعت اسلامی پر حملہ شروع ہو گیا، تو مسلمانوں میں خود بھی اور راہنماؤں کی کوششوں سے یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر ہم اپنے اس آخری قلعہ کو بھی نہ بچا سکے تو پھر ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا وجود خطرہ میں پڑ جائیگا یہی وجہ ہے کہ اب مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، اور وہ سڑکوں اور میدانوں میں نکلنے پر مجبور ہو گیے ہیں، ہمارے راہنماؤں نے بھی اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے، اس لیے اپنے راہنماؤں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ایسے حالات نہ پیدا ہونے دیں، کہ حکومت یا برادر وطن غیر اختیاری طور پر ہم کو جانی ومالی نقصان پہنچا سکیں، بلکہ اب اختیاری طور ہم سے جان ومال کی قربانی مانگیں، مسلمان یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت کی حرمت کے لیے کر رہا ہے، اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے، اس لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا یہ وعدہ ضرور پورا کرے گا،

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ

اور ہم کو سلطان ٹیپو مرحوم کی یہ وصیت یاد رکھنی چاہیے:

”شیر کی ایک دن کی زندگی لومڑی کی ہزار سال کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔“

مسلم پرسنل لا، کا مسئلہ برسوں سے قابل بحث بنا ہوا تھا، مگر ادھر سپریم کورٹ کے ایک غلط فیصلہ کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر غیر معمولی اشتعال اور غصہ پیدا ہوگیا، اور آٹھ مہینے سے پورے ہندوستان میں اس کے خلاف جلسے اور احتجاج ہو رہے ہیں، مگر اب تک عام ہندوؤں کے اندر اس کا کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا، اس لیے فرقہ پرستوں اور عدلیہ اور خود حکومت نے اس موقع پر بابری مسجد کے ایک ۴۳۵ برس پرانے مسلمانوں کے مطالبہ کو ٹھکرا کر اسے ہندوؤں کے حوالہ کر دیا، جس سے وہ اپنے دو مقاصد حل کرنا چاہتی ہے، ایک یہ کہ مسلمانوں کی توجہ مسلم پرسنل لا جیسے اہم مسئلہ سے ہٹ جائے، دوسرے ہندو اور مسلمانوں کو براہ راست ٹکرا دیا جائے، اسی لیے حکومت کے بیانات، ٹی وی کے پروگرام اور نیشنل پریس کے ذریعہ بابری مسجد کے بجائے رام جنم بھومی کا نام دے کر ہندوؤں کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارا گیا، اس لیے مسلمانوں کو اس کو سمجھتے رہنا چاہیے کہ ہماری لڑائی ہندوؤں سے نہیں، بلکہ براہ راست فرقہ پرست طاقتوں، حکومت اور عدلیہ کی ناانصافی سے ہے، اگر ہم اس بات کو ذہن میں نہ رکھیں گے تو ہمارا کیس کمزور ہو جائے گا، اور ہم کو دوسرے بہت سے مسائل میں الجھا دیا جائے گا،

ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو ۱۸۸۵ء سے چل رہی تھی، ستیہ گرہ بھی ہوئیں، لوگ جیل بھی گئے، گاندھی کا چرخا بھی چلا، مگر دوسری جنگ عظیم کے درمیان یعنی ۱۹۴۴-۴۵ء میں جب سوبھاش چندر بوس نے اپنی نیشنل آرمی بنائی اور باہر پڑی ہوئی فوج میں بغاوت پیدا کی تو انگریزوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہندوستان کو غلام رکھنا آسان نہیں ہے، چنانچہ جنگ ختم ہوتے ہی آزادی کی بات شروع ہوگئی اور دو برس بعد ملک آزاد ہوگیا، اسی طرح ہمارے راہنماؤں اور اکابر کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ دستور کی دفعہ ۴۴، دستور ساز اسمبلی نے سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں بنائی، اور فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ سنہ ۱۹۷۳ء میں بنی، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل سنہ ۱۹۷۲ء میں ہوئی، اور ہمارے اکابر برابر جلسے کر کے حکومت سے اپیل کرتے رہے کہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کی جائے۔ حکومت کے ذمہ دار بیان بھی دیتے رہے کہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ ہوگی، مگر ہوتی رہی، لیکن سنہ ۱۹۸۵ء میں آپ کی اور کچھ دوسرے لوگوں کی کوششوں بلکہ صحیح یہ ہے کہ تائید غیبی کے طور پر جب یہ مسئلہ عوام کی عدالت میں پہنچ گیا، تب جا کر حکومت کے کان پر جوں رینگی، اور انھوں نے آپ سے ملاقات کی اور دفعہ ۱۲۵ کی خامیوں کے دور کرنے پر آمادہ ہوگئی، بابری مسجد کی

قانونی لڑائی ۳۵ برس سے لڑی جا رہی تھی، مگر اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے، اس لیے میری گذارش ہے کہ اس کا فیصلہ بھی آپ عوام کی عدالت سے ہونے دیجئے، آپ ان کی راہنمائی ضرور کریں تاکہ ان کے جذبات غلط رخ اختیار نہ کرنے پائیں، مگر خدا کے واسطے ان کو زیادہ دبانے اور سرد کرنے کی کوشش نہ کیجئے، اگر ۱۹۴۹ء میں ہی مسلمانوں نے جان پر کھیل کر بابری مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ کر لیا ہوتا تو حکومت کے اشارہ پر عدلیہ کو بددیانتی کرنے کا موقع نہ ملتا، اور نہ ہمیں یوم سیاہ منانے کی دل خراش ضرورت پیش آتی،

ابھی ہمیں اپنی بہت سی حق تلفیوں کو عوام کی عدالت سے طے کرانا ہے،

معذرت وندامت

ہم ناظرین الرشاد کے سامنے حد درجہ شرمندہ ہیں کہ ان کو تین مہینے سے الرشاد کے مطالعہ سے محروم رہنا پڑا، جسکی وجہ سے ان کے دل میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہوئیں اور تکلیف پہنچی، مگر ناظرین کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس میں ہماری کوتاہی کو کم دخل ہے بلکہ بعض خارجی موانع کی وجہ سے کوتاہی ہوئی جن کے لئے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

اس پرچہ کو آپ تین مہینہ کا تصور کریں انشاء اللہ صفحات کی جو کمی رہ گئی ہے وہ ہم دو تین پرچوں میں پورا کر دیں گے۔

خانہ کعبہ اور بنی اسماعیل کے

فضائل و خصوصیات

(استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ)

قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں پچھلی قوموں کے جو قصے بیان ہوئے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کے عدل و حکمت کی بے شمار نشانیاں پنہاں ہیں، ان پر غور کرنے سے مکہ اور اہل مکہ، یروشلم اور اہل یروشلم کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے چند اہم پہلو بیان کرتے ہیں، اور اس بحث میں بیشتر حوالہ تورات سے ہوگا تاکہ ہمارے نتائج بحث اہل کتاب پر حجت ہو سکیں،

(۱) — سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خانہ کعبہ دین الٰہی کی اصل و اساس ہے، یہ پہلا گھر ہے جو توحید اور غربا پروری کا مرکز ہوا، خانہ کعبہ کی اس خصوصیت کا بیان تورات میں بھی ہے، لیکن یہود نے اس پر پردے ڈال دیے ہیں، لیکن صاحب نظر آج بھی اس کی جھلک تورات میں دیکھ سکتا ہے، مفصل بحث آیت ذیل کی تفسیر میں گزر چکی ہے،

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي	بے شک عبادت کا پہلا گھر جو لوگوں کیلئے
بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝	تعمیر ہوا وہی ہے جو مکہ میں ہے، سراپا خیر و
فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ	برکت اور دنیا والوں کیلئے ہدایت، اس میں
وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى	کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کی سکونت،
النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ	جو شخص اس میں داخل ہوا وہ مامون ہے اور

إِلَيْهِ سَبِيلًا ۝	لوگوں میں سے جو وہاں جا سکتے ہوں، ان
(آل عمران (۹۶ — ۹۷)	پر خدا کے لیے اس گھر کا حج کرنا ہے ،

اس آیت میں اس گھر کے اوّلین عبادت گاہ اور بنائے ابراہیمی ہونے کی تین دلیلیں بیان فرمائی ہیں پوری تشریح آیت کی تفسیر کے ذیل میں گذر چکی ہے، یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا پہلا گھر خدا کی حفاظت کا زیادہ حقدار تھا، کیونکہ وہی دین کی اصلی بنیاد تھا، یروشلم کی مسجد جیسا کہ تورات سے معلوم ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر ہے، اس سے پہلے یہود کے پاس کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ سلاطین باب ۸ ۱۶ میں ہے:

"جس دن سے میں اپنی گروہ اسرائیل کو مصر سے نکال لایا تب سے میں نے سارے اسرائیلی فرقوں میں سے کسی شہر کو جس میں میرا گھر بنایا جائے اور اس میں میرا نام ہو چن نہ لیا"۔

(۲) — خانہ کعبہ کی فضیلت کا دوسرا پہلو اس کے بانی کی عظمت ہے، اس کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی، برعکس اس کے بیت المقدس کو، جیسا کہ تورات میں تشریح اور قرآن میں اشارہ ہے، پابند اور محکوم مزدوروں نے بنایا، پھر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کے وقت دعا فرمائی،

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ	اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ
الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا	کی بنیادیں اس دعا کے ساتھ اونچی کر رہے
إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝	تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہماری دعا
(سورۃ البقرۃ — ۱۲۷)	قبول فرما، بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے"

حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کے لیے امن و برکت کی دعا فرمائی اور چاہا کہ یہ امن و برکت صرف مومنین کیلئے مخصوص ہو، لیکن اللہ تعالیٰ اس مقدس گھر کی برکتوں کو دنیا کی زندگی میں مومن و کافر دونوں کیلئے عام کر دیا،

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ	اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے دعا کی اے
هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ	پروردگار اس کو پر امن سرزمین بنا، اس کے
مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ	ساکنوں کو پھلوں کی روزی دے جو ان میں
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ	سے اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں، خدا
وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا	نے فرمایا اور جو کفر کریں گے ان کو بھی کچھ دن

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ، (دنیا کی زندگی میں) نفع پہونچاؤں گا، پھران کو آگ کے عذاب کی طرف ڈھکیلوں گا اور وہ بُرا ٹھکانا ہے، (البقرہ ۱۲۶)

خانہ کعبہ کی حرمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات پسند نہ فرمائی کہ ابراہیمؑ کی اولاد اپنی ناشکری کی اس پرامن زمین میں پائے، اس کے برعکس مسجد یروشلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا، وہ سلاطین (ب ۹ (۱۔ ۹) میں یوں مذکور ہے:

"اور ایسا ہوا کہ جب سلیمان خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر بنا چکا اور سلیمان کی ساری تمنا جو اس کے دل میں تھی پوری ہو چکی، تو خداوند سلیمان کو دوسری بار دکھائی دیا جس طرح کہ جبعون میں دکھائی دیا تھا اور خداوند نے اس سے کہا، میں نے تیری دعا اور تیری مناجات جو تو نے میرے آگے کی سنی ہے اور اس گھر کو جو تو نے بنایا کہ میرا نام ابد تک اس میں رہے مقدس کیا، سو میری نگاہ اور میرا دل سدا اسی پر رہے گا اور اگر تو میرے حضور اسی چال چلے گا جیسے تیرا باپ داؤد دل کی راستی اور صداقت سے چلا اور ان سب حکموں پر جو میں نے تجھ سے کئے عمل کرے گا اور میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو حفظ کرے گا تو میں تیری سلطنت کا تخت اسرائیل میں ہمیشہ قائم رکھوں گا، جیسے میں نے تیرے باپ داؤد سے وعدہ کیا اور کہا کہ تیرے یہاں مرد کی کمی نہ ہوگی، جو اسرائیل کے تخت پر بیٹھے، پر اگر تم یا تمہاری اولاد میری پیروی سے کسی طرح برگشتہ ہو گے اور تم میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو جو میں نے تمہیں بتائیں، حفظ نہ کرو گے اور اجنبی معبودوں کو عبادت کرنے جاؤ گے اور انہیں سجدہ کرو گے تو میں اسرائیل کو اس سرزمین سے جو میں نے انھیں دی ہے فنا کردوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے اپنی نظر سے گرادوں گا، اور اسرائیل تمام جہاں میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا، اور اس بلند گھر کے برابر سے جو کوئی گزرے گا حیران ہوگا اور سیٹی بجائے گا، اور وہ کہیں گے خداوند نے اس سرزمین اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا تب وہ جواب دیں گے، یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے خداوند اپنے خدا کو جو ان کے باپ دادوں کو زمین مصر سے نکال لایا ترک کیا اور اجنبی معبودوں کو اختیار کیا

اور نہیں سجدہ کیا، اور ان کی بندگی کی اس لیے خداوند نے ان پر یہ سب بلا نازل کی۔"

بعینہٖ یہی مضمون پرمیاہ ب ۷ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضوع قلب اور تقوی کے ساتھ اگر حقیر سے حقیر چیز بھی خدا کے حضور میں پیش کیجائے تو قبولیت کی عزت پاتی ہے، ہابیل و قابیل کے قصہ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ہر چند ان دونوں مقدس مسجدوں کی بنا تقوی اور محبت الہٰی پر ہے۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے، مسجد یروشلم قیمتی پتھروں اور سونے چاندی کی ایک تعمیر تھی جو مقہور و مجبور مزدوروں کے ہاتھوں بنی تھی، (سلاطین ب ۵ - ۱۲)

(۴) خانہ کعبہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنایا، اس کے لیے ان کو آبائی وطن سے ہجرت کا حکم ہوا، اس کی جگہ کی تعیین خود خدا نے فرمائی، اور ہوشیار کر دیا کہ جو لوگ اس مقدس گھر میں الحاد اور شرک کے مرتکب ہوں گے اور اس کی حرمت کو بٹہ لگائیں گے اللہ تعالیٰ ان کو غارت کرے گا، چنانچہ اصحٰب فیل کے ساتھ اس نے ایسا ہی کیا، یہ چاروں باتیں جو قرآن میں مذکور ہوئی ہیں، توراۃ میں اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہیں ہیں، کیونکہ یہود نے ان کو نکال دیا ہے، تاہم کچھ مخفی اشارات باقی ہیں جو قرآن کی تائید کرتے ہیں، مسجد یروشلم کا حال یہ نہیں ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک عبادتگاہ بنانی چاہی لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ کام سلیمانؑ کے ہاتھوں انجام پائے گا، چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے جس طرح اور جس جگہ مناسب سمجھا اس کی تعمیر کی، سموئیل ثانی (باب ۱ - ۱۷) میں ہے،

"اور ایسا ہوا کہ جب بادشاہ گھر میں بیٹھا تھا اور خداوند نے اسے اس کے سارے دشمنوں کی بابت ہر ایک طرف سے آرام بخشا تو بادشاہ نے ناتن نبی کو کہا دیکھیے تو میں سرو کی لکڑیوں کے گھر میں رہتا ہوں، پر خدا کا صندوق پردوں کے درمیان رہتا ہے، تب ناتن نے بادشاہ کو کہا کہ جا سب کچھ تیرے دل میں ہے کر خداوند تیرے ساتھ ہے، اور اسی رات ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا اور اس نے کہا کہ جا اور میرے بندے داؤد سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ کیا تو میرے لیے ایک گھر جس میں میں رہتا ہوں بنانا چاہتا ہے؟ سو میں جب سے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا آج کے دن تک کسی گھر میں نہیں رہا، بلکہ خیمے یا مسکن میں پھرتا رہا، اور جہاں جہاں میں سارے اسرائیلیوں کے ساتھ پھرتا رہا، تو کیا

میں نے کسی اسرائیلی فرد کو جسے میں نے حکم کیا کہ میرے اسرائیلی گروہ کی رعایت کرے، کہا ہے
کہ تم میرے لیے سرو کا گھر کیوں نہیں بناتے؟ سو اب تو میرے بندے داؤد سے ایسا کہہ
کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالے میں سے جہاں تو بھیڑیں چراتا تھا
اٹھا کے اپنی قوم اسرائیل کا حاکم کیا، اور میں جہاں جہاں تو گیا تیرے ساتھ رہا اور تیرے سارے
دشمنوں کو تیرے سامنے مارا اور میں نے ان لوگوں کی مانند جن کا نام دنیا میں بڑا ہے تیرا نام
بڑا کیا، سو اس کے میں اپنی گروہ اسرائیلی کے لیے ایک مکان مقرر کروں گا اور وہاں انہیں لگاؤں گا
تاکہ اپنے خاص مکان میں بسیں اور پھر آوارہ نہ ہوں، اور شرارت کے فرزند آگے کی طرح انکو
دکھ نہ دیں گے، اور نہ اس دن کی طرح جس دن سے میں نے قاضیوں کو مقرر کیا کہ میری اسرائیلی
گروہ پر حاکم ہوں اور تجھ کو تیرے سارے دشمنوں سے آرام دیا، پھر خداوند تجھ کو فرماتا ہے
کہ تیرے لیے گھر بھی بناؤں گا اور جب کہ تیرے دن پورے ہوں گے اور تو اپنے باپ دادوں
کے ساتھ سو رہے گا تو میں تیرے بعد تیری نسل کو جو تیری صلب سے ہوگی برپا کروں گا
اور اس کی سلطنت کو قائم کروں گا، وہی میرے نام کا ایک گھر بنائے گا، اور اس کی سلطنت
کا تخت ابد تک قائم رکھوں گا، اور میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا، سو اگر وہ
کوئی خطا کرے گا تو میں اسے آدمیوں کے اور بنی آدم کے تازیانوں سے تنبیہ کروں گا، پر
میری رحمت اس سے جدا نہ ہوگی جس طرح کہ میں نے اسے ساول سے جدا کیا، جس کو کہ میں نے تیرے
آگے سے دفع کیا بلکہ تیرا گھر اور تیری سلطنت ہمیشہ تک تیرے آگے قائم رہے گی، تیرا
تخت ہمیشہ ثابت ہوگا، سو ناتن نے ان ساری باتوں کو اور اس ساری خواب کے مطابق
داؤد سے کہا۔"

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر شروع کی تو یہ وحی آئی (سلاطین ۶ ۱۱-۱۳)

"اس وقت خداوند کی طرف سے سلیمان پر کلام اترا اور اس نے کہا کہ اس گھر کی بابت جو
تو بناتا ہے، اگر تو میری شریعتوں پر چلے گا اور میری عدالتوں پر عمل کرے گا، اور میرے
احکام کو ان پر چلنے کے لیے حفظ کرے گا تو میں اپنے سخن کو جو میں نے تیرے باپ داؤد
سے کہا ہے تیرے ساتھ پورا کروں گا، اور میں بنی اسرائیل کے درمیان رہوں گا، اور

اپنی قوم اسرائیل کو ترک نہ کروں گا"۔

(۴)۔ خانہ کعبہ کمال اسلام کی تصویر ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کی، اور انہی باپ بیٹوں نے مل کر اس کی تعمیر اور خدا سے اس کی قبولیت کی دعا کی، ہر چند یہود نے توراۃ میں اس قصے کو بہت کچھ بدل ڈالا ہے، لیکن ان کا جھوٹ بالکل آشکارا ہے، انھوں نے زیادہ سے زیادہ صرف یہ کیا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ حضرت اسحٰقؑ کا نام رکھ دیا ہے، سورۂ والصّٰفّٰت میں یہ بحث کسی قدر تفصیل سے گزر چکی ہے، اور اس موضوع پر "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" کے نام سے ہمارا ایک مستقل رسالہ بھی ہے،

(۵)۔ حضرت ابراہیمؑ کی جو ذریت جوار حرم میں آباد ہوئی، صبر و رضا اس کے فضائل اخلاق کا سب سے زیادہ نمایاں عنصر تھا، قرآن اور یہود کے صحیفے دونوں اس حقیقت پر شاہد ہیں، ہر چند یہود کے صحیفوں کی شہادت تحریفات کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے لیکن اتمام حجت کے لیے ہم ان سے بھی تعرض کریں گے، قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیم کی جو اولاد حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے تھی اس کو انھوں نے ایک شاداب و زرخیز زمین میں آباد کیا جس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری تھیں، اور ان کی جو اولاد حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھی اس کو بیت اللہ الحرام کے پاس ایک وادی غیر ذی زرع میں بسایا، یہود کے صحیفوں میں ان دونوں قبیلوں کی علٰحدگی کی وجہ یوں بیان کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے اولاد بخشی تو حضرت سارہؑ کو رشک ہوا، اور انھوں نے حضرت ہاجرہؑ کے ساتھ بدسلوکی کی، حضرت ہاجرہؑ نے یہ ذلت و تکلیف نہایت صبر کے ساتھ برداشت کی، جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو برکت دی اور اس کا فرشتہ دو مرتبہ ان سے ہمکلام ہوا، حضرت سارہؑ اس شرف سے محروم ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ مذہبی صحیفوں میں وارد ہے کہ خدا کی نوازش مظلوموں اور شکستہ دلوں کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہے، (پیدائش ب ۱۶: ۱۰)

" پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا (یعنی گریہ وزاری)

پیدائش (ب ۲۱: ۱۷-۱۸) میں ہے:۔

"اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہؑ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

ہرچند یہود نے حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ میں بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش کر دی ہے جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں، تاہم اپنی خواہش کے خلاف انھوں نے بہت سی ایسی باتوں کا اعتراف کر لیا ہے جو ان کے خلاف حجت ہیں،

(۲)۔۔۔ بنی اسماعیلؑ کی فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنی اسحٰقؑ کی بدسلوکیوں کے باوجود انھوں نے ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا، خود یہود کی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت سارہؑ تحقیر کی وجہ سے حضرت ہاجرہؑ کو لونڈی کہتی تھیں، اور یہ بری سنت ان کی اولاد میں بھی باقی رہی، چنانچہ بنی اسحٰق بنی اسمٰعیل کو کنیز کی اولاد کہتے تھے، حالانکہ یہ بات بالکل خلاف حقیقت تھی، بالآخر اس کا انجام ہوا کہ حضرت سارہؑ کی اولاد مصر میں غلام ہو کر بکی، (پیدائش ب ۳۷: ۲۵-۲۸) میں ہے:-

"اور وہ روٹی کھانے بیٹھے اور آنکھ اٹھائی اور دیکھا کہ اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے گرم مصالحہ اور روغن بلسان اور مرّ اونٹوں پر لادے ہوئے آتا ہے کہ انھیں مصر کو لیجائیں، تب یہودا نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا، آؤ اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچیں اور اس پر اپنا ہاتھ نہ ڈالیں کہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا گوشت ہے اور اس کے بھائی راضی ہوئے اور اس وقت وہ مدیانی سوداگر ادھر سے گذرے سو انھوں نے یوسف کو کھینچ کے کنوئیں سے باہر نکالا، اور اسماعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کو بیچا اور وہ یوسف کو مصر میں لائے"

اس روایت میں بھی ایک اہم بات بالکل چھپا دی گئی ہے، لیکن اس وقت ہم اس کو کریدنا نہیں چاہتے یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا، یہ ان کی غلامی کی تمہید تھی اس کے بعد ایرانیوں، مصریوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے ان کو گرفتار کیا اور غلام بنایا، اس کے بعد حضرت ہاجرہؑ کی اولاد اپنی پوری تاریخ میں کبھی غلامی کی ذلت سے آشنا نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کی حفاظت فرمائی، بلکہ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گذر چکا ہے

ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں سے خریدا، اور اب ایک عرصہ سے صرف ممالک اسلامیہ ہی ان کے لیے جائے پناہ ہیں، اور اگر وہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، تو جیسا کہ قرآن مجید اور توراۃ میں وعدہ ہے، آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام ہوگا، اور الحمد للہ اس اقدام سعادت کے آثار شروع ہوگئے ہیں،

ان تمام حالات پر غور کرو، کسی موقع پر بھی بنی اسماعیل نے ان کو غلام بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جس طرح ایک شریف بھائی ہر موقع پر اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اسی طرح انھوں نے ہر موقع پر ان کی مدد کی اور ان کے دشمنوں سے ان کی ذلتوں کا انتقام لیا، یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے خود بیچا تھا، لیکن انھوں نے ان کو غلام بنا کر رکھنا پسند نہیں کیا، بلکہ

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ (یوسف: ۲۰)

اور انھوں نے یوسفؑ کو معمولی قیمت چند درہموں پر بیچ دیا، اور وہ اس سے بے رغبت تھے،

(۷) ـــ ایک قابل لحاظ حقیقت یہ بھی ہے کہ بنی اسماعیل کو بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدا سے زیادہ لگاؤ رہا ہے، شرارتوں اور بت پرستی کے علاوہ بارہا ایسا بھی ہوا کہ یہود اس منعم حقیقی کو یک قلم چھوڑ بیٹھے، توراۃ میں متعدد مقامات پر ان کے شرک کے ساتھ خدا سے ان کی بالکلیہ علٰحدگی کا ذکر بھی آیا ہے (دیکھو یرمیاہ ۲) لیکن عربوں نے کسی دور میں بھی اپنے قدیم خدا کا دامن نہیں چھوڑا، البتہ انھوں نے اس کے دربار کے لیے بہت سے سفارشی ٹھہرا لیے تھے، جن کو نصاریٰ کی طرح خدا کے بیٹوں اور بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ،

ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدائے برتر سے قریب کردیں۔

سورۂ یونس میں ہے:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا

وہ خدا کے علاوہ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو ان کو کسی طرح کا نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے حضور

شفعاؤنا عند الله (یونس - ۱۸) ہمارے سفارشی ہیں،

انھوں نے خدا سے بالکلیہ علیحدگی کبھی اختیار نہیں کی، وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے، اس کے نام کی تکبیر کہتے تھے، اس کی عبادت و پرستش کرتے تھے، اس لیے یہود کا کفر عربوں کے کفر سے زیادہ سخت و شدید تھا۔

(۸) — یہود کے مقابل میں بنی اسماعیل کا عذر بھی زیادہ واضح ہے، وہ اپنے دین سے اس وقت ہٹے جب امتداد زمانہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات بالکل فراموش ہو گئیں، اور کوئی دوسرا نبی تذکیر و یاددہانی کے لیے مبعوث نہیں ہوا، بلکہ اس کے باوجود ان میں ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد باقی رہی جو دینِ حنیفی پر قائم اور بت پرستی سے متنفر تھے، برعکس اس کے یہود نے اس نبی کے سامنے گوسالہ پرستی کی جن پر ایمان لائے تھے اور جن کے حیرت انگیز معجزات کا قدم قدم پر مشاہدہ کر رہے تھے، پھر نبی کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد بار بار بت پرستی کی لعنتوں میں گرفتار ہوئے، تورات کی کتاب القضاۃ اور سلاطین میں یہ تفصیلات مذکور ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انذار اور اتمام حجت کے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتا،

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا	ہم اس وقت تک کسی قوم کو سزا نہیں دیتے جب تک اس کے پاس ایک رسول نہ بھیج لیں،
(الاسراء - ۱۵)	

بظاہر یہی وجوہ و اسباب ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس مقدس گھر کی ہمیشہ حفاظت کی، وللہ الحمد

چند اشارات

بنی اسرائیل اور مسجد یروشلم کے مقابل میں، بنی اسماعیل اور خانہ کعبہ کے جو خصوصیات و فضائل اوپر بیان ہوئے ہیں، ان میں بعض اہم اشارات ہیں، جن میں سے چند، بعض شبہات کے ازالہ کے لیے ہم بیان ذکر کرتے ہیں:

۱- بندہ کے لیے یہ بات کبھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا سے مدعیانہ مطالبہ حقوق کرے اور یہ سمجھے کہ چونکہ اس میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں اور اس کے تمام کمالات اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہیں، اس لیے اس کا منصب صرف تذلل و استکانت ہے، جو چیزیں بظاہر ایک طرح کی فضیلت نظر آتی ہیں وہ

وہ بھی خدا کی طرف سے رحمت کا ایک بہانہ ہے، ایک شخص اگر دعا کرتا ہے تو اس کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس نے خدا پر کوئی احسان کر دیا، یا کوئی ایسا کارنامہ انجام دے دیا ہے جس کے بعد وہ خواہ مخواہ خدا کی طرف سے اجر کا مستحق ہو گیا ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ صرف یہ خیال کرنا چاہیے کہ جس رحمٰن و رحیم کی عنایات سے بندہ بن مانگے ہر آن بہرہ مند ہے، وہ مانگنے والے اور گڑگڑانے والے کو اپنے در سے کبھی محروم نہیں لوٹائیگا،

قرآن مجید اور توریت و انجیل میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے، خدا بُرے اور بھلے دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرے گا، اس کے لیے اس نے آزمایش اور امتحان کا قانون رکھا ہے، اسی قانون کے بموجب اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا، انھوں نے اپنے لخت جگر کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا، اور باپ بیٹے دونوں بندگی کے امتحان میں پورے اترے، بظاہر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے، لیکن غور کرو، انھوں نے خدا کے حضور میں جو چیز پیش کی تھی؟ خدا ہی کی بخشی ہوئی تھی

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تاہم یہی بات دریائے رحمت کے جوش میں آنے کا بہانہ بن گئی، اور حضرت ابراہیم کے لیے بے پایاں انعامات الٰہی کے دروازے کھل گیے،

یہ حقیقت بھی کھلی ہوئی ہے، لیکن جب دل سخت اور سیہ کاریوں سے بے نور ہو جاتا ہے، تو یہ کھلی ہوئی حقیقت بھی نظر نہیں آتی، اسی لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے یہود کو مخاطب کرکے فرمایا:

"اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے، کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہیم کے لیے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔ (متی باب ۳)

یہود اس خیال میں گویا قدریہ کے پیشرو ہیں، اس کے برعکس نصاریٰ نے دوسری طرف غلو کیا اور اعمال کو بالکل لاحاصل قرار دے دیا، جس کی دوسری مثال جہمیہ ہیں، اس تفصیل سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ فصل میں بنی اسماعیل کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں وہ سب توفیق الٰہی کے ثمرات ہیں، اسلئے اس کو حق تھا کہ اپنے احسانات یاد دلاکر انہیں اپنی طرف لوٹنے اور صرف اپنی ہی بندگی و اطاعت کی دعوت دے،

۲- جس طرح کسی بندے کو کبھی استحقاق کا گھمنڈ نہ ہونا چاہیے، بلکہ خدا کے کرم اور اس کے وعدوں پر بھروسہ کرنا چاہیے، اسی طرح کسی مسجد یا معبد کے متعلق جس کی تعمیر خدا کے نام پر ہوئی ہو، یہ خیال نہیں کر لینا چاہیے

کہ اس کی حفاظت و صیانت خدا پر فرض ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ صرف یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس لیے جو چیز اس کے حضور میں قربت کا ذریعہ ٹھہرائی گئی ہے۔ وہ اس کی نگرانی و حفاظت سے محروم نہ ہوگی، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر بیت اللہ کے وقت اور حضرت سلیمان نے تعمیر بیت المقدس کے وقت نہایت الحاح و زاری کے ساتھ خدا سے ان کی قبولیت کی دعا مانگی، کہ عبادت و بندگی اور تقرب و نیاز مندی کے یہ مرکز اس کی حفاظت و نگرانی سے محروم نہ ہوں، لیکن یہ اسی وقت تک جب تک یہ تقرب و بندگی کے مرکز ہوں، اگر یہ حقیقت فراموش ہو جائے اور لوگ اللہ کے عہد کو بھلا کر اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیں تو وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ جو چیز بدیہ نیاز بن کر ان کے اگلوں کے لیے تقرب کا ذریعہ ہوئی وہی چیز ٹھوکر کا پتھر بن کر پچھلوں کی تمام غفلت کو پارہ پارہ کر دے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ ایسا فوراً ہو، خدا رحمت میں جلدی کرتا ہے، لیکن عذاب میں جلدی نہیں کرتا، تورات اور قرآن میں اس بات کو بار بار دہرایا گیا ہے، یہ بات بھی منجملہ بدیہیات کے ہے، لیکن جن آنکھوں پر باطل آرزؤں کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کو نظر نہیں آسکتی، ایسے لوگ یہی خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے متعلق ہر قسم کے استحقاق کی ایک دائمی سند حاصل کر لی ہے، فصل دوم کے آخر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر غور کرو، سورۂ توبہ کی اس آیت میں بھی اشارہ ہے:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ	کیا تم، ان لوگوں کو جو حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، اور مسجد حرام کا انتظام کرتے ہیں ان کے ہم رتبہ سمجھ لیا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور خدا کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے حضور میں وہ برابر نہ ہوں گے۔
(سورۃ التوبہ — ۱۹)	

پس سب سے زیادہ قریب ترین وسیلۂ تقرب، طاعت و تقویٰ ہے، تمام شعائر کا قیام و بقا اسی مقصود کے لیے ہے، بندہ کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے پروردگار کا شکر گزار اور اس کی رحمتوں کا امیدوار رہے، استحقاق کا وسوسہ دل میں گزرنے نہ دے،

۲- خداوند تعالیٰ جب کسی گھر کو قبول فرما کر اس کو اپنے نام کی نسبت سے مقدس کر دیتا ہے (اور یہ شرف صرف متقین ہی کے بنائے ہوئے گھروں کو حاصل ہوتا ہے، إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ) تو وہ گھر

ہی کی برکتوں کا سرچشمہ اور اس کے عہد و میثاق کی تجدید کے لیے گویا اس کا دایاں ہاتھ بن جاتا ہے، چنانچہ جب نیک لوگ خلوص قلب اور تجدید عہد کے عزم کے ساتھ اس کی چوکھٹ پر حاضر ہوتے ہیں وہ عہد قائم رہتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل سے فرمایا گیا،

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (سورۃ البقرہ-۴۰) تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔

اور بنی اسماعیل سے فرمایا گیا:

فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ-۱۵۲) تم مجھ کو یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا،

لیکن جب وہ اس عہد کو توڑ دیتے ہیں اور گویا خود اس گھر کو ڈھانے کے لیے تیشے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو خداوند تعالیٰ جو تمام عالم سے بے نیاز ہے، ان کو چھوڑ دیتا ہے اور وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے، اس کا یہ فیصلہ قوم کی اکثر حصہ کی حالت پر مبنی ہوتا ہے، یا تو کسی قوم کا بڑا حصہ نافرمان اور عہد شکن ہو جاتا ہے، اس لیے وہ بربادی کے حوالہ کر دی جاتی ہے، یا نافرمان تو تھوڑے ہوتے ہیں، لیکن اکثریت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غافل رہتی ہے، ایسی حالت میں بھی قوم تباہ ہو جاتی ہے، کیونکہ تقویٰ کا نصف حصہ تعاون علی الخیر اور منع شر ہے، سورۂ والعصر میں ہم اس کو مفصل بیان کر چکے ہیں۔ یہ جو ہم نے کہا ہے عدل الٰہی کا عام اور کھلا ہوا قانون ہے لیکن کبھی کبھی خداوند تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوتی ہے کہ کسی قوم کی نادانیوں سے درگذر کرے یا کسی خاص مصلحت یا کسی خاص حکمت کی وجہ سے جس کو صرف وہ حکیم علام الغیوب ہی جانتا ہے، شریروں کا ہاتھ فوراً نہ پکڑے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کو بالکل بدل ڈالا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو مہلت دی، برخلاف قرآن مجید کے کہ شریروں اور کج اندیشوں نے بہتیرا چاہا کہ اس میں دست اندازی کریں لیکن اس کا ایک نقطہ بھی اس کی جگہ سے ہٹانے کی ان کو فرصت نہ مل سکی،،

ادارہ | مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ "نظام القرآن" کے نام سے مستقل تفسیر لکھ رہے تھے، مگر زندگی نے وفا نہیں کی، اور چند سورتوں کی ہی تفسیر لکھ سکے۔ یہ مضمون ان کی تفسیر سورۂ فیل کا ایک حصہ ہے اس لیے اس میں کہیں کہیں گذشتہ سورتوں کی تفسیر کے حوالے بھی مذکور ہیں۔

جزیرۂ عرب میں یہود کی تاریخ

(مجیب اللہ ندوی)

"حال میں مکتبہ جامعہ سے جناب برکات احمد صاحب کی انگریزی کتاب "رسول اکرم اور یہود حجاز" کا ترجمہ ڈاکٹر مشیر الحق کے قلم سے شایع ہوا۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے آج سے ۵۰ برس پہلے اپنی کتاب "اہل کتاب صحابہ و تابعین" کے مقدمہ میں جو کچھ لکھا تھا، اس میں تقریباً ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو اس کتاب کا موضوع ہے، برکات احمد صاحب نے متعدد جگہ عربی مآخذ کے بجائے مغربی مصنفین کی رایوں کو ماخذ بنایا ہے، جس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، بحمد اللہ اس میں اس سے بچا گیا ہے۔" (مرتب)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا کہ اسلام سے پہلے جزیرۂ عرب کے باشندوں کا دنیا کے دوسرے ملکوں اور قوموں سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، اور نہ انہوں نے کسی ملک یا کسی قوم کا کوئی اثر قبول کیا تھا، لیکن جزیرۂ عرب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اس کے برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کو ہر قسم کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی ہر قسم کے تعلقات ان کے پڑوسی ملکوں اور قوموں سے تھے، اور قوموں کے آپس کے اختلاط و ارتباط اور ان کے باہمی سیاسی اور تمدنی تعلقات کے جو اثرات ایک دوسرے پر پڑتے ہیں، وہ سب اہل عرب پر بھی پڑے تھے۔

عرب اور دوسرے ملکوں اور قوموں میں باہم اختلاط اور تعلقات کے تین بڑے ذریعے تھے، (۱) تجارت (۲) ایران و روم کے ماتحت عربوں کی سرحدی حکومتیں یعنی غسان اور حیرہ

(۳) یہودیت اور نصرانیت، پہلی دونوں شقیں اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے صرف تیسری شق کے متعلق کچھ تفصیل ہم پیش کرتے ہیں، اس میں دکھانا ہے کہ جزیرۂ عرب میں ان مذاہب کی ابتدا کب سے ہوئی، اور ان کو یہاں کیا کامیابی حاصل ہوئی، کن قبائل نے انھیں قبول کیا، اور ان کے مرکزی مقامات کون کون سے تھے، اور عہد جاہلیت میں عربوں کی مذہبی اور تمدنی زندگی پر ان قبائل کا کیا اثر پڑا اور پھر اسلام کے بعد مسلمانوں پر ان کے کیا اثرات پڑے، اور انہوں نے مسلمانوں سے کیا اثرات قبول کیے، پھر مجملاً یہ بھی ذکر آئے گا کہ ظہور اسلام سے پہلے اور اس کے بعد ان کی اخلاقی حالت اور ذہنی سطح کیا تھی، اور قرآن مجید نے اس کے متعلق کیا ارشادات کیے ہیں،

موخر الذکر شق میں سے بھی پہلے ہم یہودیت، اس کے بعد نصرانیت کی تاریخ بیان کریں گے۔

یہودیت | جزیرۂ عرب میں یہود[1] کی تاریخ دو دوروں پر منقسم ہے، پہلا دور سنہ ۵۰۰ ق م جسے یہود بائدہ کا دور کہا جاتا ہے، اور دوسرا دور سنہ ۵۰۰ ق م سے ظہور اسلام تک، پہلے دور میں جو یہود جزیرۂ عرب میں آئے ان کے متعلق قدیم صحیفوں اور عربی تاریخوں میں متعدد روایتیں ملتی ہیں، لیکن یہ صحیح طور سے نہیں بتایا جاسکتا کہ کب سے ان کا وجود یہاں ملتا ہے، بعض عربی تاریخوں کی روایتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حجاز میں ان کی آمد حضرت موسیٰؑ کے زمانہ یعنی سنہ ۵۰۰ ق م سے ہی شروع ہوگئی تھی، یاقوت نے معجم البلدان میں مدینہ کے باشندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

حین اظھر اللہ تعالٰی (موسیٰ) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون پر

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰؑ کے ماننے والوں کو یہود کہا جاتا ہے لیکن ان کا قدیم اور اصلی نام بنی اسرائیل تھا یعنی حضرت یعقوبؑ جن کا عبرانی نام اسرائیل تھا ان کی اولاد، بنی اسرائیل کے بجائے ان کا نام یہود حضرت موسیٰؑ کے بہت بعد غالباً حضرت سلیمانؑ کے عہد سے بعد پڑا، حضرت سلیمانؑ کے بعد یہود دو حصوں میں بٹ گئے تھے، ایک گروہ موحد تھا، یہ گروہ حضرت سلیمانؑ کے فرزند و ولی عہد کے ماتحت تھا، اصل میں یہودا انہی کا لقب تھا، اس لیے کہ یہود کا لفظ ہود سے مشتق ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں، چونکہ یہ لوگ اللہ کی طرف رجوع ہوئے اس لیے ان کا نام یہود پڑ گیا، واللہ اعلم، دوسرا گروہ مشرک تھا جو یربعام کے تحت تھا، یہ حضرت سلیمانؑ کا سزا یافتہ اور دشمن تھا لیکن ہمیں حضرت موسیٰؑ کے پیرو بنی اسرائیل سے بلکہ ان کے امتی اور ماننے والے جو اس وقت یہود کے نام سے مشہور ہیں، ان سے بحث کرنی ہے اس لیے ہم نے ہر جگہ یہود ہی کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لیے غلط فہمی نہ ہونی چاہیے، قرآن پاک میں انکا تذکرہ انکے قدیم اور جدید دونوں ناموں سے کیا گیا ہے،

على فرعون فوطئ الشام واهلك من
كان بها منهم ثم بعث بعثا آخر
الى الحجاز الى العماليق وامرهم ان
لا يستبقوا احدا من بلغ الحلم الا
من دخل فى دينه فقدموا عليهم
فقاتلوهم فاظهرهم الله عليهم
فقتلوهم وقتلوا ملكهم الارقم
واسروا ابنا له شابا جميلا كاحسن
من رأى فى زمانه فضنوا به عن
القتل وقالوا نستحييه حتى نقدم
به على موسى فيرى فيه رأيه
فاقبلوا وهو معهم وقبض الله موسى
قبل قدومهم فلما قربوا وسمع
بنو اسرائيل بذلك تلقوهم
وسألوهم عن اخبارهم فاخبروهم
بما فتح الله عليهم قالوا فما هذا الفتى
الذى معكم فاخبروهم بقصته
فقالوا ان هذه لمعصية منكم
لما خالفتم امر نبيكم والله لا تدخلوا
علينا بلادنا ابدا فحالوا بينهم
وبين الشام فقال ذلك الجيش
ما بلد اذ منعتم بلدكم خير لكم

غالب کیا، تو انھوں نے فرعون کے اعوان و
انصار کو ختم کرنے کے بعد ایک فوج حجاز
کے عمالیق ۱؎ کی سرکوبی کے لیے بھیجی اور فوج کو حکم
دیا کہ ان میں سے جو لوگ دین میں داخل ہو جائیں
ان کے علاوہ ہر بالغ کو ختم کر دیا جائے، چنانچہ
وہ فوج حجاز گئی، اور اس کو عمالقہ پر غلبہ حاصل
ہو گیا، وہاں کا بادشاہ ارقم قتل کیا گیا، اس
کا ایک لڑکا گرفتار ہوا، چونکہ وہ بہت خوبصورت
اور معصوم تھا، اس لیے فوج اس کو اپنے
ساتھ شام لیتی آئی، اس لڑکے کے بارے
میں وہ غور کر رہے تھے، کہ حضرت موسیٰ کے
پاس اسے لے جایا جائے یا نہیں، آخرکار اسے لیکر
وہ شام واپس آئے، اس وقت حضرت موسیٰ ؑ
کی وفات ہو چکی تھی، بنو اسرائیل نے فوج
سے حجاز کے حالات دریافت کیے، انھوں
نے اپنی فتح کا واقعہ ان کے سامنے سنایا، پھر
اس نوجوان کے بارے میں دریافت کیا، تو
انھوں نے صورت حال بتائی، اس پر
بنو اسرائیل فوج پر خفا ہوئے کہ تم نے حضرت
موسیٰ کے قول کی خلاف ورزی کی، اس لیے
تم شام میں نہیں رہ سکتے، چنانچہ وہ شام میں
داخل نہیں ہو سکے یہ صورت حال دیکھ کر

۱؎ حجاز میں اس وقت عمالقہ کی حکومت تھی، جن کا ظلم و ستم فرعون سے کچھ کم نہ تھا۔

من البلد الذی نعمره و قتلتم اهله فارجعوا الیه فعادوا الیها فاقاموا بها فهذا کان اول سکنی الیهود الحجاز و المدینه

(ج ۷، ص ۴۲۷)

فوج کے سردار نے کہا کہ فوجیو! شام کے بعد تمھارے لیے حجاز ہی کی سرزمین بہتر ہے، تو وہیں واپس چلو، چنانچہ وہ حجاز واپس آئے، مدینہ اور حجاز میں یہود کی یہ پہلی آبادی تھی جو یہاں آباد ہوئی،[۱]

اس روایت کے متعلق تاریخ الیہود کے مصنف اسرائیل ولفنسون نے لکھا ہے، کہ یہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے، اس لیے کہ صحف قدیم میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کی تردید کے لیے صرف اتنا ثبوت کافی نہیں ہے، کہ "صحف قدیم میں اس کا تذکرہ نہیں ہے"، بہت سے ایسے قدیم تاریخی واقعات ملیں گے، جو مسلّمات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، مگر صحف قدیم ان کے تذکرہ سے خالی ہیں، تو کیا یہ سب ناقابل اعتبار ہیں؟ اور پھر مصنف کو بھی یہ تسلیم ہے کہ ۱۲۰۰ سنہ ق م سے پہلے حجاز میں یہود کی آمد شروع ہو گئی تھی، تو پھر اس روایت کے عدم قبولیت کا سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ اپنی یہودی عصبیت کی بنا پر عربی ماخذ کی روایات کو کمزور کرنا چاہتا ہے، جیسا کہ اس نے اس کتاب میں متعدد جگہ اس کا اظہار کیا ہے،[۲]

اس کے بعد جزیرۂ عرب میں یہود کی دوسری آمد بنی شمعون کی ہجرت قرار پا سکتی ہے، اس کے متعلق صحف قدیم کا بیان ہے کہ وہ چراگاہ کی تلاش کے لیے طور سینا تک گئے، اور وہاں ان سے اور قبائل معان سے جو وہاں کے قدیم باشندے تھے، جنگ ہوئی جس میں بنو شمعون غالب رہے، وہ پورا بیان یہ ہے:

(۳۸) یہ جن کے نام مذکور ہوئے اپنے اپنے گھرانے کے سردار تھے، اور ان کا آبائی گھرانا بڑھ گیا (۳۹) اور وہ جدور کی درآمد تلک اس وادی کے پورب تک اپنے گلوں کیلئے

---

[۱] اس روایت کو اغانی نے (ج ۱۱ ص ۹۱) میں اور سمہودی نے وفاء الوفا ص ۱۱۱ میں اور ابن خلدون نے اپنی تاریخ ج ۲ ص ۲۸۷ میں نقل کیا ہے، [۲] اس روایت کو ناقابل اعتبار ٹھہرانے میں مصنف کی غلط فہمی کا سبب شاید یہ ہو کہ اس روایت کا ماخذ اس نے صرف اغانی کو سمجھا ہے، حالانکہ دوسرے مستند کتابیں جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے ان میں بھی یہ روایت موجود ہے،

چراگاہ ڈھونڈنے گیے، (۴۰) وہاں انھوں نے ستھری اور اچھی چراگاہ پائی کہ وہ زمین وسیع اور چکنی اور سکھ کی جگہ تھی، آ حام کے لوگ قدیم سے اس میں رہتے تھے، (۴۱) اور وہ جن کے نام لکھے گئے ہیں، شاہ یہود اور حزقیاہ کے دنوں میں چڑھ آیے، اور انھوں نے ان کا ڈیرا ڈانڈا مارا، اور معونیم[1] کو جو وہاں ملے قتل کیا، ایسا کہ وہ آج کے دن تک نابود ہیں، اور ان کے گھروں میں آپ رہے، کیونکہ ان کے گلّے کے لیے وہاں چرائی تھی، (۴۲) اور ان میں سے یعنی بنو شمعون کے بیٹوں میں سے پانچ سو مرد شعیر کے پہاڑ پر گیے، اور یسعی کے فلطیاہ اور نعریاہ اور رفایاہ اور عزیئیل ان کے سردار تھے، (۴۳) اور ان باقی عمالیقوں کو جو بھاگ نکلے تھے قتل کیا، اور آج کے دن تک وہاں بستے ہیں۔" (تواریخ ۱ باب ۴)

اس ہجرت کے سنہ کی تعیین میں اختلاف ہے، ڈوزی (Dozy) نے اپنی کتاب "بنی اسرائیل مکہ میں" میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ہجرت حضرت داؤدؑ کے زمانہ سے کچھ پہلے یعنی سنہ ۱۰۰۰ ق م کے قریب ہوئی، لیکن مارگولیتھ (Margolouth) نے ڈوزی سے اختلاف کیا ہے، اور اپنی کتاب "عربوں اور بنی اسرائیل کے تعلقات" میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ہجرت حزقیل کے وقت میں ہوئی جنھوں نے سنہ ۶۹۱ ق م تک بلاد یہود پر حکومت کی ہے،

خود بائبل کے مترجمین نے اس ہجرت کے سنہ کی جو تعیین کی ہے اس سے بھی مارگولیتھ کے خیال کی تائید ہوتی ہے، یعنی انھوں نے اس کو سنہ ۷۱۵ ق م کا واقعہ قرار دیا،

تاریخ الیہود کے مصنف کا خیال ہے کہ کم از کم اس ہجرت کا زمانہ سنہ ۱۲۰۰ ق م ہے، لیکن اس نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے، غالباً اس نے یہ رائے اس لیے قائم کی ہے کہ بائبل میں اس واقعہ کا سنہ ۷۱۵ ق م درج ہے، لیکن اس واقعہ سے پہلے اور بعد کے جتنے واقعات ہیں، وہ سب سنہ ۱۳۰۰ ق م کے تحت درج ہیں، صرف اسی واقعہ کے سامنے سنہ ۷۱۵ ق م درج ہے۔

---

[1] معونیم یعنی قبائل معان یا معین جو مکہ اور یثرب کے اطراف میں آباد تھے، تاریخ الیہود ص ۵، اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے اور قبائل معان میں جو جنگ ہوئی اس میں بنی اسرائیل غالب رہے، اور انھوں نے معان کو قتل کر کے ان سے زمین چھین لی، یہ قبائل عرب کے بہت قدیم قبائل ہیں، انھوں نے کئی سو برس تک جزیرۂ عرب میں حکومت کی ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے ارض القرآن جلد اول،

بہرحال اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ ۵ سنہ ق م سے پہلے ہی بنی شمعون عرب میں آباد ہو چکے تھے، اسی اختلاف روایات کی بنیاد پر بعض مستشرقین نے بنی شمعون کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن کتاب یوشع بن نون کے دیکھنے سے ان کے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے، اس میں ان قبائل کے نام اور ان کے جائے قیام کے حدود مفصل درج ہیں[1]۔

اس کے علاوہ صحف قدیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب تاجر برابر کنعان اور بنی اسرائیل کے دوسرے شہروں تک سامان تجارت لیکر جایا کرتے تھے، اور یہود تجار سبا تک برابر تجارتی سفر کرتے تھے اور یہود اور عمالقہ کی جنگ کا ذکر آچکا ہے، اس کے علاوہ متعدد بار عمالقہ اور عربی قبائل میں لڑائیاں ہوئی ہیں[2] جو یہود کے عرب میں متوطن ہونے کا بڑا سبب ہوئیں[3]،

غرض انہی مذکورہ اسباب کی بنا پر حجاز میں یہود کی آمد و رفت اور بود و باش شروع ہوئی لیکن اس دور کے یہود کے تاریخی آثار باقی نہیں رہ گیے ہیں، اس لیے ان کو یہود بائدہ (یعنی مٹ جانے والے) کہا جاتا ہے،

دوسرا دور | دوسرے دور میں جو یہود حجاز آئے، وہ زیادہ تر شام و فلسطین کے باشندے تھے، وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر انھوں نے اپنے سرسبز و شاداب وطن کو چھوڑ کر جزیرۂ عرب جیسی بے آب و گیاہ سرزمین کا رخ کیا، انکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، مختصر طور پر ان کی ہجرت کے تین قوی سبب یہ تھے:

(۱) فلسطین میں یہود کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، چنانچہ اس وقت ان کی تعداد چالیس لاکھ بتائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ فلسطین جیسی چھوٹی جگہ میں اتنی کثیر آبادی کا فراغت اور خوشحالی کے ساتھ رہنا، اور پھر اس کے ذرایع معاش کا مہیا ہونا دشوار ہوگا، اس لیے وہ عرب و عراق کا رُخ کرتے تھے، جہاں کی آبادی ان کے رقبہ کے اعتبار سے بہت کم تھی، اور پھر جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، یہود کی آبادیاں متفرق طور سے پورے جزیرۂ عرب میں پھیلی ہوئی تھیں، جو یہاں ان کی آمد کا ایک بڑا سبب بن گئیں،

(۲) پہلی صدی ہجری میں رومیوں نے متعدد بار فلسطین پر حملہ کیا، یہاں تک کہ یہود کو زمام حکومت ان کے ہاتھ دے دینا پڑی، لیکن ظاہر ہے کہ فلسطین یہود کا صرف وطن ہی نہیں تھا، بلکہ وہ ان کی سب سے مقدس عبادتگاہ بھی تھی، اس لیے وہ چین سے نہیں بیٹھے، اور بغاوت کے فتنے برابر اٹھاتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں

---

[1] کتاب یوشع بن نون فصل ۱۹ آیت ۱ تا ۹ [2] حزقیاہ باب ۴ آیت ۴۱ [3] ملوک ج ۱ باب ۹ آیت ۲۶۔

نے ان پر ہر طرح کے ظلم توڑنے شروع کر دیے، اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ فلسطین چھوڑ کر کہیں ہجرت کر جاتے جس کے لیے ان کو سب سے قریب آزاد سرزمین جزیرۂ عرب ہی کی مل سکتی تھی۔[1]

(۳) اس کے بعد پہلی صدی ہجری یعنی سنہ ۱۹۷ء میں رومیوں اور یہودیوں میں ایک زبردست جنگ ہوئی، جس میں پورا فلسطین تہ و بالا ہو گیا، یہاں تک کہ بیت المقدس کی مشہور عبادت گاہیں تک برباد کر دی گئیں، اس جنگ میں یہودیوں کو شکست اٹھانی پڑی، اور اس شکست کے بعد خاص طور سے ان کے قافلے کے قافلے فلسطین سے نکلنے لگے، اور ان کو جہاں جائے پناہ ملی، وہاں چلے گئے، ان تارکین وطن میں ایک بڑی تعداد نے عرب کا رخ کیا، جہاں ایک کثیر تعداد میں یہود پہلے سے موجود تھے، یہود کی اس ہجرت کی پوری تفصیل یہودی مؤرخ یوسف جو ان جنگوں میں شریک بھی رہا ہے، اس کے بیان سے معلوم ہوتی ہے۔[2]

رومیوں اور یہودیوں کی جنگ اور یہود کی جزیرۂ عرب کی طرف ہجرت کے متعلق بہت سی مفید باتیں عربی مصادر میں بھی مل جاتی ہیں، چنانچہ صاحب اغانی نے بنو قریظہ اور بنو نضیر کی ہجرت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

لما ظهرت الروم على بني إسرائيل جميعا بالشام فوطئوهم و قتلوهم و نكحوا نساءهم خرج بنو نضير و بنو قريظة و بنو هدل هاربين منهم الى من بالحجاز من بني اسرائيل۔[3]

جب رومیوں نے شام کے بنو اسرائیل (یہود) پر غلبہ پایا تو ان کو خوب برباد کیا، ان کو قتل کیا، ان کی عورتوں کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آئے، اس ظلم و ستم سے بچنے کے لیے بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو ہدل وغیرہ حجاز میں اپنے دوسرے یہودی بھائیوں کے یہاں چلے آئے،

بہرنوع یہی اسباب تھے جن کی بنا پر یہود حجاز میں آئے۔

[1] دیری یوجی یشرئیل بحوالہ تاریخ الیہود ص ۹ [2] ایضاً ص ۹ [3] اغانی جزء ۹ ص ۵۰۹

جزیرۂ عرب اپنی طبعی تقسیم کی بنا پر تو کئی حصوں میں مشتمل ہے، لیکن تمدنی اور سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہے، حجاز اور یمن، اب تک زیادہ تر بحث حجاز میں یہود کی آمد اور اس سے ان کے قدیم و جدید تعلقات پر تھی، اب ہم عرب کے دوسرے حصہ یمن سے یہود کے تعلقات پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہتے ہیں،

یمن میں یہودیت [1] یمن گو جزیرۂ عرب ہی کا ایک حصہ ہے لیکن سیاسی اور تجارتی اہمیت کے اعتبار سے ہمیشہ وہ ایک مستقل ملک رہا ہے، اس اہمیت کی بنا پر اس کا تذکرہ ہم علیحدہ کرتے ہیں،

اہل یمن سے بھی یہود کے تعلقات قدیم زمانہ سے شروع ہو چکے تھے، اوپر آ چکا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے وقت یعنی ۱۰۰۰ ق م میں اہل عرب اور یہود میں تجارت ہوتی تھی، جس کا سب سے بڑا مرکز سبا تھا، جو یمن کا دار السلطنت تھا،

اس کے علاوہ قرآن پاک میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا جو واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے بھی یہود اور اہل یمن کے تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے، معین جو یمن کے بیچ میں واقع تھا، اس کا تذکرہ تحریری طور پر ۸۰۰ ق م میں ملتا ہے [1]،

یمن میں یہودیت کو اصل فروغ حمیری حکومت کے بعد ہوا، اس لیے کہ یہودیت حمیری حکومت کا تقریباً سرکاری مذہب ہو گیا تھا، اس کے فرمانرواؤں میں ایک ستارہ پرست، ایک دو عیسائی بقیہ سب یہودی تھے، لیکن حمیری حکومت کی ابتدا کب ہوئی، اس بارے میں مؤرخین کی بہت مختلف اور متضاد رائیں ہیں،

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے ارض القرآن میں اس پر مفصل بحث کی ہے، ڈاکٹر ہالوے نے اس کی ابتدا ۱۱۵ ق م قرار دی ہے، لیکن سید صاحب نے اس پر نقد کیا ہے، اور مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ حمیری حکومت کی ابتدا ۲۰ ق م سے آگے نہیں بڑھتی، بہر نوع اس سے بہت پتا ہوتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح یا پہلی صدی کے وسط سے یمن میں یہودیت کو فروغ ہونا شروع ہو گیا تھا اور ۵۰۰ برس تک وہاں اس کو فروغ حاصل رہا، لیکن حمیری حکومت کے آخری فرمانروا ذونواس کی موت ۵۲۵ء کے بعد یمن میں یہودیت کا زور ٹوٹ گیا، اور اس کی جگہ عیسائیت نے لے لی، جس کا تذکرہ آگے آتا ہے،

---

[1] تاریخ دودم آیت ۷۶-۸ بڑی ترقی یافتہ حکومت تھی، جدید اثری تحقیقات نے اس کے بارے میں بہت کچھ معلومات فراہم کر دیئے ہیں،

جزیرہ عرب میں یہودیت کا ذکر کرتے ہوئے یعقوبی نے لکھا ہے کہ

فما من تهود منهم فاليمن باسرها[1]	جزیرہ عرب میں جو لوگ یہودی ہوتے انہیں یمن بھی ہے، یمن پورا کا پورا یہودی تھا،

پھر اس کے بعد یعقوبی نے یمن میں یہودیت کی ابتدا کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

وكان تبع حمل حبرين من احبار اليهود الى اليمن فابطل الاوثان وتهود من باليمن[2] (ج ۱ ص ۲۹۸)	ملک تبع نے دو یہودی عالموں کو یمن بھیجا، انہوں نے وہاں سے بت پرستی کو مٹایا اور انکے اثر سے یمن کے باشندوں نے یہودیت قبول کرلی،

جدید اثری تحقیقات کے مطابق تبابعہ کا زمانہ تیسری صدی عیسوی سے آگے نہیں بڑھتا، اس لیے یعقوبی کے بیان کے مطابق یمن میں یہودیت کو پورا فروغ تیسری صدی میں ہوا۔

اوپر یمن میں یہودیت کی جو قدامت دکھائی گئی ہے، اس سے یہ بیان کچھ مختلف معلوم ہوتا ہے مگر اس میں کوئی تضاد نہیں ہے ممکن ہے کہ وہاں یہودیت بہت قدیم زمانہ سے موجود ہو، مگر اہل یمن کا وہ عام مذہب تیسری صدی میں ہوا ہو۔

کیا عرب کے یہود ہجرت کرکے نہیں آئے تھے؟

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر یہود شام و فلسطین کی سرسبز و شاداب سرزمین چھوڑ کر جزیرہ عرب جیسے بے آب و گیاہ مقام کا رخ کرتے تھے، لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ عرب کے یہود کہیں باہر سے نہیں آئے تھے، بلکہ یہ عرب ہی نسل سے تھے جنہوں یہودیت قبول کرلی تھی، یعقوبی کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ بنی نضیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

وهم فخذ من جذام — یہ جذام کی ایک شاخ ہے[3]، مگر یہ

---

[1][2] تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۹۸ [3] ایضاً

الا انہم تہودوا ونزلوا
یقال لہ النضیر فسموا بہ
(ج ۲ ص ۴۹)

یہودی ہو گئے تھے، اور جہاں یہ
آباد ہوئے، اس مقام کا نام نضیر تھا
اسی لئے وہ اس نام سے مشہور ہو گئے

پھر بنو قریظہ کے متعلق لکھتا ہے

وھی فخذ من جذام اخوۃ
النضیر ویقال انہم
تہودوا فی ایام عادیا بن
السموئیل ثم نزلوا
بجبل یقال لہ قریظۃ
فنسبوا الیہ
(ج ۲ ص ۵۴)

یہ بھی جذام کی ایک شاخ ہے،
بنو نضیر کے بھائی بند تھے، کہا
جاتا ہے کہ یہ عادیا بن سموئیل
کے زمانہ میں یہودی ہوئے،
پھر جبل قریظہ کے پاس آباد ہوئے
اور اسی نسبت سے ان کا یہ نام
پڑ گیا،

جو لوگ اس خیال کے موید ہیں، یعقوبی کے بیان کے علاوہ ان کا قیاسی استدلال یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں کے یہود اپنے عادات واطوار اور اپنے تمدنی اثرات کے اعتبار سے وہاں کے باشندوں سے ہمیشہ ممتاز رہے۔ لیکن عرب کے یہود کسی حیثیت سے بھی عربوں سے ممتاز نہیں تھے، اور نہ انہوں نے کوئی تمدنی یا علمی یادگار چھوڑی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی ہی جنس سے تھے، صرف انہوں نے کسی وجہ سے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا،

لیکن صرف یعقوبی کے بیان اور فرضی قیاسات پر یہ فیصلہ کر لینا کہ عرب کے تمام کے تمام یہود عربی النسل تھے، صحیح نہیں ہے

اوپر جن واقعات کا تذکرہ آچکا ہے، ان ہی سے اس کی پوری تردید ہو جاتی ہے، لیکن اس سلسلہ میں دو تین باتیں قابل لحاظ ہیں،

(۱) یعقوبی نے بنو قریظہ اور بنو نضیر کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے انشاء اللہ ان قبائل کے تذکرے کے وقت اس کے دلائل ہم پیش کریں گے

(۲) یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ عرب کے یہود دنیا کے دوسرے حصوں کے یہود سے ممتاز نہیں تھے، یا ان کا کوئی تمدنی امتیاز نہیں تھا، اس گوشہ پر یہود کے تمدنی اثرات کے تحت آئندہ ہم مفصل بحث کرینگے، لیکن یہاں دو ایک باتیں سرسری طور سے کہی جاتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہود کو دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی امتیاز کبھی بھی حاصل نہیں تھا اس لیے کہ ان کے پاس وہ اسباب و ذرائع (خصوصیت سے حکومت) موجود ہی نہیں تھے جن کی بنا پر قومیں امتیاز حاصل کرتی ہیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ کہیں بھی ممتاز تھے،

دوسری بات یہ ہے کہ عرب کے یہود کو شاید سب سے زیادہ امتیازی حیثیت حاصل تھی، اس لیے کہ قرآن نے زیادہ تر ان ہی کے عقائد، اور اخلاق و معاملات سے بحث کی ہے، اس خیال کی زیادہ تر تائید غالباً یہودی مستشرقین نے بھی کی ہے، اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کے ان بیانات کی اہمیت کم ہو جائے، جن کا تعلق یہود سے ہے، لیکن یہ خیال تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے،

یہ بات کہ یہود باہر سے نہیں آتے تھے، پورے جزیرہ کے متعلق تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ جزیرہ عرب کے باشندوں کی ایک آبادی نے یہودیت قبول کر لی تھی، خصوصیت کے ساتھ یمن کے یہود تو اکثر و بیشتر عرب ہی تھے، اس لیے اس سلسلہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ یہود باہر سے بھی آتے اور خود عربوں کے بعض قبائل اور افراد نے بھی اسے قبول کیا جن کا تذکرہ آگے آئے گا، خصوصیت سے شمالی حجاز کے یہود زیادہ تر باہر سے آتے تھے۔

کیا عرب کے یہود دنیا سے منقطع ہو چکے تھے | تاریخ الیہود کے مصنف اسرائیل ولفنسون نے لکھا ہے کہ عراق مصر، یونان اور اس کے علاوہ جہاں بھی یہودیوں کی آبادی تھی، وہاں کے یہود کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے، یہی نہیں بلکہ انہوں نے تاریخ میں اپنے سیاسی و تمدنی آثار کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، اور دنیا کی دوسری قوموں سے ان کے

گوناگوں تعلقات تھے، لیکن جزیرہ عرب کے یہود دنیا سے بالکل منقطع ہو گئے تھے اور عربوں میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ دونوں کی تہذیب و معاشرت میں کوئی نمایاں فرق باقی نہیں تھا، اور نہ دوسرے ممالک کے یہود کی طرح ان کے کوئی قابل ذکر تمدنی اور علمی آثار موجود تھے، لیکن واقعات کی روشنی میں یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا

(۱) یہ بات کہ وہ عربوں میں بالکل گھل مل گئے تھے، اور دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا، بالکلیہ صحیح نہیں ہے، جزیرہ عرب میں جہاں یہود منتشر طور پر موجود تھے، وہاں واقعی انکی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی، لیکن جو ان کے مرکزی مقامات مثلاً یثرب، خیبر وادی القریٰ اور تیماء وغیرہ تھے، وہاں وہ ہر نقطۂ نظر سے عربوں سے ممتاز تھے، پوری تفصیل آگے آتی ہے۔

(۲) دنیا کے دوسرے حصوں سے ان کا تعلق نہیں تھا، یہ غلط فہمی ویسی ہی ہے جیسی کہ خود عربوں کے متعلق یہ خیال کہ وہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھے، لیکن یہ خیال نہ تو عربوں کے متعلق صحیح ہے اور نہ یہود کے متعلق عربوں اور حجاز اور یمن کے یہود کے تجارتی اور معاشرتی تعلقات دوسرے ملکوں سے قدیم زمانہ سے تھے، ذکر آچکا ہے کہ یمن کے یہود تجارت کی غرض سے برابر شام کا سفر کرتے رہتے تھے، جزیرہ عرب کے جتنے تجارتی مرکز تھے وہ سب یہودیوں کے قبضہ میں تھے یمن کی حمیری حکومت اور حبشہ کی عیسائی حکومت کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک برابر سیاسی جنگ جاری رہی، خصوصیت سے شام کے یہودیوں سے تو ان کے بعض معاشرتی تعلقات بھی تھے شام کے یہودی مدینہ کے یہودیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دریافت کیا کرتے تھے، بنو قینقاع جلا وطن کئے گئے تو وہ یہاں سے اذرعات جو شام کے علاقہ میں ہے، چلے گئے، اسی طرح دوسرے یہودی قبائل کا بھی شام کی طرف جانا ثابت ہے، حجاز سے مدینہ کو جو راستہ جاتا ہے، اس شاہراہ پر جتنے مرکزی مقامات تھے، ان میں یہودیوں کی آبادیاں ملتی ہیں، اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش تو تجارت کے لیے شام تک کا سفر کریں اور یہود جو جزیرہ عرب کے سب سے زیادہ تاجر اور مالدار باشندے تھے، شام کا

تجارتی سفر نہ کرتے ہوں، اور پھر مزید بر آں یہ کہ شام ہی میں ان کا قبلہ اور سب سے مقدس عبادت خانہ تھا، ان وجوہ کی بنا پر یہ خیال کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہود دنیا سے منقطع ہوکر بالکل قبائلی زندگی گذار رہے تھے،

(۳) تمدنی اور علمی حیثیت سے بھی عرب کے یہود ممتاز تھے۔ ان کے تمدنی و سیاسی اثرات پر بحث آگے آئے گی، البتہ علمی حیثیت کے متعلق کچھ باتیں یہاں کہی جاتی ہیں۔

جزیرۃ العرب کے یہود کے علمی امتیاز کے لیے یہی ثبوت بہت ہے کہ ان میں حضرت عبداللہ ابن سلام، حضرت زید بن سعنہ حضرت مخریق حضرت میمون بن یامین کعب احبار محمد بن کعب القرظی، وہب بن منبہ جیسے علماء۔ اور کعب بن اشرف اور سمتول بن عادیا جیسے شعرا موجود تھے، حضرت عبداللہ بن سلام کے صاحبزادے حضرت یوسف نے اپنی ایک علمی یادگار بھی چھوڑی تھی، ان کے متعدد مدارس قائم تھے، خود مدینہ میں بیت المدارس کے نام سے ان کی ایک مشہور درسگاہ تھی،

جزیرۃ عرب میں سب سے زیادہ لکھے پڑھے یہودی ہوتے تھے۔ مدینہ میں غالباً سب سے پہلے تحریر کا رواج یہود ہی کے ذریعہ ہوا، وہ صرف اپنی مذہبی زبان عبرانی ہی نہیں بلکہ عربی سے بھی بخوبی واقف تھے، اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے اور روزمرہ کی زبان بھی یہی تھی، پوری تفصیل آگے آئے گی،

غالباً یہ یہودی کا اثر تھا کہ ظہور اسلام کے وقت متعدد صحابہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے بعض صحابہ تو عربی کے ساتھ عبرانی سے بھی واقف تھے،

بہر نوع یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ عرب کے یہود تمدنی اور سیاسی حیثیت سے کوئی ممتاز حیثیت نہیں رکھتے تھے، یا وہ علمی حیثیت سے دوسرے مقامات کے یہود سے پست تھے،

آیاتِ قرآن میں
وقف کی اہمیت وضرورت

(قاری عبدالرحمٰن چمپارنی)

آج ہندوستان میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ضرور ہے، جو اصول تجوید کی رعایت کرتے ہوئے قرآن قدرے عمدہ اور نفاست سے پڑھتی ہے، مگر علم وقف کے اصول وقواعد سے ناواقفیت کی بنا پر بے موقع اور خلاف قاعدہ وقف کرتے ہوئے تیس پارے کا پورا قرآن شریف پڑھ ڈالتی ہے، اس طرح پڑھنے سے اوّلاً تو نیکی برباد اور گناہ لازم ہوجاتا ہے، دوسرے فن سے واقف حضرات کو اس سے بے حد تکدر اور کوفت ہوتی ہے،

اس فہرست میں صرف عوام ہی داخل نہیں ہیں، بلکہ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہیں، اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ علم وقف کی اہمیت وعظمت اور اس کی ضرورت سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں، اور ظاہر ہے کہ جس چیز کی اہمیت نظر سے پوشیدہ ہوگی، اس کے حاصل کرنے ضرورت کیسے محسوس ہوگی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب ان غلطیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بھئی وقف کرنے کا یہ اصول وضابطہ ہے، وقف اس طرح کرنا چاہیے، اور اس طرح نہیں کرنا چاہیے، تو بجائے اس کے کہ وہ ان غلطیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دیں، یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم کوئی قاری ہیں جو ان سب باتوں کا خیال رکھیں؟ گویا انکی نظر میں قرآن پڑھنا اور چیز ہے، اور وقف کے قاعدے ومواقع کی رعایت کرنا ایک الگ شئی ہے، جس کی کوئی اہمیت نہیں،

لوگوں کی اسی بے اعتنائی کے پیش نظر علم وقف کی اہمیت وضرورت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، خدا کرے اس کے مطالعہ سے لوگوں میں علم وقف کی اہمیت اور

ضرورت کا احساس پیدا ہو، اور ان کو اس علم کے حصول کی توفیق نصیب ہو جائے،

وقف کے معنی | وقف کے معنی ہیں الحبس یعنی رکنا، ٹھہرنا، کہا جاتا ہے وقفت الدابۃ واوقفتہا اذا حبستہا عن المشی، اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں کلمہ کے آخری حرف کو ساکن پڑھنا،

قراء نے اس لفظ کو "الوقف عن تحریک حرف تعزل" سے مختصر کیا ہے، جس کے معنی ہیں حرف کو حرکت دینے سے رک جانا جو مقام سے علٰحدہ ہو گئی ہے،

فن قرأت کی اصطلاح میں "قطع النفس علیٰ آخر الکلمۃ زمنا یتنفس فیہ عادۃ بنیۃ استیناف القراءۃ" کو وقف کہتے ہیں، یعنی کلمہ کے آخر حرف پر سانس توڑ کر اتنی دیر رکنا جتنی دیر میں عادۃً ایک سانس لے سکیں، اور پھر آگے پڑھنے کی نیت ہو،

تعلم وقف کا ثبوت قرآن سے | قرآن پاک کا طرز کلام بات چیت کی طرح واقع ہے، اس لیے اس کی تلاوت میں کہیں توقف کرنا پڑتا ہے، اور کہیں نہیں، اور کہیں لازماً ٹھہر جانا پڑتا ہے اس ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے کو کلام کے صحیح بیان کرنے اور اس کا صحیح مطلب سمجھنے میں بہت ہی دخل ہے، بعض مرتبہ بے موقع ٹھہر جانے سے آیت کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، اور کلام کا مقصد بدل جاتا ہے اور کبھی یہی فسادِ معنی فسادِ نماز کا سبب بن جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، سورۂ مزمل میں ہے:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (مزمل: ۴) قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھو،

ترتیل کے معنی لغت میں خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے ہیں، اور شرع میں حروف کو مخرج اور صفت سے ادا کرنے اور وقف کے قاعدے و مواقع کی رعایت کرنے کو ترتیل کہتے ہیں، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں امام بیہقی نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

الترتیل ھو تجوید الحروف و معرفۃ الوقوف (الاتقان ج ۱ ص ۸۳) حروف کو بنا سنوار کر پڑھنے اور وقوف کی معرفت کو ترتیل کہتے ہیں،

ترتیل کی یہ ایسی جامع تعریف ہے کہ اس سے تجوید اور وقف دونوں کا وجوب ثابت ہوجاتا ہے یعنی جس طرح تجوید کا حاصل کرنا امت کے ہر فرد پر واجب ہے اسی طرح وقف کی معرفت حاصل کرنا بھی واجب ہے کیونکہ ترتیل کا وجوب نص قرآن سے ثابت ہے، اور حضرت علیؓ کے اثر سے یہ ثابت

ہو چکا ہے کہ ترتیل سے مراد تجوید اور وقوف ہی ہے، چنانچہ صاحب جامع الوقف بھی لکھتے ہیں کہ:

"ترتیل ہی کا دوسرا جزء علم وقف بھی ہے، اہمیت کے لحاظ سے علم وقف کسی طرح علم تجوید سے کم نہیں، جس آیت کریمہ سے تجوید کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اسی سے علم وقف کا بھی وجوب ثابت ہے ...... ہر قاری کو علم تجوید، علم قرأت، علم رسم خط کے ساتھ علم وقف کا جاننا بھی ضروری ہے، حتی کہ اسی پر قاری کی تکمیل موقوف ہے۔"

(رسالہ جامع الوقف ص ۲)

لہذا اگر کوئی شخص تجوید کی رعایت کرے، اور اوقاف کے قواعد اور اس کے محل کے موافق وقف نہ کرے تو اس کی قرأت مامور بہ کے خلاف قرار پائے گی، اور کوئی بعید نہیں کہ وہ شخص گنہگار بھی ہو۔

تعلم وقف کا ثبوت حدیث سے

ایک خطیب نے اپنے خطبہ میں پڑھا "وَمَن یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَن یَّعْصِھِمَا" حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خطبہ دینے سے روک دیا، اور فرمایا بئس خطیب القوم انت" تو بہت برا خطیب ہے۔" قل ومن یعص اللہ ورسولہ فقد غوی۔" (خلاصۃ البیان ص ۲۷، البرہان ص ۴۶-۴۷، النفحۃ العنبریہ ص ۳۷۴)

خطبہ دینے سے روکنے کی وجہ بالکل ظاہر ہے، وہ یہ کہ اس خطیب نے ومن یعصھما پر وقف کر کے اطاعت و معصیت جو باہم متضاد ہیں، ان کو جمع کر دیا، اس کو چاہیے تھا کہ رشد ہی پر رکتا اور پھر ومن یعصھما سے ابتدا کر کے آگے کی عبارت فقد غوی تک پوری کرتا، یا پھر شروع سے آخر تک اپنے کلام کو ملاتا چلا جاتا اور فقد غوی پر رکتا تاکہ غلط معنی پیدا ہونے کا احتمال نہ رہتا، جب اس طرح وقف اور وصل مخلوق کے کلام میں ممنوع ہے، تو خالق کے کلام میں تو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہونا چاہیے، اور اس سے احتراز ہر حال ضرور ہونا چاہیے تاکہ معانی خلط ملط نہ ہونے پائیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آدمی کو علم وقف کی معرفت مکمل طور پر حاصل ہو۔

تعلم وقف پر صحابہ کا اجماع

نزول قرآن کے وقت صحابۂ کرام جہاں اور بہت سی باتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھتے تھے، وہاں وقف کرنے کے قاعدے اور اس کے مواقع کا علم بھی حاصل کرتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لقد عشنا برھۃ من دھرنا وانّ — ہم نے اپنے زمانہ سے تھوڑا ایسا وقت بھی

احدنا یوتی الایمان قبل القرآن وتنزل السورۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیتعلم حلالھا وحرامھا وامرھا وزجرھا وما ینبغی ان یوقف عندہ کما تعلمون انتم القرآن الیوم ولقد رأینا الیوم رجالاً یوتی احدھم القرآن قبل الایمان فیقرأ ما بین فاتحتہ الی خاتمتہ ما یدری ما امرہ ولا زاجرہ ولا ما ینبغی ان یوقف عندہ،

(الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۸۳)

گذرا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو قرآن نازل ہونے سے پہلے ہی ایمان ملتا تھا، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سورتیں نازل ہوتی تھیں تو ہم لوگ حلال وحرام اور امر و نواہی کی باتیں سیکھتے تھے، اور اس جگہ کو بھی سیکھتے تھے جہاں وقف کرنا مناسب تھا، اب میں ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جن کو ایمان تو ابھی نہیں ملا لیکن قرآن مل گیا، ان میں سے بعض سورۂ فاتحہ سے لے کر ختم قرآن تک پڑھ جاتے ہیں، مگر انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ قرآن کس بات کا حکم کر رہا ہے، اور نہ یہ خبر ہوتی ہے، کہ کہاں توقف کرنا چاہیے،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلم وقف پر صحابہ کا اجماع ہے، اور یہ علم توقیفی یعنی روایتی ہے کہ صحابۂ کرام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے اوقاف کی تعلیم حاصل کرتے تھے، وفی کلام ابن عمر رضی اللہ عنہ برھان علی ان تعلمہ اجماع من الصحابۃ رضی اللہ عنہم۔ (ایضاً)

وقف کی اہمیت پر علماء کے اقوال

وقف فی نفسہٖ کوئی واجب شئ نہیں، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی بھی قاری کسی سورہ یا کلام کو بغیر سانس لیے نہیں پڑھ سکتا، لامحالہ اسے بغرض استراحت وقف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، لہٰذا وقف اسی جگہ کرنا چاہیے جہاں معنی میں کسی قسم کا تغیر و فساد اور معنی مراد کے خلاف وہم نہ پیدا ہو، نیز فصاحت و بلاغت اور حسن تلاوت میں بھی فرق نہ آئے، ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کی رعایت وہی شخص کر سکتا ہے، جسے وقف کی معرفت حاصل ہوگی، اس سلسلہ میں علماء کے بہت سے اقوال کتابوں میں مذکور ہیں، علامہ ابو حاتم فرماتے ہیں:

من لم یعرف الوقف لم یعرف القرآن (ایضاً)

جس کو وقف کی معرفت حاصل نہیں ہوئی اسے قرآن کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی،

ابن انباری کہتے ہیں:

من تمام معرفة القرآن معرفة الوقف والابتداء۔ (اتقان ج ۱ ص ۸۳)

معرفت قرآن کی تکمیل وقف اور ابتدا کی معرفت سے ہوتی ہے،

امام نکزاوی فرماتے ہیں:

فانه لا یتأتی لاحد معرفة القرآن ولا استنباط الادلة الشرعية الا بمعرفة الفواصل۔ (ایضاً ص ۸۳)

فواصل (یعنی گول دائرہ جو مواقع وقف میں سب سے بہتر ہے) کی معرفت کے بغیر نہ قرآن کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے نہ دلائل شرعیہ مستنبط ہو سکتے ہیں،

امام ہذلی اپنی کتاب "الکامل" میں فرماتے ہیں:

الوقف حلية التلاوة وزينة القارئ وبلاغ التالی وفهم المستمع وفخر العالم وبه يعرف الفرق بين المعنيين المختلفين والنقيضين المتنافيين والحكمين المتغائرين۔ (النفحة العنبرية ص ۳۷۵)

صحیح وقف سے تلاوت وقرأت میں حسن و زینت پیدا ہوتی ہے، تلاوت کرنے والے کیلئے صحیح معانی تک رسائی ہوتی ہے، سننے والے کو معنی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے عالم کیلئے فضیلت کی چیز ہے، نیز اس سے دو مختلف معانی اور متغائر احکام میں فرق ہوتا ہے،

بے موقع وقف کرنیکے نقصانات

اس کے برخلاف بے موقع وقف کر دینے سے بعض مرتبہ غلط معنی پیدا ہو جاتا ہے، اور کلام کا مقصد بدل جاتا ہے، مثال کے طور پر سورۂ نساء کی آیت وان كانت واحدة فلها النصف ہے، اگر آدمی یہاں نصف پر وقف کرتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر بجائے یہاں وقف کرنے کے النصف کے بعد والے لفظ ولابويه پر وقف کر دیا جائے تو معنی بدل جائے گا، آیت کا معنی یہ ہے کہ نصف لڑکی کیلئے ہے نہ کہ ابوین کیلئے، جبکہ ولابويه پر وقف کر دینے سے معنی بدل کر یہ ہو جاتا ہے کہ لڑکی کے ساتھ ابوین بھی شریک ہیں،

اسی طرح سورۂ انعام کی آیت انما يستجيب الذين يسمعون والموتى ہے کہ الموتی پر وقف

کرنے سے معنی بدل کر یہ ہوجاتا ہے کہ موتیٰ یعنی مردے بھی سننے والوں کے ساتھ جواب دیتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ الموتیٰ کا تعلق مابعد کے لفظ یبعثھم اللہ سے ہے۔

ایسی جگہوں پر وقف کرنا قراء کی اصطلاح میں وقف قبیح کہلاتا ہے جو ممنوع ہے، الا یہ کہ کوئی شدید عذر پیش آجائے، اگر بضرورت شدیدہ وقف کرلیا جائے تو فوراً مقام کے تقاضا کے موافق وقف والے یا اس سے ماقبل والے کلمہ سے اعادہ کرنا چاہیے، اعادہ کے بغیر بعد والے کلمہ سے پڑھنا درست نہیں، امام جزری فرماتے ہیں:

وَغَیْرُ مَا تَمَّ قَبِیْحٌ وَّ لَہٗ ۔۔۔ یُوْقَفُ مُضْطَرًّا وَّ یُبْدَأُ قَبْلَہٗ

اور نا تمام کلام پر وقف کرنا (وقف) قبیح ہے، اور اس پر وقف کرنا مجبوراً جائز ہے، مگر ابتدا ماقبل سے کی جائے گی۔

ایہام مالا یلیق | بعض مواقع ایسے بھی ہیں جہاں وقف کرنے سے اللہ تعالیٰ کی شان میں بے ادبی اور کبھی بد اعتقادی کے معانی پیدا ہوجاتے ہیں، جن کو ایہام مالا یلیق سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی جگہوں پر وقف کرنا اقبح یعنی زیادہ قبیح کہلاتا ہے، جیسے انّ اللہ لایھدی پر اور انّ اللہ لایستحیی پر اور فبھت الذی کفر واللہ پر اور لایبعث اللہ پر، کیونکہ ان مثالوں میں اللہ تعالیٰ کی شان میں بے ادبی اور تکذیب قیامت کے معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ پر کہ اس پر وقف کرنے سے نمازیوں کیلئے وعید کا معنی پیدا ہوجاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ مومن ع کی آیت اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ میں اصحب النار پر وقف کرنے کے بجائے الذین یحملون العرش پر وقف کردیا جائے تو معنی ہوگا کہ (نعوذ باللہ) جہنمیوں کے زمرہ میں حاملین عرش بھی ہوں گے، جبکہ یہ فرشتے ہیں،

علیٰ ہذا سورۂ توبہ کی آیت وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں اگر کوئی الظالمین پر وقف نہ کرے بلکہ اس کو وصل کرکے الذین اٰمنوا وھاجروا پر یا وجاھدوا فی سبیل اللہ پر وقف کردے تو معنی میں کافی حد تک فتور آجائیگا یعنی شبہ ہوگا کہ مومن، مہاجر اور مجاہد بھی ظالمین کے زمرہ میں شامل ہیں اور ہدایت سے محروم ہیں، (نعوذ باللہ من ذالک)

اسی طرح یہ ایہام حرف نفی پر یا کلمۂ مثبت کے وقف کرنے سے واقع ہوتا ہے جیسے وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ میں لفظ الٰہ پر، وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں لفظ ارسلنٰک پر وغیرہ وغیرہ

پہلی مثال میں ذات باری تعالیٰ کی نفی ہو رہی ہے، اور دوسری مثال میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نفی ہو رہی ہے، ایک مومن اگرچہ ایسے فاسد معانی کا ارادہ اور نیت نہیں کرتا، اور اس صورت میں وہ گنہگار نہیں ہوتا، مگر سامع کو معنی مراد کے خلاف وہم پیدا ہو سکتا ہے اور اس کی بدولت اس کا عقیدہ خراب ہونے کا امکان بھی ہو سکتا ہے، اسی لیے اہل ادا نے ایسے مواقع پر وقف کو ممنوع قرار دیا ہے، اور انہی اسباب و وجوہ کی بنا پر صحت وقف، صحابہ، تابعین، جملہ ائمہ اور تمام علماء و قراء کے یہاں ہر دور میں مرغوب و مطلوب رہا ہے، اور یہ حضرات وقوف کی تعلیم کیطرف خصوصیت سے توجہ فرماتے تھے، علامہ جزری رقمطراز ہیں:

وصح بل تواتر عندنا تعلمه والاعتناء به من السلف الصالح كابي جعفر يزيد ابن القعقاع امام اهل المدينة الذي هو من اعيان التابعين وصاحبه الامام نافع بن ابي نعيم وابي عمرو بن العلاء ويعقوب الحضرمي وعاصم بن ابي النجود وغيرهم من الائمة. (الاتقان ج ۱ ص ۸۳)	ہم تک صحت بلکہ تواتر کے ساتھ یہ بات پہنچی ہے کہ سلف صالحین میں بہت سے ائمہ مثلاً ابو جعفر یزید بن قعقاع جو اہل مدینہ کے امام اور کبار تابعین میں سے ہیں، اور ان کے شاگرد نافع بن ابو نعیم، ابو عمرو بن علاء، یعقوب حضرمی اور عاصم بن ابی النجود رحمہم اللہ وغیرہم وقوف کی تعلیم کیطرف خصوصی توجہ فرماتے تھے، اور اس کو سیکھتے سکھاتے تھے،

مگر افسوس ہے کہ ایک زمانہ سے بکثرت لوگ صرف تجوید حاصل کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں، اور علم وقف کی جانب بالکل توجہ نہیں کرتے، حتیٰ کہ اکثر قراء حضرات بھی اس کے حاصل کرنے کی ضرورت اور اسکی اہمیت کیطرف قطعاً توجہ نہیں کرتے، اسی بنا پر علمائے متاخرین نے یہ شرط مقرر کر دی ہے کہ جب تک قاری کو وقف اور ابتدا کی معرفت نہ ہو جائے اسوقت تک مقری اسکو معلم بننے کی اجازت اور سند نہ دے،

ومن ثم اشترط كثير من ائمة الخلف على المجيز ان لا يجيز احدا الا بعد معرفته الوقف والابتداء (ايضاً)	اسی وجہ سے متاخرین ائمہ میں سے اکثر حضرات نے مقری کے اوپر یہ شرط مقرر کر دی ہے کہ وہ اس وقت تک کسی کو سند نہ دے جبتک کہ اسکو وقف اور ابتدا کی معرفت نہ ہو جائے

مذکورہ بالا تفصیلات اور اقوال و شواہد سے علم وقف کی اہمیت و ضرورت واضح ہو گئی، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اوقاف کا علم توقیفی یعنی روایتی ہے، لہٰذا ہر قاری قرآن پر یہ واجب ہوا کہ علم تجوید کے ساتھ اوقاف کی ان تمام باتوں کی معرفت حاصل کرے جن سے وقف بے قاعدہ اور بے محل نہ ہونے پائے، اور قرأت بحسن و خوبی پوری ہو سکے،

وَبَعْدَ تَجْوِيدِكَ لِلْحُرُوفِ   لَا بُدَّ مِنْ مَعْرِفَةِ الْوُقُوفِ (امام جزری)

(دوسری اور آخری قسط)

فقہی اختلافات کی حقیقت

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی (پاکستان)

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ اور ان کے بعد کے اہل دین نے اختلاف کی اس روش سے ناجائز فائدہ بالکل نہیں اٹھایا انہوں نے حدود کو قائم رکھا دین کے واضح اور بنیادی حصہ میں کوئی تاویل نہیں کی ہاں "اجتہد برائی" کی جہاں گنجائش و اجازت ملی وہاں انہوں نے دین و تقویٰ کا پورا لحاظ کر کے "الدین یسر" کی جلوہ سامانیوں سے بعد والوں کے متمتع ہونے کا سامان کیا۔ اس ضمن میں ابتداء تو ظاہر ہے صحابہ سے ہوتی ہے، کہ انہی کے اختلافات پر آئندہ فقہ کے اسکول قائم ہوئے، لیکن الشاطبیؒ کا کہنا ہے:

انہوں نے انہی باتوں میں اختلاف کیا جہاں اپنی رائے سے اجتہاد کی انہیں اجازت ملی تھی یعنی جن حوادث و نوازل کے معاملہ میں کوئی صراحت نہ ملی وہاں کتاب وسنت سے استنباط کی روش اختیار کی چونکہ ہر کسی کی استعداد یکساں نہ تھی اس لئے اقوال آراء مختلف ہو گئے

سچ پوچھیں تو ان اختلافات کو اہل دل واقعی رحمت سمجھتے ورنہ جب عباسی خلیفہ منصور مرحوم نے حضرت امام مالک قدس سرہ سے یہ کہا تھا کہ میں مؤطا کو سرکاری مذہب قرار دینا چاہتا ہوں تو وہ انکار فرماتے۔ شعرانی نے میزان الکبریٰ میں امام صاحب کے حوالے سے لکھا ہے

عباسی خلیفہ منصور نے حج کیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے تو پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ نے جو کتاب لکھی اس کی نقلیں بنواؤں پھر مسلمانوں کے ہر شہر

میں انہیں بھجوادں اور حکم دوں کہ لوگ انہی کے مطابق عمل کریں ان کی حدود سے متجاوز ہو کر کچھ نہ کریں۔"

یہ نظریہ تھا منصور عباسی کا جو غالباً اس دور کا روئے زمین کا سب سے بڑا حاکم تھا اس کے ارادے کے پورا ہونے میں کیا دیر لگتی، اس طرح امام مالک کی ساری دنیا میں جے ہو جاتی لیکن امام نے کہا اور پوری قوت سے:

یا امیر المومنین لا تفعل هذا ایسا بالکل نہ کریں۔

وجہ اس کی کیا ہے ــــ سن لیں اور غور سے، کہنے والے امام مالک ہیں جن کے موطا کو ساری اسلامی دنیا میں نافذ کرنے کا عزم ہے:

"مسلمانوں کے پاس دوسرے علماء کے اقوال بھی پہنچ چکے، حدیثیں وہ سن چکے روایات کرنے کی انہیں توفیق ہوئی۔ لوگوں کے پاس جو بات پہلے پہنچ چکی اس پر وہ عمل کر رہے ہیں پس ہر آبادی کے لوگ جو کر رہے ہیں انہیں وہی کرنے دیں۔"

خلیفہ کی سمجھ میں بات آگئی ارادہ ملتوی کر دیا لیکن چندے بعد ہارون الرشید کا دور آیا تو اس نے سفر حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ پہنچ کر انہی امام مالک رحمتہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی، امام خود راوی ہیں:

"کہ ہارون نے مجھ سے مشورہ کیا کہ خانہ کعبہ میں "الموطا" لگا دی جائے اور عام مسلمانوں کو اس کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت کی جائے اور انہیں اس پر آمادہ کیا جائے۔"

میزان الکبریٰ میں شعرانی نے یہ داستان نقل کرتے ہیں، اب ان سے امام کا جواب سنیں، خلیفہ ہارون سے فرمایا۔

"میاں جی، ایسا مت کریں لا تفعل۔ کیوں؟"

فان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ کے رفقا گرامی اسلام کے
اختلفوا فی الفروع وتفرقوا	فروعی مسائل میں مختلف الرائے تھے
فی البلدان وکل مصیب۔	وہ حضرات مختلف آبادیوں اور شہروں میں پھیل

گئے اور حق یہ ہے کہ ان میں سے
ہر ایک مصیب اور درست ہے،

ہارون الرشید نے امام کی زبان سے یہ سنا تو فرط مسرت وخوشی سے اچھل کر کہہ اٹھا کہ:

یا ابا عبد اللہ وفقک اللہ اے ابو عبداللہ (امام مالک کی کنیت) اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیک توفیق دی،

تو جناب والا یہ ہے رویہ ائمہ گرامی کا اور یہ ہے طرز عمل اس دور سعادت کے حکمرانوں کا، اس وسعت اور "ہمہ درست" کے نظریہ کا سلسلہ کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔

امام شافعیؒ مستقل امام ہیں لیکن میزان الکبریٰ میں ہے:

"امام ابوحنیفہ کے مزار پر فاتحہ وحاضری کو گئے تو نماز میں اپنے مسلک کے برخلاف قنوت چھوڑ دی اور سوال پر فرمایا کہ وہ اس کے قائل نہ تھے یہاں کیسے پڑھوں؟"

یہ اختلافات ہماری تاریخ کا حصہ ضرور ہیں لیکن ان کے سبب سر پھٹول کہیں نہیں، بلکہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ تو فرماتے ہیں کہ:

"ان اختلافات میں نفی واثبات والا قاعدہ متعلق ہی نہیں ہوتا

ایک سوال ہے کہ جن مسائل میں ائمہ میں اختلاف ہے، وہ اختلاف کرنے والے سبھی حق پر ہیں یا ان میں سے کوئی ایک حق پر ہے؟ عقد الجید میں اس پر مفصل بحث ہے فرماتے ہیں کہ سب حق پر ہیں" ابوالحسن اشعری سے لے کر قاضی ابوبکر باقلانی تک اور امام ابویوسف سے لے کر امام محمد تک نہیں بلکہ۔

ونقل عن جمهور المتكلمين من الاشاعرة والمعتزلة۔	کہ سب کا حق کہ معتزلہ کا یہی مسلک ہے کہ اختلاف کرنے والا ہر ایک حق پر ہے ہے

ۡلہ بحوالہ تدوین فقہ صفحہ ۶۹

اور امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ تو اس کو اختلاف ماننے ہی نہیں بلکہ وہ پچھلی گفتگو کے حوالہ سے اسے وسعت وگنجائش قرار دیتے ہیں۔

لا تقولوا اختلف العلماء فی کذا بل قولوا قد اوسع العلماء علی الامۃ بکذا ۔

کہ ایسے نہ کہو کہ علماء نے اختلاف کیا بلکہ یوں کہو کہ علماء نے امت میں گنجائش پیدا کی اور ان کے لئے توسع کا راستہ اختیار کیا۔

مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ جو نبیرہ ہیں حضرت حکیم الامت امام ولی اللہ الدہلوی قدس سرہ کے ——— انہوں نے کتنی اچھی بات کہی "تقویۃ الایمان" کے محرف نسخوں پر عمارت قائم کرنے کے بجائے "عبقات" کی ایک عبارت کا ترجمہ ذرا ملاحظہ فرمالیں لے ۱۱

اہل حق کا مختلف ہونا، جیسے ائمہ اربعہ کا اختلاف یا اشعریہ اور ماتریدیہ کا اختلاف یا مختلف سلاسل وطرق میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں یا صوفیہ میں وجودیہ ورائیہ اور شہودیہ عالیہ کا اختلاف، ان سب اختلافات کے متعلق فیصلہ یہی ہے کہ ہر ایک ان میں سے اکثر مسائل میں برسر حق ہے اور ہر ایک اپنے سامنے ایک رخ رکھتا ہے جس کی طرف وہ توجہ کئے ہوئے ہے ——— اے مسلمانو! نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرو، آخر میں فرماتے ہیں:

فمن اتبع واحدا منھم فاز بالمقصود۔

پس ان میں سے جس کسی کی کوئی پیروی کر گیا مقصود کو پالے گا۔

اور اسی پر بس نہیں فتح المعین اور شامی جیسی ذمہ دار کتابوں میں ہے

لو افتی بقول مالک فی مواضع الضرورۃ حنفی لا بأس بہ۔

ضرورت کے وقت امام مالک کے قول کے مطابق حنفی فتویٰ دے تو حرج نہیں

مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں کہ:

اس مثال میں امام مالک کا نام محض بطور مثال ہے ورنہ مقصد یہی ہے کہ چار مجتہدوں کی فقہ دنیا میں باقی رہ گئی ہے ان سب کا یہی عالم ہے کہ ان میں سے

کن کے قول پر بوقت ضرورت فتویٰ کی اجازت ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ خواہ مخواہ کا انتشار مقصود نہ ہو اور ائمہ کے بارے میں بھی احتیاط برتی جاتی ہے کہ ان کے صحیح اقوال کا لحاظ کیا جائے

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ان ائمہ کے متعلق راقم ہیں:

"ان ائمہ کے جن اقوال پر اعتماد کیا جائے وہ صحیح سندوں سے مروی ہوں اور عام مشہور متداول کتابوں میں مدون ہوں نیز یہ بھی ہو کہ مختلف پہلوؤں میں جو راجح ترین پہلو ہو اس کو ترجیح دی گئی ہو بعض مقامات پر عام الفاظ کے ساتھ عند الضرورت خصوصیت کا اضافہ کیا گیا ہو اور بعض کو مقید کیا گیا ہو مختلف اقوال میں تطبیق دی گئی ہو جو احکام ان سے ثابت ہوتے ہوں ان کے علل کو بیان کیا گیا ہو۔

ولیس مذھب فی الازمنۃ المتاخرۃ بھذہ الصفۃ الا ھذہ المذاھب الاربعۃ۔

کہ ان پچھلے زمانوں میں مذکورہ بالا صفات کے ساتھ کوئی مذہب بجز مذاہب اربعہ کے موجود نہیں۔ اس ساری گفتگو کو ملاحظہ فرمالیں اور پھر دیکھیں کہ اختلافات کی رٹ لگا کر فقہ کو جس طرح بے وقعت اور بے وزن کیا جا رہا ہے اس میں صداقت و دیانت کتنی ہے؟

حضرت امام ولی اللہ الدہلوی قدس سرہ نے اصحاب نظر کے لئے الانصاف فی بیان سبب الاختلاف کے عنوان سے جو مختصر لیکن جامع تحریر سپرد قلم کی، کاش اسے ہی دیکھ لیا جاتا تو یوں اختلافات کے متعلق داستان گوئی سے احتراز ہوتا شاہ صاحب اس میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

تخریج اور استنباط جو فقہا کا مسلک ہے اور تتبع الفاظ حدیث جو اہل حدیث کا مسلک ہے ان دونوں کی اصل دین میں موجود ہے (خرابی کی جڑ کاٹ دی کیونکہ خرابی پیدا ہی یہاں ہوتی ہے کہ میں صحیح باقی سب غلط کی رٹ لگانی شروع کر دی جاتی ہے اور پھر اس پر بھونڈے انداز سے اصرار ہوتا ہے کہ دین سے متنفر طبائع اس ضد و فساد کو بنیاد بنا لیتی ہیں) ہر دور کے فقہاء محققین کا

طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ان دونوں بنیادوں کا لحاظ رکھتے تھے فرق تھا تو یہ
کی کوئی ایک کی زیادہ رعایت کرتا تو کوئی دوسرے کی، پس کسی شخص کے
لیے یہ مناسب ولائق نہیں کہ وہ بالکل ایک ہی طرف جھک جائے جیساکہ
آج کل دونوں فریقوں کا شیوہ بن چکا ہے۔ حق کا راستہ اور صحیح موقف
یہ ہے کہ ان دونوں میں تطبیق پیدا کی جائے اور ایک سے دوسرے کے
کمزور مقامات کی اصلاح کی جائے۔ یہی تو وجہ ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ
تعالٰے فرماتے ہیں، اللہ رب العزت کی قسم، تمہارا راستہ حد سے بڑھنے
والے اور حد تک نہ پہنچنے والے کے بیچوں بیچ ہے، پس جو اہل حدیث
ہیں ان پر لازم ہے کہ اپنے مختار مسلک کو مجتہدین سلف کی رائے پر
پیش کر لیا کریں، اسی طرح اہل رائے کو چاہیئے کہ وہ اخبار و آثار کی اتنی واقفیت
ضرور رکھتے ہوں کہ کہیں کسی صحیح حدیث کی مخالفت نہ کر بیٹھیں۔ جس مسئلہ میں
کوئی قابل استناد حدیث یا اثر موجود اور محفوظ ہو اس کے خلاف اپنی رائے
پر عمل نہ کریں[1]

کلیم ہند نے جہاں اختلاف کی حقیقت کو واضح کیا اور بتلایا کہ یہ مختلف شکلیں ایک ہی چشمہ صافی کی ہیں وہاں انہوں نے نصیحت آمیز انداز میں فساد کی طبیعتوں کو سمجھا بھی دیا کہ احتیاط سے کام لیں۔

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ آج کل کی دنیا میں احناف اور شوافع کی کثرت سے اور انہی کے مذاہب کو قبول عام حاصل ہے تو انہوں نے بڑی دلسوزی کے ساتھ لکھا کہ:

عالم بالا کے علوم سے جو بات اب موافقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان
دونوں مذاہب کو ملا کر ایک کر دیا جائے جو باتیں ان میں اور کتب احادیث
میں مشترک ہوں انہیں قائم رکھا جائے جس کی کوئی اصل نہ ہو ان سے

[1] صفحہ ۳۶ عربی ایڈیشن مطبوعہ برٹ ۱۹۰۷ء

اجتناب برتا جاتے پھر جو چیزیں نقد و جرح کے بعد ثابت ہو جائیں اگر وہ دلوں میں متفق علیہ ہیں تو سبحان اللہ وہ اس قابل ہیں کہ انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا جائے لیکن اختلاف ہو تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کر کے دونوں پر عمل کی صحت کا فتویٰ دیا جائے صرف کسی ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط نہ کہا جائے"۔ [1]

آج کے دور میں چونکہ اختلافات کی آندھی بری طرح چل رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اصل بات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور دورِ سعادت کے مقدس اختلافات کو اپنے دور کے خود غرضانہ اختلافات سے بھونڈے انداز سے نہ ملایا جائے۔

یہ بات پہلے گذری کہ ائمہ مجتہدین کے اختلافات کا مبنی دراصل صحابہ کا اختلاف تھا صحابہ کے اختلاف کا سبب شاہ صاحب نے یہ لکھا کہ وہ حضرات مجلس نبوی کے حاضر باش تھے ان کے سامنے حضور علیہ السلام مختلف اعمال بجا لاتے۔ یہ لوگ آپ سے مسائل دریافت کرتے لیکن بہت کم مقدار میں، بلکہ کوشش کرتے کہ کوئی باہر سے آئے وہ پوچھے اور یہ سنیں۔ حضور علیہ السلام کے ارشادات اور آپ کے اعمال سے قرائن کی بنیاد پر صحابہ علیہم الرضوان اباحت و استحباب کا فیصلہ کر لیتے اور جیسا کہ پہلے گذرا آفاقی دین جسے چار دانگ عالم میں پہنچنا تھا اس کے مبلغین کی تربیت کا یہی نہج صحیح تھا کہ "البینات" یعنی بنیادی باتوں میں ان کو پلیٹ فارم پر "بنیان مرصوص" کر کے رکھا جائے تو "غیر البینات" میں یسر و سہولت سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائے ــــ رسول اکرم علیہ السلام کے بعد صحابہ چاروں طرف پھیلے، اسلام کا دائرہ وسیع ہوا، لوگ کثرت سے داخل اسلام ہونے لگے مسائل کی بھرمار ہوئی تو صحابہ نے قرآن و سنت کی روشنی میں جواب کی سعی کی جہاں ایسا ممکن نہ ہوا انہیں بنیاد بنا کر استخراج و استنباط کی کوشش صدق دل سے کی اس میں ان کے نتائج فکر کا اختلاف لابدی تھا لیکن چونکہ اس میں نفسانیت نہ تھی اس لئے یہ پورا سرمایہ علمی امت کی متاع قرار پایا اور آئندہ کو اس سے امت کو سہولت کی راہ ملی

[1] تفہیمات الٰہیہ صفحہ ۲۱۲-۲۱۱ جلد ا مطبوعہ حیدرآباد۔

شاہ صاحب نے کتاب کے پہلے باب میں اسی پر گفتگو کی ہے اور ان مختلف اسباب کا مثالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے جو وجہ اختلاف بنے صحابہ سے اگلی نسل تابعیت کی تھی جنہیں ان سے صحبت و رفاقت اور تعلیم و تربیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ اب تابعین اور اس دوسری نسل میں سے جو جن صحابی سے وابستہ ہوا اس کی چھاپ قدرتی طور پر اس پر پڑی۔

ابتدائی دور میں دو مقام ایسے تھے جہاں اس انداز سے تعلیم و تربیت کی گرم بازاری ہوئی ایک تو یہ مدینہ طیبہ تھا جو رسول اکرم علیہ السلام کا دار الہجرت اور آخری مستقر تھا صحابہ کرام اپنے آقا سے استفادہ کی غرض سے چاروں طرف سے اس شہر میں ٹوٹ پڑے اور پھر بعد کی نسل ان سے شرف ملاقات کی غرض سے بھی ادھر متوجہ ہوئی۔

دوسری طرف اس دور میں کوفہ کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ دورِ فاروقی میں دراصل یہ نیا علاقہ پھلا پھولا۔ متعدد صحابہ وہاں نقل مکانی کر گئے حضرت عمرؓ نے سب سے اہم بزرگ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیج کر اہل کوفہ کو توجہ دلائی کہ جس شخص کے علم و فضل کی مجھے بذات خود ضرورت تھی اس جگر کے ٹکڑے کو کاٹ کر تمہاری طرف ارسال کر رہا ہوں اب اس گوہر علم کی قدر تمہارا کام ہے۔

اغلباً فاروقی بصیرت نے اس شہر کا انتخاب اس لیے کیا کہ آئندہ عجمی فتوحات کے بعد باہمی رابطہ کا کام اسی شہر کو دینا تھا اور ہوا بھی ایسا ہی، دائیں بائیں کی اقوام سے رابطہ اور انہیں اسلامی تہذیب میں رنگنے کا کام اسی شہر سے ہوا اب جو نئے لوگ آتے اور کثرت سے آتے تو ظاہر ہے ان کے ساتھ مسائل بھی تھے ان مسائل کا حل ان حضرات کو فرض تھا۔ مدینہ منورہ کی تمدنی ضرورتیں سادہ اور سہل تھیں، یہاں ایک نئی تہذیب کے حملہ کا خطرہ تھا اس چیلنج کو قبول کرنا اور اس سے مسلمان کو بچانا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام جیسے دین فطرت کو اس عقلی انداز سے پیش کرنا تاکہ عقل و درایت کی رسیا یہ قومیں مطمئن ہو کر وحدت ربانی اور عقیدۂ آخرت کی وہ حقیقت تسلیم کر لیں جسے خاتم المعصومین علیہ السلام نے پیش کی، سب سے بڑی ضرورت تھی اس ضرورت نے ہی حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جملہ "اجتہد برائی" کی حقیقت السم نشرح کی اور قرآن و سنت کے سوتوں سے استنباط و استخراج کے ذریعہ صحابہ اور

تابعین وقت کا حملہ روک سکے۔

حالات و ماحول اور ضرورت وقتی کی جو تصویر سامنے آئی اس کے حوالے سے دو فقہی مسلک سامنے آئے جن میں سے ایک کی نسبت و انتساب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو دوسرے کی نسبت حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف یہ دونوں کسی درجہ میں ایک ہی عہد کے بزرگ ہیں۔ ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ ملاقات کی تفاصیل بھی ملتی ہیں لیکن ایک دوسرے کے معاملہ میں کسی قسم کے ناک بھوں چڑھانے کی خبر نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک مدینہ کے سادہ معاشرہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں منہمک تھے تو امام ابو حنیفہ عجم کے راستہ سے آنے والے تمدن کے سامنے بند باندھنے اور ادھر ادھر کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی فکر میں تھے اور دونوں ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو کر ہی مطمئن تھے کسی پر نکتہ چینی نہ تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے بعد سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اپنا دارالحکومت اس شہر کوفہ کو بنایا تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر قوت اسی شہر میں منتقل ہو گئی۔ انتظامیہ سے لے کر عدلیہ اور مقننہ تک سبھی اداروں کا مرکز یہ شہر تھا اس حوالہ سے یہاں مزید مسائل کا سر اٹھانا اور مختلف النوع حالات کا پیش ہونا لازم تھا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ فقہ حنفی کے حدیثی مستدلات میں انہی صحابہ یعنی عبداللہ بن مسعود سے لے کر سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایات، آثار و آراء اور قضایا کی تعداد اور زیادہ ہے، ہمارے اس موقف کی تائید مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مقیم فرانس کے اس خطبہ سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے چند سال قبل بہاول پور میں فقہ پر دیا اور واضح طور پر بتلایا کہ مسلمان قوم ابتدا میں ہی ایشیاء یورپ اور افریقہ کے تینوں ہی براعظموں میں پہنچ گئی تو بیسیوں اقوام سے اس کا واسطہ پڑا، متعدد اہل مذاہب اس کی رعایا میں تھے، اس لیے نئے مسائل روز سامنے آتے اور اسے بہت غور و فکر سے کام لینا پڑتا۔

ڈاکٹر صاحب نے کوفہ کی اہمیت اور اس جدید علاقہ کے دروازہ کے طور پر بھی اس کا ذکر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ وہاں موجود حضرات پر اسلام کے نظام عدل کی تشریح

وترجمانی کا زیادہ بوجھ تھا لیکن وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ ان حضرات نے قرآن وسنت سے انحراف یا کم از کم لفظوں میں تساہل برتا اور اپنے ہی فکر و وجدان اور دانش پر ساری عمارت تعمیر کر دی۔ بلکہ انہوں نے کمال درجہ کی حذاقت سے ذخیرہ احادیث کو کھنگالا اور آنے والے دور کی مشکلات کا حل ان سے نکالا۔ اس سکول کا انتساب جس بزرگ شخصیت کی طرف ہے اس کی کتاب "مسند ابی حنیفہ" حدیث کی قابل ذکر اور مستند کتاب موجود ہے پھر آپ کے شاگرد امام محمد کی موطا امام محمد ایک اور خادم مسلک امام طحاوی کی کتاب، نیز مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ سب وہ کتابیں ہیں جن میں حنفیت کے لیے دلائل کا انبار موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اس خطبہ میں امام صاحب کی قانونی کاوشوں کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کا کام ہر اعتبار سے مکمل اور مناسب تھا۔

امام صاحب کے برعکس امام مالک کی کاوشوں کی بنیاد ان صحابہ کے اقوال پر ہے جو مدینہ منورہ میں تھے لیکن یہ بات توطے ہے کہ اہل مدینہ ہوں یا اہل کوفہ سب کا منبع تو ایک ہی تھا، سب نے جو لیا صحابہ سے لیا یا براہ راست سعادت رسول اکرم سے حاصل کی تو اس کے بعد یہ کہنا کیسے درست ہو گا کہ ان میں ایسا اختلاف تھا جس سے کوئی قیامت ٹوٹ پڑی

اگر امام مالک رحمۃ اللہ تعالےٰ پر حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صادق آتا ہے کہ:

"وہ زمانہ قریب ہے جب لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں نکلیں گے تو وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو نہ پائیں گے"

تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالےٰ پر بھی آپ کا یہ ارشاد صادق آتا ہے کہ:

"اگر علم ثریا تک پہنچ جائے تو اہل فارس میں ایک شخص اس کو حاصل کر کے چھوڑے گا"

ان ہر دو حضرات نے صحابہ کے چشموں سے فیض حاصل کر کے امت کی سہولت

وآسانی کا سامان فراہم کیا۔ ان دو حضرات کے بعد امام شافعی کا نمبر آتا ہے ان کا ایک دور وہ ہے جب وہ بغداد وغیرہ میں تھے اور پھر ایک دور وہ ہے جب وہ مصر پہنچ گئے فقہ وقانون کے دونوں مراکز مدینہ منورہ اور کوفہ سے بہت دور مصر کو جب امام شافعی نے اپنا مستقر بنایا تو ایک تو اس خطہ کی آب وہوا اور مخصوص حالات کے سبب انہیں کسی حد تک نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا دوسرے زمانہ کے تاخیر کے اعتبار سے انہیں مختلف اطراف وبلاد کے سفر کے دوران احادیث وآثار سے بھی زیادہ آگاہی ہوتی اس لیے انہوں نے استنباط واستخراج کے لیے نئی راہیں نکالیں بدلے ہوئے حالات ہی کا کرشمہ ہے کہ اکثر وبیشتر مسائل میں ان کا قول قدیم اور قول جدید ملتا ہے لیکن یہ ان کی صفائی باطن اور دیانت کی دلیل ہے کہ نئی بات سامنے آتے ہی انہوں نے قدیم بات پر کسی طرح بھی اڑنا اور اصرار کرنا پسند نہ کیا بلکہ پوری وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوتے اپنی آراء پر نظر ثانی کی۔

اہل حدیث اور اصحاب رائے میں اختلاف کے اسباب پر حضرت شاہ ولی اللہ نے تفصیل سے گفتگو کی۔ اس عنوان سے ان کا یہ مقصد نہیں کہ کوئی طبقہ محض حدیث سے وابستہ ہے عقل وخرد کو کام میں نہیں لاتا اور اس کی سوچ کے سوتے خشک ہو گئے ہیں یا کوئی طبقہ محض رائے ہی کا پابند ہے اسے حدیث سے دلچسپی نہیں ایسی بات بالکل نہیں صرف غلبہ ذوق کی بات ہے اور ہمارا خیال یہ ہے کہ شرعی حدود کے اندر رہ کر غلبہ ذوق ہو تو اس میں قطعاً حرج نہیں اس میں اختلاف کا بڑا سبب وہی ہے کہ اہل مدینہ کی معاشرت سادہ اور مسائل مختصر تھے اور وہاں صحابہ بکثرت تھے تو اہل کوفہ کے سامنے حوادث ونوازل کا طوفان تھا اور مدینہ کے مقابلہ میں یہاں روایات حدیث بیان کرنے والے اس تناسب میں نہ تھے امام شافعی کو جہاں مصر کے علاقہ کے ترقی یافتہ تمدن سے واسطہ پڑا جو شروع سے شہرہ آفاقی تھا وہاں صحابہ کرام کے اس طبقہ کی میراث سے بھی بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل ہوتی جو دور فاروقی کی جہاد مہم میں یا بعد میں مصر آئے اور پھر یہیں آسودہ رحمت ہوتے ان کے آثار علمی کے وارث اس خطہ

میں کثرت سے تھے ان سے امام شافعی کو استفادہ کا موقعہ ملا۔ یوں حرمین شریفین سے لے کر بغداد اور... مصر تک حالات اور آثار علمیہ سے استفادہ کی سہولتوں نے ان کے سامنے نئی صورت کا عکس پیش کیا رہ گئے امام احمد بن حنبل جنہیں مولانا مناظر احسن گیلانی قلیل دنیا کا نمائندہ کہتے ہیں لیکن حدیث میں جو بہرطور پر مسلم اور بڑھ کر ہیں ان کا زمانہ خاصا مؤخر تھا اور اس وقت ذخیرہ احادیث خوب سامنے آچکا تھا تو ان کے یہاں عقل و درایت اور قیاس کا معاملہ بہت کم ہے جس کا اندازہ ان کتابوں سے ممکن ہے جو اس فقہ کے حوالے سے لکھی گئیں۔

شاہ صاحب نے اشد سے بات واضح کرتے ہوئے آخر میں وہی بات لکھی جس کا ہم پہلے حوالہ دے چکے کہ دونوں ہی طبقوں کے ذوق علمی کی اصل بہرطور دین اسلام میں موجود ہے جو اعجاز ہے اس دین کا کہ اس دنیا کو "بیت ہر کہ ومہ" تک پہنچنا تھا اگر اس کے خدام اس طرح گنجائش وسعت بقول امام سفیان ثوری پیدا نہ کرتے تو امت بیچاری الجھن کا شکار ہو جاتی۔

آخر کو دیہاتی اور شہری کے مسائل اگرچہ جدا ہیں اور صنعت و تجارت اور زراعت و کاشتکاری کی دنیا مختلف ہے تو کیا یہ دنیا اس اختلاف کے بعد غرق آب ہو گئی ہاگر ایک امام نے مثلاً سمندر کی ہر چیز کو حلال کہہ دیا اور کروڑوں انسان جو سمندروں کے کنارے بستے ہیں اس سے متمتع ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے نے ماسوائے مچھلی کسی کی اجازت نہیں دی اور سمندروں سے دور بسنے والے اس پر عمل پیرا ہیں تو حرج کیا ہے اور اس میں قباحت کونسی ہے۔

یہی ایک مثال اہل دانش کے لیے کافی ہے ورنہ فقہی ذخیرہ کا تقابلی مطالعہ اور اس ضمن میں حالات و ظروف کا تجزیہ ان سب اعتراضات کو ختم کر سکتا ہے جو غریب فقہا کے اختلاف پر ہوتے ہیں اور جنہیں ملحدین زمانہ اسلام سے دوری کا بہانہ بناتے ہیں۔

بس ضرورت اس کی ہے کہ شاہ ولی اللہ کے بقول نفرت و عناد کا طریقہ نہ اپنایا

جائے بلکہ باہمی ربط و تعلق ایک دوسرے کے نتائج فکر سے استفادہ اور نت نئے علمی ذخیروں سے آگاہی کا مشغلہ برابر جاری رہے کہیں اپنی کسی رائے کی غلطی ثابت ہو جائے تو اس سے رجوع کر لیا جائے تو اس سے خیر کا ہی ظہور ہو گا اور کسی قسم کی جگ ہنسائی کا اندیشہ باقی نہ رہے گا حیرت ہے کہ ائمہ مجتہدین پورے شرح صدر سے ایک دوسرے کے نتائج فکر کی قدر کرتے ان کا احترام بجالاتے اور کسی کو برسر غلط نہ سمجھتے لیکن بعد میں وہ رواداری اور باہمی ربط و محبت رخصت ہو گئے اور "غیر بنیانی امتہ پرلمی کی گرم بازاری ہو گئی جو کسی طرح درست اور صحیح نہیں بلکہ اس سے "بنیانی حصہ دین کے ضیاع کا خطرہ ہے جس کا وبال بڑا سخت ہے

ہماری خواہش تھی کہ شاہ صاحب کے اس گرانقدر رسالہ کا ملخص شامل مقالہ کر دیتے لیکن وقت و حالات نے اس کی اجازت نہ دی ویسے بھی وہ چھپا ہوا دستیاب ہے اور بقدر ضرورت اس سے حوالہ جات دے بھی دیئے گئے ہیں اس لیے امید کرتے ہیں کہ ارباب نظر اس کو کافی سمجھیں گے اور جہاں کوئی بھول ہوئی اس سے آگاہ کر کے اجر و ثواب حاصل کریں گے۔

آج دنیا جس طرح سمٹ کر ایک گھر کی مانند ہو چکی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم ایک ہی گھر کے باسی ہیں، زمین کی طنابیں کھنچ چکی ہیں اور ایک طرف سے دوسری طرف آنا اور پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں رہا تمدنی ضرورتیں، حالات و ظروف کا رخ بدل گیا ہے ان حالات میں ضروری ہے کہ اہل فقہ و اجتہاد امام ولی اللہ قدس سرہ کے ذوق کے مطابق وسعت قلبی کا مظاہرہ کریں عظیم فقہی سرمایہ کو سامنے رکھ کر قربت کی ایسی راہیں تلاش کریں جن میں سابقہ دور کی باہمی محبت کی جھلک موجود ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کل دنیا ایک فقہی مکتب فکر پر متفق ہو جائے، ایسا تو خود ایک امام مجتہد امام مالک نے پسند نہ کیا اور نہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اس کی اجازت دی۔ بلکہ ہمارا مقصد و مدعا یہ

ہے کہ زیادہ تر یت کی جو شکلیں ہو سکتی ہیں وہ تو ظہور پذیر ہوں، آ خرج کے مقدس سفر ہیں ہر فقہی مکتب فکر علمبردار اگر اپنی اپنی الگ سوچ کے باوصف بنیادی فرض کی ادائیگی میں یکساں نظر آتے اور ایک ہی رخ چلتے ہیں تو حرمین شریفین کی مقدس فضاؤں سے باہر نکل کر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا اور دوسرے مقامات پر رواداری اور باہمی احترام کا جذبہ کیوں سرد پڑ جاتا ہے؟

گویا فقہی اختلافات کی آڑ میں دین کے بنیادی حصہ پر طعنہ زنی غلط ہے تو اس غیر بنیادی حصہ میں کش مکش کی فضا اور بُعد و منافرت کا جذبہ بھی غلط ہے بس دور آخر کے اس مجدد کبیر اور حکیم امت امام ولی اللہ کے ذوق و مسلک کو بنیاد بنا لیا جاتے تو خیر ہی خیر ہوگی۔ ع بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(بشکریہ رسالہ منہاج سہ ماہی)

(صفحہ ۱۶ کا بقیہ) اور اس وقت بھی مسلم پرسنل لاء اور بابری مسجد وغیرہ کے سلسلہ میں جو کام ہو رہا ہے اس میں بھی اسکی یہ حیثیت باقی ہے ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ادارہ کے ذمہ داروں کو اس کی مزید توفیق دے اور ان کو اور ادارہ کو اپنی عافیت میں رکھے۔

مسلم پرسنل لا اور دستور ہند

(محی الدین احمد صدیقی ایڈوکیٹ فیض آباد)

مورخہ ۲۳/ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے بسلسلہ مقدمہ محمد احمد خان بنام شاہ بانو بیگم کریمنل اپیل ۱۰۳/۱۹۸۱ء (۱۹۸۵ء اے۔ آئی۔ آر۔ سپریم کورٹ صفحہ ۹۴۵ تا ۹۵۵) میں جو فیصلہ دیا ہے اس کے نتائج کیا ہیں اور کہاں تک مسلمانوں کے قانون شریعت پر اثر انداز ہے اسے سوچنا۔ اس پر اپنی رائے ظاہر کرنا اور احتجاج کرنا ہم مسلمانوں کا اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے اشد ضروری ہے۔

بسا اوقات قوموں کو امتحان سے گذرنا پڑا ہے جو اس میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ قائم رہتی ہے اور جو ناکام ہوتی ہے اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر مکمل روشنی ڈالی جائے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ہندوستان کے دستور کے بموجب کون کس چیزیں قانون مانی جاتی ہیں

اول قانون جو پارلیمنٹ دوئم جسے صوبہ کی اسمبلیاں پاس کرتی ہیں اور سوئم سپریم کورٹ کے فیصلہ جات۔ لہٰذا سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی ملک کا قانون مانا جائے گا اور یہ کسی بھی وقت ایکٹ کی شکل میں آسکتا ہے۔ بحالت موجودہ ہر عام و خاص مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خداوند قدوس کے بتائے ہوئے قوانین و ضابطۂ حیات یعنی مسلمانوں کے قانون شریعت پر ضرب نہ آنے دے اور اس کے خلاف پُرامن طور پر ایک سیکولر ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے احتجاج کرے اور اپنے مسائل موجودہ حکومت کے سامنے رکھکر دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری میں ترمیم کا مطالبہ کرے رولنگ مذکور پر

مندرجہ ذیل پہلو سے غور کرنا ضروری ہے

(الف) قانون کی روشنی میں اب آیئے یہ دیکھا جائے کہ مذکورہ بالا رولنگ کیا کہتی ہے اور کہاں تک دستور ہند کے مطابق ہے اس کے بموجب مندرجہ ذیل پہلو قابل غور ہیں

ا۔ اس رولنگ کے بموجب ایک مطلقہ عورت کے نان نفقہ یا گزارہ کا حق شوہر پر قانونی شریعت یعنی مسلمانوں کے پرسنل لا میں ہے۔ اور وہ دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری کے ہم معنی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں جو لفظ بیوی (Wife) استعمال کیا گیا ہے کہ اس میں جو لفظ عورت Divorced woman کو بھی شامل کر لیا گیا ہے

اب دیکھنا ہے کہ بحالت موجودہ دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری و رولنگ مذکور کہاں تک دستور ہند کے مطابق ہے تو دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری میں ترمیم لازم ہے۔ دستور ہند کی آرٹیکل ۲۵ اس بات کی مکمل طور سے ضمانت دیتی ہے کہ آزاد ہندوستان کے ہر شہری کو اپنے مذہب کے مکمل طور پر ماننے اور اسے پھیلانے و تبلیغ کرنے کا مکمل اختیار ہے اسی طرح آرٹیکل ۲۹ کے ذریعہ ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو قائم رکھنے کی کوشش کرے اور رکھے۔

[illegible]

چنانچہ ان دونوں آرٹیکل ۲۵ و ۲۹ کے بموجب یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر ہندوستانی چاہے وہ کسی بھی ذات یا دھرم کا ہو اپنے مذہب کے قانون و شرح کو ماننے کا مکمل اختیار رکھتا ہے اور اس پر ملک کا کوئی دوسرا قانون مذہب سے متعلق نافذ نہیں ہو سکتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے قانون شریعت میں گذارہ و نان نفقہ بابت شادی شدہ عورت و مطلقہ عورت کے بارے میں جو قوانین یا اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں وہ دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری و رولنگ مذکور سے قطعی مختلف ہیں اور ان میں کسی طرح کی یکسانیت نہیں ہے قانون کی ایک بنیادی بات یہ بھی ہے کہ کسی ملک کا عام قانون یعنی General law of the land جیسے ضابطہ فوجداری کسی بھی طبقہ یا قوم کے قانون کو مسترد نہیں کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس طور سے مسلمانوں کے قانونِ شریعت کے کسی بھی حصہ پر ملک کا کوئی قانون جاری یا نافذ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یہاں پر کہنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے قانون شریعت میں بیوی (wife) اور مطلقہ عورت divorced wife. دو الگ چیزیں ہیں اور انہیں رولنگ یا قانون میں ایک شکل دینا قطعی غیر مناسب ہے۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ دفعہ ۱۲۵ تا ۱۲۸ - Chapter IX ضابطہ فوجداری میں رکھا گیا ہے ان دفعات کے ذریعہ ایک عورت کو گذارہ مانگنے اور وصول کرنے کا حق دیا گیا ہے یہ مسئلہ ایک سول حق کا ہے ضابطہ فوجداری جو فوجداری کی عدالتوں کا Proceedure بتاتی ہے۔ اس میں ان دفعات کے رکھے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سول حقوق کو فوجداری کی عدالت سے دلایا جائے اور یہ بات un constitutional اور غیر مناسب ہے۔ چنانچہ [illegible] میں جب یہ بنائی گئی اس وقت chaptar IX کا شامل کرنا غیر مناسب تھا۔ لیکن وہ انگریزوں کا دور تھا اور انہوں نے ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کی غرض سے قوانین بنائے تھے۔

مگر آزادی حاصل ہونے کے بعد قانون دانوں اور اس کے بنانے والوں کو احتیاط کرنا چاہئے کہ وہ ایسا قانون نہ بنا دیں جس سے دوسری قوموں کے جذبات مجروح ہوں یا ان کے ذاتی قوانین پر اثر پڑے چنانچہ مکمل un constitutional chapters ہے اور اگر حکومت اسے رکھنا ہی چاہتی ہے تو کم از کم اس کا اطلاق مسلمانوں کے قانونِ شریعت پر نہ ہو۔

۲ — رولنگ متذکرہ بالا میں دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ ملک میں دستور ہند کی آرٹیکل (۴۴) کے تحت ایک سول کوڈ بنا دیا جائے۔ یہ بنیادی طور پر ناممکن ہے۔ اور دستور کی آرٹیکل (۲۵) و (۲۹) میں دیئے گئے اختیارات کے قطعی منافی ہے۔ ایک طرف تو آپ ہمیں مکمل اختیار دے رہے ہیں۔ دوسری طرف اسے سول کوڈ کے ذریعہ سے لینے کی کوشش یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک سیکولر ملک میں کسی قوم کے ذاتی قانون اور ضابطہ حیات کو ختم کرنا قطعی غلط ہے۔ یہ کام آرٹیکل (۴۴) کے تحت اسی وقت ہو سکتا ہے جب آرٹیکل ۲۵ و ۲۹ قلمزد کر دیا جائے۔ میری رائے میں دستور ہند میں آرٹیکل (۴۴) کی کوئی ضرورت نہیں ہے جب کہ دوسری قوموں یا بالخصوص مسلمانوں کے پاس اپنا ایک خدائی قانون و ضابطۂ حیات ہے۔
دوسری قومیں بھی اس سے مدد لے سکتی ہیں۔

(ب) قرآن حکیم کی روشنی میں — رولنگ متذکرہ بالا پر قرآن حکیم کی روشنی میں بہت سے علمائے دین ومفکر اسلام نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سے قبل کہ خاکسار کچھ لکھے۔ یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا مکمل قانون وضابطۂ حیات قرآن حکیم کی زبان میں اور منجانب خدا ہے اور اس میں ترمیم قطعی نامناسب اور غلط ہے بلکہ دینی طور پر گناہ ہے مسلمان جو ذرہ برابر دین سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اور اس میں خوف خدا ہے کسی طرح کی خلاف رائے دینے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے آیت ۲۴۱ و ۲۴۲ کے حوالے سے رولنگ مذکور میں یہ کہا گیا ہے کہ ان آیات مقدسہ کا مطلب maintenane سے ہے۔ یہ آیت مقدسہ سورۃ البقر کی ہیں۔ جہاں تک آیت ۲۴۱ کا سوال ہے اس کا کوئی تعلق لفظ maintenane سے نہیں ہے اب رہا آیت ۲۴۲ کیا اس سے جو مطلب عدالت العالیہ سپریم کورٹ نے نکالا ہے main-te-tanance سمجھا جائے گا یا نہیں اس پوری آیت کریمہ میں لفظ (متاع) کا

interpetation ہوتا ہے۔ اس کا مطلب جہاں تک میں مطالعہ کر پایا ہوں وہ صرف (تحفہ تحائف) ہیں۔ کسی طرح سے اس کا مطلب Maintenance یعنی گذارہ نہیں نکالا جاسکتا ہے۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن حکیم کا کوئی لفظ اتفاقی یا بھرتی کا نہیں ہوتا۔ یہ کوئی شاعری کا نہیں۔ اس میں جو بھی الفاظ ہیں وہ منجانب خدا ہیں اور ہر موقع کے لحاظ سے آئے ہیں۔ اس کے معنی مختلف اشخاص الگ الگ نہیں کہہ سکتے ہیں اور اگر کہتے ہیں تو یا ان میں علم کی کمی ہے یا خدا کا خوف نہیں ہے اور اپنے کو ایک آزاد خیال انسان اور دوسروں کی نگاہ میں مقبول ہونے کے لئے کرتے ہیں جو قطعی غلط ہے۔ دیگر لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آج کل کے آزاد خیال لوگ جو قرآن حکیم کی بلندی تک پہونچنے سے قاصر ہیں اس کو اپنے سمجھنے کے لئے پستی کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ جو قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اسے خدا پسند نہیں فرماتا۔ قرآن حکیم میں دیئے گئے احکامات ایسے نہیں ہیں جن کے مختلف معنی نکالے جائیں لہذا لفظ (متاع) کے معنی گذارہ سے ہے قطعی ماننے لائق نہیں :-

قرآن حکیم میں جو بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے پیچھے ایک فلسفہ ہے۔ مسلمانوں میں نان نفقہ یعنی گذارہ ایک مطلقہ عورت کو نہ دینے کی وجہ ہے کیونکہ وہ دوسری شادی کر سکتی ہے اور دوسری شادی نہ کرنے کے حالت میں اس کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے والدین اور ان کے وارثان پر ہے اور شرعی حکومت کی حالت میں بیت المال کے ذریعہ مدد ہو سکتی ہے۔

اس کا یہاں زیادہ ذکر کرنا مناسب نہیں کیوں کہ یہاں پر مسئلہ زیر بحث صرف یہ ہے کہ (متاع) کے کیا معنی ہیں اور اسے کیا شکل دی جاسکتی ہے اگر تحفہ تحائف کے علاوہ کوئی دوسرے معنی دیئے جاتے ہیں تو وہ شرح اور قانون شریعت کے خلاف ہے اور اس طرح کے معنی عام مسلمانوں پر تھوپنا نہایت ہی غلط اور دستور ہند میں مسلمانوں کو دی گئی ضمانت کے منافی ہے۔

کسی بھی قانون میں جب کسی بھی قوم کے قانون یا بحالت موجودہ قرآن حکیم کے الفاظ کے معنی دینے ہوں تو اس قوم کے مفسرین کی متفقہ رائے دیکھنی چاہئے اسے نہ دیکھنے میں

رولنگ مذکرہ بالا میں بھول گئی ہے جواب بھی دیگر طریقوں سے درست ہو سکتی ہے، مفسرین سے میرا مطلب ہے جو قرآن حکیم کو اس کے صحیح مفہوم میں سمجھتے ہوں نہ کہ وہ لوگ جو قرآن اور اس کے اسرار و مقاصد کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور مسلمانوں کے قانون شریعت کی بابت اپنی رائے دینا اور کتابیں لکھنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور نام کے مسلمان ہونے کے ناطے مسلمان قوم کی سرداری دیگر مذاہب کے درمیان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

خادم ناکارہ

محی الدین احمد صدیقی ایڈوکیٹ

۱۸۔ سول لائن فیض آباد

فارم نمبر ۴

بیان بابت ملکیت اخبار و دیگر تفصیلات

۱۔ مقام اشاعت ۔ رشاد نگر اعظم گڈھ

۲۔ وقفہ اشاعت۔ ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام ۔ حبیب اللہ ندوی

قومیت ۔ ہندوستانی

پتہ ۔ جامعۃ الرشاد، رشاد نگر اعظم گڈھ

۴۔ پبلشر کا نام حبیب اللہ ندوی

قومیت ۔ ہندوستانی

پتہ ۔ جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڈھ

۵۔ اڈیٹر کا نام۔ حبیب اللہ ندوی

قومیت ۔ ہندوستانی

پتہ ۔ جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڈھ

۶۔ ملکیت ۔ ایجوکیشنل سوسائٹی جامعۃ الرشاد

رشاد نگر ۔ اعظم گڈھ

میں حبیب اللہ ندوی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

حبیب اللہ ندوی ۱۹۸۶ء

وَفیات

آہ! شوکت سلطان صاحب

پچھلے مہینہ باشندگان اعظم گڈھ کو ایک جانکاہ حادثہ سے دوچار ہونا پڑا وہ حادثہ تھا شبلی کالج کے سابق پرنسپل شوکت سلطان صاحب کا اچانک انتقال اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

شوکت سلطان صاحب اعظم گڈھ کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو کئی پشت سے علم و وجاہت میں ممتاز رہا ہے ان کے دادا مرزا سلیم صاحب اعظم گڈھ کے ممتاز وکیل تھے، ان کے تین صاحبزادے تھے تین میں دو مختلف حیثیتوں سے ممتاز تھے، سلطان صاحب مرحوم اپنی ذاتی لیاقت سے کلکٹر ہو کر ریٹائر ہوئے، ملازمت کے زمانہ میں بھی اور ملازمت کے بعد بھی ہر طبقہ میں وہ ہردلعزیز رہے اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا احسان بیگ نے وکالت پاس کیا اور وکالت کا پیشہ بھی اختیار کیا مگر شعر و شاعری اور علم و ادب سے ان کو فطری ذوق تھا گو کہ وکالت کے پیشہ نے ان کے علمی و ادبی ذوق کو زیادہ پنپنے نہ دیا مگر مقالات احسان کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اردو و فارسی کے نہ صرف اداشناس تھے، بلکہ انکی تحریریں شبلی کے طرز تحریر کا عکس معلوم ہوتی ہیں

شوکت سلطان صاحب صاحب سلطان صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے تھے انہوں نے بھی ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اور وکالت کا پیشہ شروع بھی کیا مگر اس پیشے سے طبیعت کو مناسبت نہیں تھی اس لئے وہ شبلی کالج میں فارسی کی لکچررشپ قبول کر لی اور بشیر احمد صدیقی صاحب جن کے دور میں شبلی اسکول انٹر کالج اور پھر ڈگری کالج بنا ان کی جبری سبکدوشی کے بعد شوکت سلطان صاحب پرنسپل بنائے گئے اور تقریباً ۲۸ برس پرنسپل رہے اور کالج کو نہ صرف علمی اعتبار سے ترقی دی بلکہ انتظامی اعتبار سے بھی یوپی کا ممتاز کالج بنا دیا، وہ اپنے اصول اور وقت کے اتنے پابند تھے کہ

اس میں اپنے قریب سے قریب آدمی کی بھی رعایت نہیں کرتے تھے ظاہری طور پر
وہ سخت معلوم ہوتے تھے مگر اندر سے بڑے نرم دل تھے ۔

اپنی غلطی اعتراف کرنے اور دوسروں سے معذرت کرنے میں ان کو ذرا تامل
نہیں ہوتا تھا، ایک بار میں نے ان سے کہا کہ یہ کام تو آپ نے اصول دیانت کے خلاف کیا
تو وہ بولے کہ خدا معاف کرے میں نے ایسا صرف کالج کے مفاد میں کیا تھا، ان کی اصول
پسندی اور مسلمانوں کی ہمدردی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اعظم گڈھ کے ایک مرکزی
وزیر نے ان سے ایک غیر مسلم کی سفارش کی کہ ان کو کالج میں جگہ دے دی جائے
انہوں نے کہا کہ محترم یوپی میں اور پورے ہندوستان میں غیر مسلموں کے لئے نہ جانے کتنی
یونیورسٹیاں اور کالج موجود ہیں اور مسلمانوں کو ان میں بہت کم جگہ مل پاتی ہے،
مگر مسلمانوں کے تو چند کالج ہیں جن میں ایک شبلی کالج ہے اس لئے میں اگر ان کو یہاں ترجیح
نہ دوں گا تو پھر وہ کہاں جگہ پائیں گے

نماز با جماعت و تلاوت قرآن پاک روزے اور زکواۃ کے سختی سے پابند تھے، حج کی سعادت
بھی انکو نصیب تھی علماء اور بزرگوں سے تعلق رکھتے تھے جامعۃ الرشاد کی مسجد کی تعمیر شروع
ہوئی تو بڑی آہستگی اور تواضع کے ساتھ پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ یہ حقیر رقم میری
بھی شامل کرلیجئے، غرض یہ کہ بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں، یہ بھی اللہ کی مرضی
تھی کہ وہ زندگی بھر اعظم گڈھ ہی رہے مگر موت سے چند دن پہلے وہ لڑکی اور داماد سے
ملنے للت پور گئے اور وہیں دیار غیر میں ان کا انتقال ہو گیا ظفر کا یہ مصرعہ ان کے حق میں بھی
صحیح نکلا،

دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

زندگی بھر انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی خدمت کی مگر انہوں نے ان سے کوئی خدمت لینا اور
ان کے کندھے کا بوجھ بننا پسند نہیں کیا بلکہ زبان حال سے وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے رخصت ہوگئے

پھول کیا ڈالو گے میری لحد پر ۔ خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے بدلے غلطیوں کو معاف کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین

کوائف جامعۃ الرشاد

بحمداللہ مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں اردو انگریزی اخبارت میں بے شمار مضامین اور کتابچے شائع ہو چکے ہیں الرشاد میں بھی برابر مضامین اور رشحات لکھے جارہے ہیں اور ان سے مسلمانوں کو فائدہ بھی پہنچا مگر ہندوستان کی حکومت کا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ وہ علمی اور سنجیدہ زبان اور رویہ سے کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے مجبوراً مسلمانوں کو احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑا اس سلسلہ میں راقم الحروف کو بہت سے دورے کرنے پڑے بلکہ بیرون ضلع کا بھی کئی دورہ کرنا پڑا اور مدرسہ کے بہت سے اساتذہ نے بھی اس میں عملی حصہ لیا ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ بابری مسجد کے سلسلہ میں فیض آباد کے سول جج کا مجرمانہ فیصلہ سامنے آگیا جس نے عملی جدوجہد کے دائرہ کار میں مزید وسعت پیدا کردی،

بحمداللہ اس سلسلہ کی عوامی کوششوں میں بھی راقم الحروف کو ساتھ رہنا پڑا جس کی وجہ سے اعظم گڈھ ضلع میں دونوں محاذوں پر وسیع پیمانہ پر کام ہو رہا ہے ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ملی کاموں کے لیے ضلع اعظم گڈھ میں جامعۃ الرشاد مرکز بنا ہوا ہے۔

جنوری کے مہینے میں کئی علماء اور اہل علم مدرسہ تشریف لائے خاص طور پر مولانا تقی الدین ندوی صاحب کی آمد ہمارے لیے کئی حیثیتوں سے باعث مسرت ہوئی ان کے پیش نظر کئی علمی اور رفاہی کام ہیں خدا کرے وہ پورے ہوں ان کاموں میں ہماری حقیر خدمات ان کے ساتھ ہوں گی۔

فروری کی ۸/ تاریخ کو مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں رائے بریلی میں ایک جلسہ تھا جس میں راقم الحروف بھی شریک ہوا، رات ہم لوگوں نے تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ میں گذاری جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا وطن مالوف ہے ایک مدت کے بعد تکیہ جانے کا اتفاق ہوا تھا جہاں کے ایک ایک ذرہ سے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ کی تحریک کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ایمانی حرارت میں تازگی پیدا ہوتی ہے اس وقت ہندوستان میں مسلمان جن حالات سے گزر رہے ہیں ان میں ضرورت ہے کہ اپنے داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے لیے اس قصہ پارینہ کو بھی ہم دہراتے رہیں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را — گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اعظم گڈھ ضلع میں گو زیادہ تر لوگ مسلم پرسنل لا بورڈ کے حامی ہیں مگر ادھر کچھ لوگوں کو اور خود راقم الحروف کو اس کی کارکردگی کے سلسلہ میں شکوک پیدا ہو گئے تھے جس کے بارے میں بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے رائے بریلی میں گفتگو ہوئی، اور جب وہ ۱۱/ فروری کو ایک پروگرام کے سلسلہ میں اعظم گڈھ تشریف لائے تو ان کی آمد سے فائدہ اٹھا کر شہر اعظم گڈھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک خصوصی اجتماع جامعۃ الرشاد میں ہوا، جس سے کسی حد تک لوگوں کو اطمینان ہوا، آخر میں بعض حضرات نے کچھ سوالات کئے جس کا راقم الحروف نے جواب دیا،

جامعۃ الرشاد کے قیام کے جو محرکات تھے ان میں ایک قوی محرک یہ بھی تھا کہ ضلع کے مرکزی مقام میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو مدرسہ ہونے کے ساتھ مختلف دینی و ملی کاموں کا مرکز بھی رہے، بحمداللہ شروع سے مدرسہ یہ متعدد ملی کاموں کا مرکز رہا ہے (بقیہ بر صـ۵۲)

الرشاد کی ڈاک

۷ر جنوری ۱۹۸۶ء

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ستمبر ۱۹۸۵ء کا الرشاد آج پہنچا، ممنون ہوا، بارک اللہ فی مساعیکم، دو ایک چھوٹی چیزوں کے لیے زحمت دیتا ہوں، مناسب ہو تو جواب سے سرفراز فرمائیں،

(۱) قرآن مجید اور غیر عربی رسم الخط کے مضمون کو بہت دلچسپ پایا، اصل میں اسی کے سلسلہ میں زحمت دے رہا ہوں؛

(الف) قرآن مجید کا عربی املاء رسم عثمانی رض میں رکھنے کا ایک نیا فائدہ حال میں دیکھا گیا، اصل مکتوب نبوی بنام المنذر بن ساوی میں " لا إله غيره" لکھا ہوا ملتا ہے،" غیرہ " نہیں، جرمن مستشرق فلایشر کے لیے یہ کافی تھا کہ اصل کو جعلی قرار دے کہ کاتب نبوی اتنا جاہل نہیں ہوسکتا مگر قرآن مجید (سورہ ۵۱، آیت ۴۷) میں آج بھی بأييد لکھا جاتا ہے، بأيد نہیں، تاشقند میں محفوظ قرآن عثمانی رض میں ایسی بہت سی دیگر مثالیں بھی ملتی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے خط میں حرف یاء کو دو شوشوں سے لکھتے تھے، آہستہ آہستہ ایک شوشے سے لکھنے کا رواج بھی ہوگیا تھا، (بسلسلہ الرشاد ص ۳۵)

(ب) قرآن مجید کے قدیم ترین لاطینی ترجموں میں سے ایک مراچی (Maracci) کا ہے اس میں عربی متن بھی عربی خط میں ہے، صرف ترجمہ نہیں ہے (ایضاً ص ۳۹)

(ج) محمد پکتھال مرحوم کا اولین ایڈیشن صرف انگریزی ترجمے پر مشتمل ہے، اس میں عربی متن نہیں ہے،

یہ بعد کے ایڈیشنوں میں ہوا ہے، (ایضاً ص ۳۹) غالباً میرا اپنا فرانسیسی ترجمہ پہلا ہے جس میں عربی متن کے ساتھ چھپنے والے ایڈیشن میں صفحے دائیں طرف سے (عربی کتاب کی طرح) شروع ہوتے ہیں، دیگر مسلمان مترجموں کی طرح نہیں (ایضاً ص ۳۹)

(د) کاش اس بیان کی ذرا زیادہ وضاحت ہوتی (جس کی مجھے سخت ضرورت ہے) کہ "حال میں اسلامی ساہتیہ پرکاش کے زیر اہتمام مختلف ہندوستانی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے شایع ہوئے ہیں، جن میں .... متن کی بھی عربی میں کتابت شامل ہے"۔ (ص ۴۰) کیا یہ عربی متن تامل، تیلگو، کنڑی گجراتی، مراٹھی اور ہندی رسم الخطوں میں ہے یا عربی رسم الخط میں؟ کاش ان کی تاریخ طباعت بھی معلوم ہو سکے، اور مترجموں کے نام بھی،

(ھ) نند کمار اوستھی کے ایڈیشن میں صرف عربی متن بخط ہندی ہے، یا اس میں ترجمہ بھی ہے؟ (ص ۴۱)

(۲) محض اطلاعاً عرض ہے کہ تقریباً پچاس سال پہلے ایک بنگالی ترجمۂ قرآن مجید میں عربی متن بنگالی رسم الخط میں بھی تھا، کم و بیش اسی زمانے میں ترکی میں سارا قرآن (بغیر ترجمے کے) صرف لاطینی خط میں چھپا اور تا حال رائج ہے،

(۳) یہ بھی اطلاعاً عرض ہے کہ میرے علم میں سر سید وہ قدیم ترین شخص ہیں جو انگریزی زبان کو عربی خط میں لکھنے لگے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ وایسرائے کی کونسل کے رکن تھے، جو بیان دینا ہوتا تھا وہ لکھ کر انگریزی میں ترجمہ کرا کر اور اسے عربی خط میں لکھ کر ساتھ لیجاتے تھے، انہیں انگریزی زبان تو آتی تھی لیکن انگریزی خط پر عبور نہ تھا،

میں نے ۱۹۳۳ء میں لندن میں ایک انگریز نو مسلم مسٹر فولینگ کو سورۂ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ عربی خط میں لکھتے پایا، اب حال میں وہاں نو مسلم انگریزوں نے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا ہے جس میں پورے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ (انگریزی زبان بخط عربی) بہ احتیاط شایع کرنا مقصود ہے، کئی نمبر نکل چکے ہیں، خدا پروان چڑھائے۔ ایک زمانہ میں اسپینی، پرتگالی اور یونیشڈی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی تھیں،

(۴) آخر میں یہ کہ فرانس میں ہماری ایک نو مسلم بہن نے ایک کتاب شایع کی ہے (کارانت حدیث او سوژے دو فام) یعنی چالیس حدیثیں عورت کے متعلق عربی ہی نہیں ان کا فرانسیسی ترجمہ بھی عربی خط میں دیا ہے جیسا کہ نام سے واضح ہوگا،

نیاز مند۔ (ڈاکٹر، محمد حمیداللہ پیرس)

نئی کتابیں

(مولوی نسیم ظہیر اصلاحی غازی پوری)

نان نفقہ کا مسئلہ | تحریر مولانا جمیل احمد صاحب نذیری، احیاء العلوم مبارکپور
چھوٹی سائز، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۸، قیمت گیارہ روپیے
پتہ: مکتبہ صداقت مبارک پور، اعظم گڈھ،

مطلقہ عورت کے نان نفقہ کے متعلق سپریم کورٹ کے ایک غیر دانشمندانہ فیصلہ کے سبب مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے اس وقت مسلمانوں کے اندر ایک طرف انتہائی جوش، ولولہ اور پرشور جذبہ دکھائی دے رہا ہے، تو دوسری طرف اخبارات و رسائل کے اندر اس موضوع پر تحریروں کا سیلاب امنڈ آیا ہے، اس فیصلہ کا ایک خوش آیند پہلو یہ ہے کہ اس موضوع کا شاید ہی کوئی جز یا پہلو بچا ہو جس پر مفصل اور متعدد تحریریں سامنے نہ آئی ہوں، مولانا جمیل احمد صاحب نذیری کی زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

نان نفقہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف مضامین اور رسائل میں مختلف انداز سے بحث کی گئی ہے، مولانا نذیری صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انھوں نے وجوب نفقات کی تمام قسموں، پہلوؤں اور صورتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے، اس میں انھوں نے لفظ "متاع" سپریم کورٹ کے فیصلہ اور عارف محمد خاں کی تقریر پر بھی ضروری بحث کی ہے، اور آخر میں اولاد و والدین، نادار اعزہ، غلام، باندی، اور جانوروں کے نفقہ کی بھی تفصیل بیان کی ہے، کتاب کے چند اہم عنوانات یہ ہیں: ادائی نفقہ

کا مسئلہ (۲) بیوی کا نفقہ (۳) نفقہ مطلقہ (۴) عدت کے بعد نفقہ (۵) متاع کی بحث (۶) نفقہ مطلقہ اور شاہ بانو کیس (۷) شکوک و شبہات، اشکالات و اعتراضات (۸) طلاق کے بعد کی دشواریاں اور ان کا حل، وغیرہ،

یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مفید اور کارآمد کوشش ہے، جو بحیثیت مجموعی "بقامت کہتر اور بقیمت بہتر" کے مصداق ہے،

اسلام کا نظام زکوٰۃ | از مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ، چھوٹی سائز صفحات (۴۰)

کاغذ و طباعت وغیرہ متوسط، ناشر جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام ۹۸/۲ ناظر باغ، کانپور،

یہ کتابچہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا ایک حصہ ہے جس کو عام افادہ کی غرض سے کتابی شکل دے دی گئی ہے، اس کے اندر مولانا نے سورۂ توبہ کی آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ کی ایک موثر اور دلنشیں تشریح فرمائی ہے، اور زکوٰۃ کی وجہ فرضیت اس کی حکمت و مصلحت اور اس کے اقتصادی اور اجتماعی فوائد پر بہترین بحث کی ہے، اس کتاب کے آخر میں علامہ ابن قدامہ مقدسی کے ایک مضمون کا ترجمہ بھی "آداب زکوٰۃ" کے عنوان سے شامل ہے، یہ کتابچہ مطالعہ کے لائق ہے،

اسلام اور چھوت چھات | از قاضی عابد علی لہوری، چھوٹی سائز صفحات (۴۸)

کاغذ طباعت وغیرہ غنیمت، ناشر جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام ۹۸/۲ ناظر باغ کانپور،

ہندوستان کا سماج خصوصاً ہندو سماج چھوت چھات کی عجیب و غریب لعنت میں ایک زمانہ سے جکڑا ہوا تھا، اب یہ زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں، اور آہستہ آہستہ لوگ اس لعنت سے نجات حاصل کر رہے ہیں، سیاسی اسباب کے ساتھ اس میں اردو کتابوں کا بہت زیادہ حصہ ہے، جو ہندوستان میں مختلف انجمنوں اور جماعتوں کی طرف سے شایع ہوئی ہیں، جن میں بہت سی کتابوں کا ہندی ترجمہ بھی ہو گیا ہے، زیر نظر کتابچہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، یہ پڑھنے اور دوسرے برادران وطن کو پڑھانے کے لائق ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم میں فتنہ پیدا کرنے کی کوشش

ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر ہمیشہ ممتاز رہا ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے اپنے کو موجودہ سیاست کی سطحیت سے ہمیشہ دور رہ کر اسلاف کے طریقہ پر تعلیم و تعلم کا کام جاری رکھا، اس کی دوسری خصوصیت یہ رہی ہے کہ تعلیم کے ساتھ اس کے اساتذہ اور منتظمین نے تزکیہ کا بھی اہتمام رکھا جس کا اثر نمایاں طور پر طلبہ پر بھی پڑتا تھا، انہوں نے خود جوڑ توڑ اور آپس کی تنافس اور تحاسد سے اپنا سینہ پاک رکھا اور طلبہ کو بھی اسی نہج پر ڈھالنے کی کوششیں کیں، ادھر تقریباً دو سال سے کچھ خارجی اور کچھ مقامی سیاسی اور جاہ طلب قسم کے لوگوں نے اس پاکیزہ ادارہ کو بھی اپنی سازشوں اور وجاہت طلبی کا شکار بنانا شروع کر دیا ہے،

اس وقت جو حضرات حضرت مولانا مظفر حسین صاحب مظاہری کی نظامت میں مدرسہ کو چلا رہے ہیں ہماری اخلاقی ہمدردیاں اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں، جو لوگ مدرسہ کے چندہ اور نظم و انتظام میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی مذمت کریں، اور ان کی باتوں پر قطعی دھیان نہ دیں، اور پہلے سے زیادہ مدرسہ کے ساتھ تعاون کریں، ہم پوچھتے ہیں کہ جو حضرات مدرسہ کی سوا سو برس پرانی پاکیزہ تاریخ کی عظمت کو باقی رکھنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں وہ زیادہ قابل اعتماد ہیں، یا وہ لوگ جو اس کی عظیم تاریخ کو دھندلا ہی نہیں بلکہ ملیامیٹ کرنے کی فکر میں ہیں، وہ قابل اعتماد ہیں؟ ——— صرف اس سوال پر جو لوگ غور کریں گے وہ فتنہ پیدا کرنیوالوں کی ضرور مذمت کریں گے، خواہ وہ صاحبزادہ لوگ ہی کیوں نہ ہوں،،

ضروری انتباہ

"اسلامی فقہ" کا سرقہ

آپ سبھی حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کی مشہور کتاب "اسلامی فقہ" کو مختصر سے ردوبدل کے ساتھ مکتبہ الحسنات دہلی نے اسی نام سے دوسرے مؤلف منہاج الدین مینائی کے نام سے شایع کیا ہے۔ جن کا علمی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، آج تک کوئی پمفلٹ یا کسی رسالہ میں کوئی علمی قسم کا اہم مضمون بھی نظر نہیں آیا، پھر اتنی ضخیم علمی و فقہی کتاب کا ان کے ذریعہ اچانک وجود میں آجانا ایک محال بات ہے، عبدالرحمن الجزیری کی کتاب سے فائدہ اٹھانے کی بات ایک کھلا ہوا فریب ہے، ایک صفحہ میں بھی براہ راست اس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔

مولانا کی کتاب پہلے مکتبہ الحسنات ہی شایع کرتا تھا مگر بعض اسباب کی بنا پر مولانا نے اس سے اپنا معاملہ ختم کر لیا ہے، اور اب وہ مارکیٹ میں موجود نہیں ہے۔ مولانا کتاب پر نظر ثانی کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہے، مکتبہ الحسنات والے اس سے فائدہ اٹھا کر اس کتاب کے مضامین کا سرقہ کر کے کتاب کو اسی نام سے شایع کر کے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے بازار میں لائے ہیں۔

مولانا کی اصل کتاب ترمیم و اضافہ اور نئے مسائل اور دلائل کے ساتھ جلد ہی شایع ہونے والی ہے، جو پہلے سے زیادہ ضخیم، لائق قدر اور قابل اعتماد ہوگی، اس لیے آپ اس مسروقہ کتاب کو نہ خریدیں، ورنہ یہ تعاون علی الاثم ہوگا۔ ان شاء اللہ ہم قانونی چارہ جوئی بھی کریں گے، اس کا مزید افسوس ہے کہ اس میں مکتبہ الحسنات کے موجودہ کارکردہ ملک نعیم کے ساتھ ان کے والد عبدالحی صاحب بھی شریک ہیں۔ اس سے بھی افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس پر محمد فاروق خاں کا دیباچہ ہے۔

شائع کردہ

دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد،

اعظم گڈھ۔ (یو۔ پی)

خطبۂ نکاح نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ قیمت ۲/

اہل دل کی باتیں یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پراثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اسکا بہت سا حصہ ماہنامہ "الفرقان" میں بھی شائع ہوا ہے، اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔ قیمت ۵/۱

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں حدیث سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت ۱۲/

قرآن پاک کی تعلیم اور اس کی عظمت اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے ہم بار بار پڑھیں، سمجھیں اور اپنی زندگی میں اسے اتاریں، مگر نہ صرف عام مسلمان اس سے غفلت برت رہے ہیں بلکہ ہمارے مدارس میں بھی اس کی تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنا کہ اس کا حق ہے اس رسالہ میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے

مسئلہ کفاءت شادی بیاہ میں کن چیزوں کی برابری ہونی چاہیے اس مسئلہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسلمانوں میں برادریوں میں جو مصنوعی تقسیم قائم کی گئی ہے۔ شریعت میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۵/۱

عقیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یوپی

egd. No. AZM [redacted] ,2 / 84
egd. No. R. N. 38937 / 81
Phone :- 2461

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد
ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرات (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جسکے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اہ

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپئے کے قریب ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض ے ہر کلیہ نے انکا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کیساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے بچوں کا داخلہ ۲۸ جون سے شروع ہو جاتا ہے۔

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمہ

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

سالانہ چندہ ہندوستان سے =/25 خصوصی معاون =/۱۰۰ قیمت فی پرچہ 2/50	جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان ماہنامہ جامعۃ الرشاد	سالانہ چندہ غیر ممالک سے بارہ ڈالر امریکی =/12 ٭
جلد ۱۲	اپریل مئی ۱۹۸۶ء مطابق شعبان، رمضان ۱۴۰۶ھ	شمارہ ۵۷، ۵۸

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی	مطبوعہ افضل نعیمی پریس مئو

رشحات

اخبارات کے ذریعہ یہ بات ناظرین کو معلوم ہو چکی ہو گی کہ دستور کی فوجداری دفعہ ۱۲۵ سے مسلمان مطلقہ عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کیلئے جو بل پارلیمنٹ میں پیش تھا وہ فرقہ پرست جماعتوں، کمیونسٹ پارٹی اور کچھ خود ساختہ مسلمان دانشوروں کی مخالفت کے باوجود پاس ہو گیا، جس کیلئے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں اور وہ تمام لوگ جنہوں نے عوامی انداز میں اس کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا تھا وہ مبارکباد کے مستحق ہیں،

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ میں ہندوستان کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کے صاحب اثر حضرات شریک ہیں اور وہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ قابل اعتماد ادارہ ہے اور ہم اسی پر اعتماد کرتے ہیں اس کے باوجود یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام کے ایک ہی سال بعد سنہ ۱۹۷۳ء میں دفعہ ۱۲۵ ر بنی تھی اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ممبران نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا مگر اس کے سلسلہ میں نہ تو عوام کی طرف سے کوئی ردِ عمل ظاہر ہوا تھا۔ اور نہ حکومت نے اس کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی آمادگی ظاہر کی تھی۔ آخر کار کیا وجہ ہے کہ موجودہ حکومت نہ صرف ترمیم بلکہ ایک مستقل ایکٹ لانے کیلئے تیار ہوگی۔ ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ اس مسئلہ پر حکومت غور کرنے کیلئے اس وقت تیار ہوئی، جب یہ مسئلہ

عوام کی عدالت میں پہنچ گیا اور عوام کی عدالت میں پہونچانے میں جہاں مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو دخل ہے اسی طرح اس آواز کو گاؤں گاؤں بلکہ گھر گھر پہنچانے میں دوسرے تیسرے درجہ کے افراد کی جذباتیت اور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کی پرشور کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے، اس لئے اس معمولی کامیابی پر نہ تو آپے سے باہر ہونا چاہئے اور نہ اس انداز کی وزیر اعظم کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہئے کہ گویا ہم کو کوئی نئی چیز مل گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پرسنل لا کے سلسلہ میں پھر اس لئے بھی غیر معمولی خوشی کا اظہار مناسب نہیں ہے، کہ دفعہ ۱۲۵ ار میں ترمیم یا اس کے سلسلہ میں مستقل ایکٹ بن جانے سے بھی مسلم پرسنل لا کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ جب تک کہ اسے ۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ کے مطابق نہ کر دیا جائے اور راہنما اصول کے دفعہ ۴۴ ر میں ترمیم نہ ہو جائے، یا یہ صراحت نہ ہو جائے کہ بنیادی حقوق کے دفعات ۲۰ ر تا ۳۰ ر میں جو حقوق دئے گئے ہیں ان کو دستور کی کوئی دوسری دفعہ متاثر نہیں کر سکتی۔ اور ان دفعات کی تشریح قابل اعتماد علماء اور شرعی مزاج رکھنے والے مسلمان وکلاء ہی کر سکتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے رہنما اس پہلو پر کوئی خاص زور نہیں دے رہے ہیں بلکہ ان کا سارا زور اسی دفعہ ۱۲۵ ر کے گرد گھوم رہا ہے، میں گذارش کروں گا کہ اگر یہ حضرات اس پہلو کو نظر انداز کر گئے تو ایک ایسی غلطی ہوگی جس کی تلافی اس کے بعد شاید ممکن نہ ہو، اور مستقبل کا مؤرخ شاید اس کا اچھے انداز میں ذکر نہ کر سکے۔

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ابھی چل ہی رہا تھا کہ یو پی حکومت کی نادانی کی وجہ سے تاریخی بابری مسجد کے مسئلہ میں بھی عدلیہ نے وہی جانب دارانہ رویہ اختیار کیا جو سپریم کورٹ کے جج نے اختیار کیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے جذبات اور زیادہ مشتعل ہو گئے اور اس سلسلہ میں فوری طور پر مسلمانوں نے اپنی تکلیف اور غم کا پرشور انداز میں اظہار کیا، اس سے حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر شاید اکثریت کا زعم اور راج ہٹ اس سلسلہ میں دو ٹوک فیصلہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ورنہ تاریخی ریکارڈ صاف بتلا رہا ہے کہ رام جنم بھومی کا چبوترہ الگ ہے بلکہ رام جنم بھومی کی تاریخی حیثیت بھی مشتبہ ہے

۴۴ جو حق تلفی ہوئی تھی اس کا ایک حصہ واپس ہوا ہے جیسا کہ اس سے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بارے میں ہو چکا ہے

اور بابری مسجد کی تاریخی حیثیت کو کوئی چیلنج نہیں کرسکا ہے

معلوم ہوا ہے کہ اس مسئلہ کے حل کرنے میں مرکزی حکومت بھی دخل دے رہی ہے مگر یہ بات بھی علم میں آئی ہے کہ وہ اسے محکمہ آثار قدیمہ کے حوالہ کرنا چاہ رہی ہے، اور مسلمانوں کے کچھ ذمہ دار حضرات بھی اس کا مشورہ دے رہے ہیں اگر ایسا ہوا تو شاید مسلمان اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوں۔ اس لئے کہ اگر یہ دروازہ کھل گیا تو فرقہ پرست عناصر کی طرف سے نہ جانے کتنی تاریخی مسجدوں میں اسی طرح کی مداخلت ہوگی اور پھر وہ محکمہ آثار قدیمہ کو دی جاتی رہے گی، یہ ایک ایسی شدید غلطی ہوگی، جس کے نتائج مستقبل میں انتہائی خطرناک ہوسکتے ہیں راقم الحروف کے خیال میں یہ مسئلہ بھی ہمارے راہ نما اپنی رہنمائی میں عوام کی عدالت میں طے کرانے کی کوشش کریں۔ اس وقت بابری مسجد کی تاریخ دہرانے سے زیادہ ضروری قربانی کی تاریخ دہرانے کی ہے، ہم ۳۵ برس سے بابری مسجد کی تاریخ دہرا رہے ہیں مگر نہ حکومت اس حقیقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے اور نہ عدلیہ اس لئے اب مسلمانوں کو تاریخ خواں بننے کے بجائے تاریخ ساز بننا چاہیئے۔

مسلم پرسنل لا اور بابری مسجد کے سلسلہ میں مسلمانوں نے غیرت ایمانی اور حمیت ملی کے ساتھ جس اتحاد کا ثبوت دیا ہے، وہ ہمارے لئے نیک فال ہے مگر افسوس ہے کہ اس اتحاد میں بعض وجاہت طلب اور اقتدار پسند اور سیاسی لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کیلئے اس میں رخنہ اندازی شروع کر دی ہے، ہم کو ایسے مفاد پرست لوگوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ بسا اوقات بعض افراد ملی مسائل میں جوش و خروش دکھا کر اپنی اغراض پوری کر لیتے ہیں اور ملت کے مسائل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جیسا کہ ہم ۳۸ برس سے اس کا تجربہ کر رہے ہیں، اسی کے ساتھ ہمیں اس پہلو پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے جو نمائندے پارلیمنٹ اور اسمبلی میں موجود ہیں اور انھوں نے اس بارہ مہینے کی ملی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے بلکہ اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں یا گونگے بہرے بنے رہے ہیں، وہ لوگ دوبارہ اپنے مسلمان ہونے کا سیاسی فائدہ نہ اٹھا سکیں اگر ہم نے

ایک بار ایسے بے غیرت اور بے حمیت لوگوں کو سبق دے دیا تو پھر ہمارے ملی مسائل سے منہ موڑ کر ہماری نمائندگی کی جرأت ان کو یا ان جیسے دوسروں کو نہ ہو سکے گی، راقم الحروف نے اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء کے پرچہ میں مسلمانوں کے اتحاد میں رخنہ اندازی کے سلسلہ میں جن چار اسباب کا ذکر کیا تھا اس میں لکھا تھا کہ اس کا تیسرا آزدہ سیاسی افراد ہیں جو یا تو کسی پارٹی کی تنظیم میں ہیں یا پھر وہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر ہیں ان میں سے چند گنے چنے افراد کو چھوڑ کر وہ مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں یا تو گونگے بہرے بن جاتے ہیں یا پھر اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں وہ مسلم معاشرہ کیلئے اتنی بڑی مصیبت ہیں کہ ان سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ مسلم عوام میں زیادہ سے زیادہ سیاسی شعور پیدا ہو جائے اور ان کا ضمیر اپنے مسائل کے بارے میں اتنا بیدار ہو جائے کہ ان کو یہ خطرہ ہو کہ اگر انھوں نے ملی مسائل میں دلچسپی نہ لی یا خاموشی اختیار کی تو اسلامی معاشرہ ان کو چھانٹ پھینکے گا ان میں کتنے ہیں جو مسلمانوں کے مفاد کی آواز اٹھا کر یا تحریک چلا کر ان کے ووٹ سے ممبر بن جاتے ہیں مگر جب اسمبلی یا پارلیمنٹ کی جنت الفردوس میں پہونچ جاتے ہیں تو وہ صرف اپنے مفاد کے بندے ہو کر رہ جاتے ہیں اس کی تازہ مثال عارف محمد خان ہیں ان کے پیش رو اور موجودہ ممبران پارلیمنٹ اور اسمبلی ہیں چونکہ حکومت کا ذہن خود صاف نہیں ہے اس لئے وہ ان افراد کو اقتدار کی دو چار ہڈیاں پھینک دیتی ہے یا ان کو اس کی امید ہوتی ہے، اور وہ اس کی لذت میں اتنا بے خود اور سرمست ہو جاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں نہ خدا کا خوف رہ جاتا ہے اور نہ معاشرہ کی رسوائی کا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ مسلمانوں کی جس تحریک میں علماء کی شرکت نہیں ہوتی، تو ان میں جان نہیں آتی، اس لئے اس سلسلہ میں علماء کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہئے، ہندوستان میں مسلمانوں کے تین شعار ہیں (۱) مسجد (۲) مدرسہ (۳) اور مسلم پرسنل لاء اور ان تینوں کا تعلق براہ راست علماء سے ہے اگر انھوں نے مدرسوں کی چار دیواروں سے نکل کر ان کے تحفظ کی کوشش نہ کی تو نہ مسلم پرسنل لاء محفوظ

رہے گا اور نہ مسجد، اور مدرسے محفوظ رہیں گے، اور نہ مسجدوں کی، امامت اور نہ مدرسوں کی مسندیں سلامت رہیں گے اگر انھوں نے کسی روایتی خانقاہوں کے مجاور کی حیثیت اختیار کرلی تو ممکن ہے کہ ان کی مسندیں عوام ان سے چھین لیں اگر خدانہ خواستہ ایسا ہوا تو یہ ملت کے لئے بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔

بعض علماء اور بعض جماعتوں کے افراد یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ یہ سب باتیں جو پیش آرہی ہیں وہ سب ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں پیش آرہی ہیں اس لئے سب سے پہلے مسلمانوں کی بدعملی اور بے عملی دور کرنے کی ضرورت ہے اس کے بغیر مسلم پرسنل لاء، بابری مسجد اور دوسرے ملی مسائل کے سلسلہ میں جو کوشش کی جائے گی وہ سب بے کار ہے، ہمکو ان حالات میں دعا اور مسلمانوں کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔

ہم کو یہ تسلیم ہے کہ ہماری بداعمالی کے نتیجہ میں اللہ تعالی بہت سی آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور امت کے افراد کو اپنے اعمال کے اصلاح کی فکر ضرور کرنی چاہیئے اور اس کے لئے جہد وجہد بھی مگر میں ان حضرات سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کے گھر میں آگ لگ جائے یا ڈاکہ پڑ جائے تو کیا آپ اس خیال سے اس کو بجھانے اور ڈاکو کو بھگانے کی کوشش نہیں کریں گے کہ یہ حادثہ ہماری اسی بدعملی یا غلط روی کے نتیجہ میں پیش آیا ہے، اسی طرح راستہ غلط چلنے کیوجہ سے اگر سڑک پر کوئی شخص کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو کیا ہم اسلئے اسکو سڑک پر تڑپتا ہوا چھوڑ دیں گے کہ وہ شخص غلط کار تھا اور صحیح رخ پر نہیں چل رہا تھا، کیا اس طرح کے حادثہ کے وقت ہمکو آگ بجھانے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے اور حادثہ کے شکار شخص کو اسپتال پہنچانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے اور کیا اس وقت مسجد میں بیٹھکر دعا کرنے کی ترغیب شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہوگی؟ دراصل ایسی باتیں پوری ملت کو اپاہج بنانے کیلئے شیطان کی یہ ایک چال ہے جسمیں اس نے ان حضرات کو مبتلا کر رکھا ہے، اپنی ذاتی زندگی میں یہ حضرات تدبیر اختیار کئے بغیر ایک قدم نہیں چلتے مگر ملت کے

معاملات میں اصلاح اور دعا کی بات کرتے ہیں ملت اسوقت ایک عظیم حادثہ کا شکار ہے ، ہمارا فرض ہے کہ اسوقت اس حادثہ کا شکار ملت کو اسکے برے اثرات سے بچائیں اور اس کے زخمو نکے اندمال کی کوشش کریں، پھر اس کوشش کیساتھ ان کو آگاہ بھی کرتے رہیں کہ آئندہ تمہیں ان غلطیوں سے بچتے رہنا چاہیئے جس سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو آزمائشوں میں ڈالتا ہے دعوت کا حکیمانہ طریقہ یہی ہے کہ آدمی پہلے مدعو کے مسائل سے دلچسپی لے پھر دعوت دے اگر کوئی داعی ایسا نہیں کرتا ہو تو وہ دین کے فہم سے محروم ہے شرعی احکام کے نفاذ میں حکمت اور موقع ومحل کو سمجھے بغیر جو دعوت و تبلیغ کی رٹ لگا رہے ہیں وہ ایک فتنے میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور وہ دانستہ یا نادانستہ دشمنوں کا ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں وہ اثر تھا کہ پانی کی روانی رک جاتی ، ہوا کا رخ بدل جاتا اور پہاڑوں کے جگر شق ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ آزمائشوں کی بھٹی سے گزارتا ہے پھر ان سے دعا کراتا ہے غزوۂ بدر میں آپ نے ۱۳۔۱۴ سال کی پوری کمائی میدان بدر میں خدا کے حضور پیش کر دیا پھر آپ سجدے میں گر کر دعا میں مشغول ہو گئے اور خدا کے حضور اس انداز سے دعا کی ۔

اللھم ان تہلک ھذہ العصابۃ	" اے اللہ اگر یہ جماعت آج ہلاک ہو گئی تو پھر اس سرزمین پر
لن تعبد ابدا	تیری پرستش کبھی نہیں ہو گی "

اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیجدی اور فتح و نصرت کے دروازے کھول دیئے صحابہ کرام میدان کارزار میں فانصرنا علی القوم الکافرین کا آوازہ بلند کرتے تھے اور ہم اپنے نرم بستروں اور مسجدوں کے گوشوں میں فانصرنا علی القوم الکافرین پڑھنے کی ترغیب دے رہے ہیں علامہ اقبال نے کہا تھا ع ۔

پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں انہیں

جزیرۂ عرب میں یہود کی تاریخ

مجیب اللہ ندوی

(۲)

یہود کے مرکزی مقامات اور ان کے مشہور قبائل یوں تو جزیرۂ عرب کے ہر حصہ میں یہودیوں کی آبادیاں موجود تھیں، لیکن خصوصیت سے شمالی عرب کے تمام مرکزی مقامات پر یہودی قبائل آباد تھے، اور ان میں اکثریت ان یہودیوں کے تھی جو باہر سے ہجرت کر کے آئے تھے، ان قبائل کے نام، ان کی آمد اور مقام ہجرت کے سلسلہ میں جو معلومات مل سکی ہیں وہ درجہ ذیل ہیں۔

یثرب ظہور اسلام کے وقت جزیرۂ عرب کے یہود کی سب سے بڑی آبادی یثرب اور خیبر میں تھی،[1] اس لئے سب سے پہلے ان ہی مقامات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، یثرب کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں صاحب معجم البلدان نے لکھا ہے کہ یہ یثرب بن قانیہ کا آباد کیا ہوا ہے، اسلئے اس کا نام یثرب پڑ گیا، یثرب بن قانیہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کی ساتویں پشت میں تھا، اگر یہ بیان صحیح ہے تو یہ بہت قدیم آبادی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بھی یہی نام رائج تھا، مگر آپ نے

---

[1] بعثت نبوی سے ایک سو سال پہلے یہودیت کا سب سے بڑا مرکز یمن تھا، لیکن حمیری حکومت کی شکست اور ذو نواس کے قتل کے بعد یمن میں یہودیت کی جگہ نصرانیت نے لے لی تھی، تفصیل آگے آئے گی۔

اس کا نام طابہ اور طیبہ رکھا، پھر آپ کی ہجرت کے بعد وہ مدینۃ النبی کے نام سے پکارا جانے لگا اور آخر میں یہی نام مخفف ہو کر زبان زد خاص و عام ہو گیا،

مدینہ میں جو یہودی قبیلے آباد تھے ان کی تفصیل یہ ہے۔

بنو قریظہ | یہ نہایت قدیم قبیلہ تھا، جو اپنے وطن شام کو چھوڑ کر یہاں آیا، اور وادی مہزور کے قریب جو مدینہ کے مشرق میں واقع ہے، آباد ہو گیا[1]، یہ وادی بعد میں انہی کے نام سے مشہور ہو گئی، اور رفتہ رفتہ ان کی ملک میں آگئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے جن قبائل سے معاہدہ کیا تھا ان میں بنو قریظہ کا قبیلہ بھی تھا، معاہدہ کی رو سے مسلمان اور یہود ایک دوسرے کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے سنہ ۵ھ میں انہوں نے معاہدہ شکنی کی، اس سے پہلے بھی غزوۂ احزاب وغیرہ میں یہ مسلمانوں کے خلاف سازش کر چکے تھے، اسلئے ان کو اس جرم کی سزا بھگتنی پڑی، حضرت ثعلبہ، حضرت زید بن سعنہ رضی، حضرت سعیہ رضی، حضرت عطیہ رضی، حضرت ریحانہ وغیرہ اہل کتاب صحابہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

بنو نضیر | اس خاندان نے بھی بنو قریظہ کے ساتھ ہی اپنا آبائی وطن چھوڑا اور مدینہ کے جنوب مشرق میں وادی بطحان کے پاس آکر آباد ہوا، یہ مدینہ کی سب سے بڑی وادی تھی، یاقوت نے بطحان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بنو نضیر اسی وادی کے قریب آباد ہوئے، لیکن ایک جگہ ایک مقام بویرہ کو ان کی طرف منسوب کیا ہے، اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

هو موضع منازل بنی نضیر — بنو نضیر کی آبادی اسی جگہ پر ہے

بویرہ ایک کنوئیں کا نام ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ کنواں وادی بطحان کے قریب

---

[1] معجم البلدان ج ۸ ص ۲۱۲

ہی رہا ہو۔ اس بنا پر دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ سے بھی معاہدہ کیا تھا، لیکن انہوں نے بھی معاہدہ شکنی کی اور اس کی پاداش میں ۳ھ میں جلاوطن کئے گئے، حضرت مخیریقؓ، حضرت یامینؓ، حضرت ابوسعدؓ وغیرہ اسی قبیلہ سے تھے۔

بنو قینقاع | اس قبیلہ سے متعلق یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ باہر سے ہجرت کر کے آیا تھا یا یہیں کا کوئی عرب قبیلہ تھا، جس نے یہودیت قبول کر لی تھی، اس قبیلہ کے لوگ عام طور پر صناع اور زراعت پیشہ تھے، خصوصیت سے آہنگری اور زرگری ان کا خاص پیشہ تھا، خود ان کا نام بھی ان کے پیشوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے، قین عربی میں لوہار کو کہتے ہیں، اور قاع اس ہموار اور نرم زمین کو کہتے ہیں، جس میں کھیتی کی جا سکے، جن سے ان کی دونوں خصوصیتیں معلوم ہوتی ہیں، مدینہ کے دوسرے یہودی قبائل کے مقابلہ میں یہ زیادہ مضبوط اور طاقتور تھے، سب سے پہلے اسی قبیلہ نے معاہدہ شکنی کی، اور اس کے نتیجہ میں جلاوطن کئے گئے، مدینہ سے نکل کر اذرعات میں جو شام کا ایک ضلع ہے، چلے گئے۔

بنو ہدل | یہ قبیلہ بھی بنو قریظہ کے ساتھ اپنے وطن سے ہجرت کر کے مدینہ آیا تھا، اور ان ہی کے ساتھ وادی مہزور میں آباد ہو گیا تھا[۲]، یہ قبیلہ اپنی کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ ہر معاملہ میں بنو قریظہ ہی کا شریک تھا، بعض کتابوں میں اس کا نام بنو بہدل لکھا ہوا ہے، سمہودی نے لکھا ہے کہ ان کو بنو ہدل اس لئے کہتے تھے کہ عام طور پر ان کے ہونٹ موٹے اور لٹکے ہوئے ہوتے تھے، عربی میں ایسے آدمی کو ہدل کہتے ہیں[۳]، حضرت ثعلبہؓ، حضرت اسد بن کعبؓ، اور حضرت عبداللہؓ بن سلام اسی قبیلہ سے تھے۔

---

[۱] معجم البلدان ج ۲ ص ۲۲۶ [۲] ایضاً ج ۸ ص ۲۹۶ [۳] وفاء الوفاء ۱ ر ۱۴

زنباع | یہ قبیلہ بھی بنو قریظہ ہی کی ایک شاخ اور اس کے ماتحت تھا، بنو قریظہ سے اس کے تعلق کی بنا پر یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ بھی ہجرت کرکے آیا تھا، مگر اس کی جائے قیام کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، حضرت رافعؓ کا نسبی تعلق اسی قبیلہ سے تھا،

دوسرے یہودی قبائل | مذکورہ قبائل کے علاوہ مدینہ منورہ میں اور بھی متعدد یہودی قبائل تھے جن کو خود کوئی ممتاز حیثیت حاصل نہیں تھی، بلکہ وہ ہر معاملہ میں ان ہی یہودی قبائل کے پابند تھے مثلاً بنو عریض جبل احد کے قریب آباد تھے، بنو ظفر وادی مہزور کے آخری سرے پر آباد تھے بنو اشہل اور بنو حارثہ مدینہ کے بالکل مشرق میں آباد تھے، ان کے علاوہ چند اور قبائل کے نام اس معاہدہ میں آئے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے کیا تھا،

(۱) یہود بنی عوف (۲) یہود بنی بخار (۳) یہود بنی ساعدہ (۴) یہود بنی عوف، (۵) یہود بنی الاوس (۶) یہود بنی ثعلبہ (۷) بنو جفنہ (۸) بنو الشطیبہ (۹) بنو حارث،

اس معاہدہ میں ان قبائل کے ذکر کے بعد یہ دفعہ بھی ہے کہ

وان بطانة يهود. كانفسهم | اور یہودیوں (کے قبائل) ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو حاصل ہیں،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے اور بھی دوسرے قبائل تھے، چنانچہ اس کی تائید سمہودی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ مدینہ کے یہودی قبائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان يهود كانوا نيفا وعشرين قبيلة[1] | مدینہ میں یہودی قبائل ۲۰ سے زیادہ تھے،

ان ذیلی قبائل میں بیشتر ایسے تھے جن کا نسبی تعلق اوس و خزرج سے تھا، مگر انہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی، اس لئے وہ یہودی قبائل میں شمار ہوتے تھے، مثلاً

---

[1] وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۱۶

بنو اشہل، بنو حارثہ، بنو عوف وغیرہ قبیلہ اوس کی شاخیں تھیں، اسی طرح بنو نجار، بنو حارث، بنو ساعدہ وغیرہ خزرج کے تحتی قبائل تھے،

خیبر | شمالی حجاز میں یہود کا دوسرا بڑا مرکز خیبر تھا، جو شام کے راستہ میں مدینہ منورہ سے تقریباً آٹھ منزل پر واقع ہے، یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہاں کی یہودی آبادی کہیں سے ہجرت کر کے آئی تھی یا یہیں کی خود عرب آبادی نے یہودیت قبول کر لی تھی، بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قدیم آبادی ہے، معجم البلدان نے خیبر کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہ بستی خیبر بن قانیہ کی طرف منسوب ہے، اس لحاظ سے ان کے اور انصار کے جداعلیٰ ایک ہی ہیں، انصار کے جداعلیٰ یثرب بن قانیہ کا ذکر اوپر آچکا ہے،

اس بیان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہاں یہودیت کو فروغ کب سے ہوا، اس سلسلہ میں عاجز کی رائے یہ ہے کہ خیبر عبرانی لفظ ہے، جس کے معنیٰ قلعہ کے ہیں، یہ لفظ خود اشارہ کر رہا ہے کہ اس بستی کو یہود سے بڑا قدیم تعلق ہے، اور پھر اس سرزمین کو قلعوں کی سرزمین کہا جائے تو صحیح ہے، اس لئے کہ یہاں بہت سے قلعے تھے جنکی یادگار آجتک باقی ہے۔

خیبر حجاز کا بڑا زرخیز علاقہ ہے، جس کو تجارتی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی یہاں کے یہود اقتصادی حیثیت سے بہت ممتاز تھے، انہوں نے متعدد جنگی قلعے بنا رکھے تھے جن میں سے سات قلعے بہت مشہور تھے، ناعم، قموص، حصن الشق، حصن النطاۃ، حصن السالم حصن الوطیح، حصن الکتیبۃ[۱]، یعقوبی کا بیان ہے کہ اس میں بیس ہزار سپاہی رہتے تھے[۲]، یعقوبی کے اس بیان سے خیبر کی وسعت اور اسکی آبادی کی کثرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسرے یہود کی طرح اسلام کے خلاف ان کی ریشہ دوانیاں جب بہت بڑھ گئیں تو سنہ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جارحانہ کارروائی کر کے ان کو شکست

---

[۱] ان کی تفصیل معجم البلدان وغیرہ میں ملتی ہے۔ [۲] یعقوبی جلد ۲ ص ۵۶

ی پوری تفصیل آگے آئے گی، حضرت صفیہؓ کا وطن خیبر ہی تھا،

فدک | خیبر اور مدینہ کے درمیان فدک کی بستی تھی، یہاں بھی یہودیوں کی آبادی تھی اور دوسرے مقامات کی طرح یہاں کے یہود بھی نہایت ہی خوش حال تھے، یہ بستی بھی پرانی ہے، مگر یہاں یہود کب آباد ہوئے، اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے آس پاس کے جن قبائل سے صلح کی تھی ان میں اہل فدک بھی تھے، تاریخوں میں اس کا تذکرہ اسی حیثیت سے آتا ہے۔

وادی القریٰ | شام اور مدینہ کے درمیان ایک وادی ہے، جس میں بہت سی بستیاں آباد تھیں، اس کو "وادی القریٰ" (بستیوں کی وادی) کہتے ہیں، یہ نہایت ہی قدیم آبادی ہے، قدیم زمانہ میں یہاں عاد و ثمود آباد تھے، یہ بستیاں اپنی سرسبزی و شادابی کے لحاظ سے ہمیشہ سے ضرب المثل تھیں، قرآن مجید کی ان آیات میں انہی بستیوں کی طرف اشارہ ہے۔

اتترکون فیما ھٰھنا اٰمنین	کیا تم کو ان ہی چیزوں میں بے فکری سے
فی جنت وعیون وزروع	رہنے دیا جائیگا جو یہاں موجود ہیں یعنی باغوں،
ونخل طلعھا ھضیم	چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں۔
(شعراء)	جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہیں،

ارباب تاریخ وجغرافیہ لکھتے ہیں کہ عاد و ثمود کی تباہی کے بعد یہاں یہود آباد ہوئے، انھوں نے دوبارہ یہاں کی زراعت اور آب رسانی کو ترقی دی، یہود کے بعد دوسرے عربی قبائل بھی یہاں آباد ہوئے، مگر وہ سب کے سب یہود کے زیر اثر رہے، قضاعہ، جہینہ اور عذرہ، وغیرہ قبائل اسی وادی میں آباد تھے[1] اس تفصیل سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ یہاں کے یہود جزیرۂ عرب میں ہجرت کر کے آئے تھے، اور بہت قدیم زمانہ سے یہاں آباد تھے،

---

[1] معجم البلدان ج ۸، ص ۳۴۸، یہود اور مسلمان میں جتنی جنگیں ہوئیں ان سب میں یہ قبائل یہود کیساتھ ساتھ نظر آتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر اور فدک سے واپس ہوئے تو یہاں کے باشندوں سے بھی خیبر کے شرائط صلح کے تحت صلح کر لی ،

عہد اسلام کے بعد بھی کئی صدیوں تک یہاں یہودیوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے ، تاریخ الیہود کے مصنف کا بیان ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی تک یہاں یہود موجود تھے (ص ۱۸۶) یاقوت نے اپنے زمانہ یعنی ساتویں صدی ہجری میں ان کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے ، اس وقت یہ سرزمین بالکل ویران ہے ، کنوؤں اور چشموں کا پانی ابتک ویسے ہی جاری ہے ، مگر اس سے فائدہ اٹھانے والا کوئی موجود نہیں ہے[1]۔

ان دونوں بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ پانچویں اور ساتویں صدی ہجری مطابق گیارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے درمیان یہود نے اس سرزمین کو چھوڑا ہے ، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کے ترکِ وطن کے اسباب کیا تھے . اور وہ یہاں سے کہاں گئے ،

بلاذری کی ایک روایت ہے کہ " حضرت عمرؓ نے خیبر کے یہودیوں کے ساتھ وادی القریٰ کے یہودیوں کو بھی جلا وطن کر دیا تھا ، لیکن یہ بیان محل نظر ہے ، دوسرے یہ روایتؓ قیل کے لفظ سے مروی ہے ، جو اس کے ضعف پر دال ہے . اس کے علاوہ کچھ اور بھی دلائل ہیں جس کی بنا پر بلاذری کی یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی ، واللہ اعلم ،

تیماء وادی القریٰ سے قریب ہی تیماء کی بستی تھی ، فدک اور وادی القریٰ کی طرح تیماء بھی مدینہ اور شام کے راستہ پر واقع تھا ، یہاں بھی یہود کی آبادی تھی ، ظہور اسلام سے پہلے یہاں بنو عادیا کا خاندان حکمراں تھا ، اس خاندان کا ایک ممتاز فرد سموئل بن عادیا تھا ، جو اپنی شاعری اور وفا شعاری میں ضرب المثل تھا . حضرت رفاعہؓ جن کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے ، اسی کے لڑکے تھے یہ حضرت صفیہؓ کے ماموں ہوتے تھے ۔

---

[1] معجم البلدان ج ۷، ص ۳

۱- معجم البلدان ج ۶، ص ۳ ، ۲- فتوح البلدان ص ۴۱ ، ۳- کتاب الشعر والشعراء ص ...

بلاذری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وادی القریٰ سے واپس ہوئے تو اہل تیماء نے صلح کی درخواست کی اور آپ نے قبول کر لی[1] مگر یہ بیان بھی قابل غور ہے تفصیل آگے آئے گی۔

نجران | بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ نجران میں بھی قدیم زمانہ سے یہود آباد تھے، لیکن یمن کی یہودی سلطنت کے زوال کا اثر نجران کے یہودیوں پر بھی پڑا، اور آہستہ آہستہ ان کی آبادی وہاں سے ختم ہو گئی، اور ان کی جگہ نصرانیوں نے لے لی،

ظہور اسلام سے پہلے نجران میں یہود کی موجودگی کے واقعات کے سلسلہ میں یہ واقعہ ارباب تاریخ اور مفسرین عام طور پر لکھتے ہیں کہ "عیسائیوں نے نجران کے کسی یہودی کے دو لڑکوں کو کسی وجہ سے قتل کر دیا، یہودی نے یمن کے یہودی حکمران ذو نواس سے دادرسی کی، اس نے نجران پر حملہ کیا[2]، اور وہاں کی عیسائی آبادی کا قتل عام کیا، جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے[3]،

قتل اصحاب الاخدود النار	خندق والے یعنی بہت سے ایندھن کی آگ
ذات الوقود (بروج)	رکھنے والے ملعون ہوئے،

یہ واقعہ ظہور اسلام سے ایک صدی پہلے کا ہے۔ اس کے بعد ہی یمن کی یہودی سلطنت ذو نواس کے بعد ختم ہو گئی، اور پھر یہودیوں کو جزیرۂ عرب میں سیاسی غلبہ نہیں ہوا، اس زوال کا اثر یہودیوں کی تمام آبادیوں پر پڑا، ظہور اسلام کے وقت نجران میں عیسائیوں کے ساتھ یہود بھی آباد تھے، مگر تاریخ کی عام کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا، البتہ ابو داؤد کی ایک روایت

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۴ [2] اس حملہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا رجحان اور ان کا تعاون دینی رشتہ کی بنا پر حبشہ کے عیسائی حکومت کیساتھ زیادہ تھا اور یمن کے یہودی حکمرانوں اور حبشہ کے عیسائی حکمرانوں میں برسوں سے سیاسی کشمکش چلی آرہی تھی اس کشمکش کی موجودگی میں اہل نجران کی (باقی ص پر)

سے ان کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ "نجران میں یہود کی آبادی تھی، جو حضرت عمرؓ کے زمانہ تک باقی رہے، اور آپ ہی کے زمانہ میں بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر جلاوطن کر دئیے گئے" [۱]

آیندہ اوراق میں "جزیرۂ عرب میں عیسائیت" کے عنوان کے تحت اس کی پوری تفصیل آئے گی۔

اذرح اور جربار | جزیرۂ عرب کی سرحد پر یہ بستیاں پاس ہی پاس تھیں، جن میں یہود آباد تھے، اور ان ہی کا غلبہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہوئے تو یہاں کے باشندوں نے صلح کی درخواست کی۔ اہل اذرح نے سو دینار سالانہ اور اہل جربار نے جزیہ کے طور پر کچھ متعین رقم دینے کی خواہش کی، اس پر آپ نے ان سے صلح کر لی [۲]

مقنا | یہ بستی خلیج عقبہ (ایلہ) کے کنارے آباد تھی، اس کی حیثیت ایک بندرگاہ کی تھی، یاقوت اور بلاذری دونوں نے لکھا ہے کہ یہاں کے باشندے یہودی تھے، مگر کسی نے نہیں لکھا ہے کہ وہ یہاں کب آباد ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ شکار ماہی، کتائی اور زراعت ان کا خاص پیشہ تھا [۳]،

اہل مقنا کے معاہدہ کے سلسلہ میں کچھ قابل غور باتیں ہیں جسکا تذکرہ آگے آئیگا،

(بقیہ حاشیہ ص) یہ روش یہودیوں کیلئے سیاسی حیثیت سے خلش کا سبب بنی ہوئی تھی، حبشہ پر براہ راست حملہ کرنا ان۔ بس سے باہر تھا، اسلئے انہوں نے نجران ہی کو اپنی دشمنی کا نشانہ بنایا ممکن ہے یہودی بچوں کے قتل ہی کو یہودیوں نے نجران پر حملہ کرنیکا ایک سیاسی اور قانونی بہانہ بنایا ہو جسطرح یمن کے عیسائیوں نے کعبہ پر حملہ کیلئے ایک معمولی بہانہ نکال لیا تھا،

[۳] اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں تفسیروں میں متعدد واقعات مذکور ہیں، ممکن ہے کہ ایک ہی واقعہ نے متعدد پر مختلف شکلیں اختیار کر لی ہوں، جیسا کہ عام طور پر اس قسم کے واقعات میں ہوتا ہے،

حاشیہ صفحہ ہذا / [۱] ابوداؤد ج ۲ باب اخراج الیہود، [۲] فتوح البلدان ۶۶ [۳] ایضاً ص ۴۱

بحرین بحرین فارس اور جزیرۂ عرب کی سرحد پر واقع ہے، جو فارس کے ماتحت تھا یہاں کے باشندے نہ خالص عربی تھے اور نہ عجمی، بلکہ یہ مقام مختلف اور متضاد مذہب اور تہذیب وتمدن رکھنے والی قوموں کا سنگم تھا، عرب وعجم، یہود ونصاریٰ اور مجوس وآتش پرست سبھی یہاں موجود تھے، عربوں کو جن مقامات پر دوسری قوموں سے ملنے اور قریب سے ان کی تہذیب وثقافت سے واقف ہونے کا موقع ملا، ان میں ایک بحرین بھی ہے، فتوح البلدان میں ہے کہ،

اھل الارض من المجوس	اہل بحرین کی آبادی مجوس، یہود اور
والیھود والنصاریٰ (ص ۸۶)	نصاریٰ پر مشتمل تھی،

عرب کے مشہور قبائل عبدالقیس، بکرین وائل، بنیتم وغیرہ یہیں آباد تھے۔

افسوس ہے کہ بحرین کی قدیم تاریخ پردۂ خفا میں ہے، ظہور اسلام کے وقت منذر بن ساوی وہاں کا حکمراں تھا، غالباً یہ عرب تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں قریب کے ملوک وسلاطین کو دعوتی خطوط لکھے تو ایک خط منذر والی بحرین کو بھی لکھا، اور حضرت علاؓ ابن عبداللہ کے ہاتھ روانہ فرمایا، منذر پر اس خط کا بہت اچھا اثر پڑا، اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوگیا اس کے ساتھ اہل بحرین کی ایک بڑی تعداد بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر کو اس عہدہ پر جوں کا توں باقی رکھا[1]،

۸ھ میں منذر نے تحریری طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہاں کے یہود کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، آپ نے جواب میں لکھا کہ جو لوگ تبلیغ اسلام کے بعد بھی اسلام قبول نہ کریں، ان سے فی کس ایک دینار سالانہ جزیہ لیا جائے[2]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سعادت کے بعد یہاں کے باشندے عام طور پر مرتد ہونے لگے، تو حضرت بشر بن جارودؓ جن کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے، انھوں نے اہل بحرین کو ارتداد سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی[3]

---

[1] فتوح البلدان ص ۸۶ [2] ایضاً ص ۹۱ اور سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ ص ۳۵۰۔

مکہ وطائف مکہ و طائف میں خالص عرب مشرکین کی آبادی تھی، مگر مکہ کی قدیم تاریخوں میں عربوں اور خصوصیت سے قریش اور یہود میں تجارتی و تمدنی تعلقات کے بیان کے سلسلہ میں یہود کا ذکر بھی آتا ہے۔ جس سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا مکہ و طائف میں بھی عرب مشرکین کے ساتھ یہود آباد تھے یا نہیں۔ بعض مستشرقین نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام سے پہلے مکہ میں عربوں کے ساتھ یہود آباد تھے[1] مگر عربی تاریخوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اسلئے اس کی صحت میں ہم کو تامل ہے۔

اس سلسلہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مکہ میں یہود موجود ہوتے تو قریش کا وفد مکہ کے یہودیوں کو چھوڑ کر مدینہ کے یہود کے پاس کیوں جاتا۔ جیسا کہ ابن ہشام اور دوسرے ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط وغیرہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کرنے کے لئے مدینہ بھیجا تھا۔ چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اصحاب کہف، روح اور ذوالقرنین کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئیں ان کا سبب نزول یہی واقعہ ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اہل مکہ اور یہود میں گوناگوں تعلقات تھے، مکہ کے عکاظ اور مجنہ کے بازاروں میں یہودی تاجر اور کاہن شریک ہوتے تھے، جہاں کہانت کی شعبدہ بازیاں زیادہ تر ان ہی کے دم سے قائم تھیں، مکہ میں بعض یہودی غلاموں کا تذکرہ بھی ملتا ہے، پھر مکہ کے قریب ہی بنو کنانہ آباد تھے، جن میں یہودیت موجود تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی وجوہ کی بنا پر یہ خیال قائم کر لیا گیا کہ یہاں یہود موجود تھے، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

---

[1] تاریخ الیہود ص ۹۴۔

البتہ طائف کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں قدیم زمانہ سے یہودیوں کی ایک نو آبادی موجود تھی، فتوح البلدان میں ہے،

كان بمخلاف الطائف قوم من	طائف کے ایک حصہ میں یہودیوں کی
اليهود طردمن اليمن ويثرب	آبادی تھی جو یمن و یثرب سے نکالدیئے
فاقامها بهاللتجارة (ص ۶۳)	گئے تھے اور بسلسلۂ تجارت یہاں آکر آباد ہو گئے تھے،

جب طائف پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو وہاں کے یہودیوں پر جزیہ لگایا گیا، بلاذری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہاں کے بعض یہودیوں کی جائداد خریدی تھی [۱]، اس سے زیادہ یہاں کے یہودیوں کے وجود کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا،

تبالہ و جرش | تبالہ و جرش طائف کے جنوب میں واقع ہیں، تاریخوں میں ہے کہ ان بستیوں میں بھی عربوں کے ساتھ اہل کتاب آباد تھے، یہ بصراحت معلوم نہیں ہو سکا کہ اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں یا صرف یہود، لیکن ہمارا قیاس ہے کہ دونوں مراد ہیں، اور دونوں آباد ہوں گے، اس لئے کہ اکثر مرکزی مقامات میں دونوں کے آباد ہونے کا پتہ چلتا ہے، جیسا کہ مقنا اور بحرین کے سلسلہ میں ذکر آ چکا ہے۔

یہ بہت ہی قدیم اور زرخیز بستیاں تھیں، اور خصوصیت سے تبالہ کے بارے میں تو یاقوت نے لکھا ہے کہ "اس کی زرخیزی ضرب المثل ہے" [۲]

سنہ ۱۰ھ میں یہاں کے عرب باشندوں نے تو اسلام قبول کر لیا، لیکن اہل کتاب اپنے دین پر قائم رہے، اور انہوں نے جزیہ دینا قبول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں کی امارت پر حضرت سفیانؓ کا تقرر فرمایا تھا [۳]،

---

[۱] فتوح البلدان ص ۶۳ [۲] معجم البلدان ج ۲ ص ۳۵۶ [۳] فتوح البلدان ص ۶۶

یہودیوں کی ان بکھی آبادیوں کے علاوہ عرب کے مختلف قبائل میں ایک ایک دو دو اشخاص ملتے ہیں، جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی، اور بعض ایسے عربی قبائل کا بھی پتہ چلتا ہے جو پورے کے پورے دائرۂ یہودیت میں داخل ہو گئے تھے، مثلاً حمیر، بنو کندہ، بنو کنانہ، بنو الحارث، قضاعہ[1]، غسان، اور جذام کے بعض خاندانوں میں بھی یہودیت تھی[2]۔

یہودی قبائل اور ان کی آبادیوں کا ذکر اس وسعت کے ساتھ اسلئے کیا گیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ عرب کے اندر جتنے بھی تجارتی، زراعتی، سیاسی، مرکزی مقامات تھے، تقریباً ان سب پر یہودیوں کا قبضہ تھا، یا کم از کم وہاں ان کا اثر و رسوخ تھا، دوسرے آئندہ جو مباحث آنے والے ہیں ان میں بھی اس تفصیل سے واقعات کے سمجھنے میں بہت کافی مدد ملے گی،

اسلام سے پہلے عربوں اور یہودیوں کے تعلقات اور اس کی نوعیت

جزیرۂ عرب میں یہودیوں کی آمد اور ان کی آبادی کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس سے اجمالاً عربوں اور یہودیوں کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے، مگر پھر بھی اس سلسلہ میں مزید تفصیل کی ضرورت ہے، تاکہ ان کے تعلقات کی تمام جہتیں اور ان کی نوعیت پورے طور سے سامنے آجائیں۔

اسلام سے پہلے عربوں اور یہودیوں میں گوناگوں معاشرتی اور تمدنی تعلقات تھے، مگر ان کے باوجود ذہنی طور پر ان میں ایک طرح کی اجنبیت اور مغائرت بھی موجود تھی مگر وہ وطنی اور معاشرتی نہیں تھی، بلکہ معاشی اور مذہبی، تفوق یا افضیلت و مفضولیت کی تھی۔

یہود دین الٰہی کے ماننے والے اور صحف سماوی کے حامل تھے، پھر اسی کیسا

---

[1] معارف ابن قتیبہ ص ۲۶۶۔ [2] یعقوبی ج ۱۔ ص ۲۹۸۔

ان کو پورے جزیرہ میں معاشی غلبہ بھی حاصل تھا، اس لئے وہ عام عربوں کے مقابلہ میں اپنے کو افضل اور بہتر سمجھتے تھے۔

غالبًا اسی تفوق پسندی ہی کا نتیجہ تھا کہ یہود خالص عرب آبادی میں بہت کم آباد تھے، اور جہاں عربوں کے ساتھ وہ آباد بھی تھے، تو وہاں انہوں نے اپنا تفوق قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی امتیاز بھی باقی رکھا، یہودی آبادیوں کے نقشے پر آپ نظر ڈالیں گے تو عاجز کے اس خیال کی پوری تائید ہو گی۔

مگر چونکہ ان کو پورے جزیرہ میں عددی اکثریت حاصل نہیں تھی، اور دوسرے ان کے تجارتی اسباب وسامان اور زراعتی پیداوار دحاصلات کی منڈی زیادہ تر عرب ہی آبادیاں تھیں، اسلئے وہ عربوں سے بالکل منقطع اور بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس تفوق کے باوجود انہوں نے ہمیشہ عربوں سے اپنے تعلقات استوار رکھنے کی کوشش کی، جیساکہ ہر تجارت پیشہ اور کاروباری قوم کا شیوہ ہوتا ہے، اسی کے مقابلہ میں عام اہل عرب مذہبی اور معاشی دونوں حیثیت سے اپنے کو یہود سے کمتر سمجھتے تھے، اور وہ شاید سمجھنے پر مجبور بھی تھے، اس لئے کہ ان نعمتوں سے جو یہودیوں کو حاصل تھیں، ان کا دامن قریب قریب خالی تھا، نہ تو ان کے پاس کوئی کتاب الہٰی تھی اور نہ معاشی حیثیت سے وہ مطمئن تھے، قریش جو تجارت میں معروف ومشہور تھے، اور جن کو کعبہ کے کلید بردار اور نگراں ہونے کی وجہ سے سارے عرب کی سیادت ہی نہیں بلکہ پورے جزیرۂ عرب کی بے تاج کی بادشاہی بھی حاصل تھی، وہ بھی یہود کی مذہبی افضیلت وتفوق کے معترف اور ان کی معاشی برتری کے ماننے پر مجبور تھے،

قرآن نے متعدد جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر تم کو (اہل عرب)

رسول کی سچائی اور دین حق میں شبہہ ہو تو اہل کتاب سے پوچھ لو. حدیث وسیر کی کتابوں سے ثابت ہے کہ قریش نے متعدد بار اپنے وفود مدینے کے یہود کے پاس اسلئے بھیجے کہ وہ آپ کی نبوت اور آپ کے صفات کتب سابقہ کی روشنی میں ان سے دریافت کریں، اسی تفوق و افضیلت ہی کا اثر تھا کہ جب لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے تو وہ منت مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہ جائیگا تو اسے یہودی بنادیں گے، چنانچہ مدینہ میں اس طرح کے بہت سے جدید الیہودیہ افراد موجود تھے[۱] تفصیل آگے آئے گی۔

معاشی حیثیت سے بھی یہود کو عربوں پر عام طور سے تفوق حاصل تھا، مدینہ کی بیشتر عرب آبادی ان کی مقروض تھی، خیبر کا بھی یہی حال تھا، وہاں وہ عربوں سے مزدوری کراتے تھے جس وقت خیبر فتح ہوا ہے، اس وقت بہت سے عرب خدمت گار، ان کے پاس موجود تھے[۲] قریش جو پورے عرب میں ممتاز اور صاحب "رحلۃ الشتاء والصیف" تھے، وہ بھی شادی بیاہ کے موقع پر خیبر کے یہودیوں سے زیورات کرایہ پر لیجاتے تھے، ایک مرتبہ اسی طرح کے مستعار زیورات گم ہوئے تو قریش نے یہودیوں کو دس ہزار دینار[۳] ہرجانہ ادا کیا۔

کہنا یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں اور یہودیوں میں باہم معاشی اور معاشرتی تعلقات تھے، اور باوجود تفوق و مذہبی مغایرت کے جنگ وغیرہ کے مواقع پر اپنے مصالح کے ماتحت عربی قبائل سے وہ تحلیف و معاہدہ کرتے تھے، اور اس میں شریک ہوتے تھے۔

---

[۱] ابوداؤد ج ۲، ۹ کتاب الجہاد۔
[۲] ابن ہشام وغیرہ۔
[۳] السیر الکبیر ج ۱ ص ۱۸۶، تقریباً د ۲ ہزار روپے ہوئے۔

مدینے کے مشہور عربی قبائل اوس وخزرج میں جتنی لڑائیاں[1] ہوئیں، ان میں وہاں کے یہودی قبائل کسی نہ کسی کے حلیف تھے، اسی طرح خیبر کے یہودیوں سے آس پاس کے تمام قبائل سے معاہدۂ جنگ تھا، چنانچہ اسلامی غزوات کے مواقع پر انہوں نے اس حلف ومعاہدۂ سے پورا فائدہ اٹھایا،[2]

یہی نہیں بلکہ بعض عربی قبائل اور یہودیوں میں شادی بیاہ کے رشتے بھی شروع ہو گئے تھے، کعب جو یہود مدینہ کا اشعر الشعراء، اور سب سے بڑا دشمن اسلام تھا، اس کا باپ اشرف قبیلہ طے اور بعض روایتوں میں ہے کہ بنو نبہان سے تھا، جس نے مدینہ میں آکر اپنا اثر ورسوخ پیدا کیا، اور سردار بنو نضیر ابو رافع کی لڑکی سے شادی کر لی تھی،[3] اس طرح مدینے کے یہود اور عربی قبائل میں بھی غالباً اسی قسم کے تعلقات تھے اور خصوصیت سے وہ قبائل جو جدید الیہودیہ[4] تھے،

ظہور اسلام سے پہلے یہود اور عرب کے ایک دوسرے پر تمدنی اور معاشرتی اثرات

یہ تو اب تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ عرب اسلام سے پہلے دنیا سے بالکل منقطع نہیں ہو گئے تھے، بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے ان کا ہمیشہ واسطہ رہا، اور دنیا کی مختلف قوموں کے تمدنی اور مذہبی اثرات بھی ان پر پڑے تھے۔ اسی طرح ان ملکوں اور قوموں پر بھی انہوں نے اپنے اثرات ڈالے جن سے ان کا واسطہ پایا جو جزیرۂ عرب آباد تھیں۔

یہود ایک قدیم قوم تھی جو دنیا کے ہر خطہ میں آباد تھی، خصوصیت سے عراق، ایران، مصر یونان اور شام کے علاقہ میں ان کی کثیر آبادی تھی۔ لیکن اس قدامت کے باوجود ان کی قسمت میں زیادہ تر ہجرت ہی مقدر تھی یا ان کی طبیعت ہی ایسی واقع تھی کہ کسی ایک جگہ جم کر نہیں رہ سکتے تھے۔ جو بات بھی ہو، بہرحال ایسا ضرور ہوا کہ وہ جہاں آباد ہوئے، وہاں سے انہیں ہجرت ضرور کرنی پڑی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو دنیا کی مختلف قوموں اور ان کے تمدنوں اور تہذیبوں سے واسطہ پڑا، کسی کو کچھ دیا اور کسی سے کچھ لیا،

---

[1] مثلاً جنگ فجار اور جنگ بعاث وغیرہ [2] مثلاً غزوہ بدر، غزوہ خیبر وغیرہ [3] زرقانی ج ۲ ص ۹

عرب میں یہود آباد تھے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ان کی اکثر آبادی باہر سے اور خصوصیت سے شام و فلسطین کے علاقوں سے ہجرت کر کے آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ جب یہاں آئے تو ان ملکوں اور قوموں کے تمدنی اور مذہبی اثرات بھی اپنے ساتھ لائے، جن سے ان کا واسطہ رہ چکا تھا۔ اور چونکہ یہ جزیرۂ عرب کے ہر خطہ میں آباد تھے اس لئے انہوں نے پورے جزیرۂ کی عرب آبادی کو اس سے کم و بیش متاثر کیا، لیکن یہ اثرات صرف ایک ہی طرف سے نہیں، ہر طرف سے پڑے تھے۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے تو عربوں کے اثرات ان پر زیادہ معلوم ہوتے ہیں اسی بنا پر بعض مستشرقین نے یہ رائے قائم کر لی کہ جزیرۂ عرب کے یہود دنیا سے بالکل منقطع ہو چکے تھے، اور ان میں یہودی خصوصیات باقی نہیں رہ گئی تھیں۔ اور بعض نے یہ خیال قائم کر لیا کہ جزیرۂ عرب کے یہود باہر سے ہجرت کر کے سرے سے آئے ہی نہیں تھے،

اب ہم مختصر طور سے یہود کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں جس کے ضمن میں عربوں کے بعض بعض اثرات کا ذکر بھی آئے گا۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہود کو عربوں پر مختلف حیثیتوں سے تفوق حاصل تھا، جس کا عرب بھی اعتراف کرتے تھے، اور بہت سے معاملات میں انہی کی اقتدا کرتے تھے۔ ابن عباسؓ کے اثر سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

كان هذا الحي من الانصار وهم اهل وثن مع هذا الحي وهم اهل الكتاب، فكانوا يرون فضلا عليهم في العلم وكانوا يقتدون في كثير من فعلهم (ابوداؤد)

یہ انصار کے قبائل اہل کتاب کے قبائل کے ساتھ آباد تھے، انصار ان کو علم و فضل میں اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور اکثر معاملات زندگی میں ان کی اقتدا کرتے تھے۔

یہود کے پیشے | جزیرۂ عرب میں جہاں بھی یہود آباد تھے، عموماً ان کے خاص تین پیشے تھے، زراعت تجارت، اور صنعت و حرفت۔

زراعت بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ زراعت میں یہود عربوں کے استاذ[1] تھے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ عرب یہود کی آمد سے پہلے زراعت کرنا نہیں جانتے تھے، اور یہود نے اگر ان کو سکھایا، بلکہ انہوں نے زراعت کے نئے نئے طریقے، اور اس کے لئے جدید قسم کے آلات عربوں کو بتائے۔ اور بعض نئے قسم کے پودوں اور درختوں سے ان کو آگاہ کیا،[2] جن سے پہلے یہاں کے لوگ واقف نہیں تھے، اسی طرح یہودیوں کو پرندوں اور جانوروں کے پالنے کا بھی شوق تھا،[3]

حجاز کے یہود عموماً شام و فلسطین سے آئے تھے، جہاں کی زمین زرخیزی اور زراعت کی موزونیت کے لحاظ سے ضرب المثل تھی، اسلئے وہاں سے آنے والے یہودیوں نے اگر عربوں کو نئے طریقہ زراعت سے آگاہ کیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، پھر شام کی سرزمین کو صحف قدیم میں تین[4] و زیتون کی زمین کہا گیا ہے، بہت ممکن ہے کہ یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے درخت بھی یہودیوں کے ذریعہ جزیرۂ میں آئے ہوں،

لیکن جانوروں کے پالنے کا شوق تو اس میں دونوں شریک ہیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ یہودیوں سے کہیں زیادہ عربوں میں تھا، اسلئے کہ جزیرۂ عرب کی بیشتر آبادی کا مدار زندگی جانوروں کے دودھ ہی پر تھا، دوسرے وہاں کی زیادہ تر آبادی خانہ بدوش تھی، جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والے اور اسباب لیجانے کے لئے بھی جانوروں کی ضرورت ہوتی تھی، یہ بات ضرور ہے کہ عرب زیادہ تر نقل و حمل اور دودھ اور غذا کیلئے جانوروں کی پرورش کرتے تھے، ہوسکتا ہے کہ زراعت اور اس کی سیرابی وغیرہ کیلئے جانوروں کی پرورش اور ان کا گوناگوں استعمال عربوں نے یہود سے سیکھا ہو،

تاریخ الیہود کے مصنف نے ابن ہشام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بعض یہود مرغیاں بھی پالتے تھے، مگر مجھے ابن ہشام میں یہ واقعہ نہیں مل سکا۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہود کی خصوصیت تھی،

---

[1] تاریخ الیہود ص ۱۴۷، ۱۴۸ [3] ابن ہشام بحوالہ تاریخ الیہود

[2] فتوح البلدان ص ۴۷ و ۶۸ [4] انجیل اور زیتون قرآن نے بھی سورہ تین میں ان چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔

تجارت ظہورِ اسلام کے وقت اور اس سے بہت پہلے سے یہود اور عرب دونوں جزیرہ میں اور جزیرہ کے باہر تجارت کرتے نظر آتے ہیں اور خصوصیت سے قریش تو اس حیثیت سے پورے عرب میں ممتاز تھے، اسلئے ان میں سے کسی ایک کو مقدم یا مؤخر کرنا بہت دشوار ہے، تاہم یہ صحیح ہے کہ یہود کئی سو برس قبل مسیح سے تجارت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور جہاں بھی وہ رہے یہ پیشہ ان کے ساتھ رہا جزیرۂ عرب میں آئے تو یہاں بھی انہوں نے یہی پیشہ اختیار کیا، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، دوسرے اپنی سکونت و رہائش کیلئے بھی انہوں نے خاص طور سے جزیرۂ کے ان ہی خطوں اور علاقوں کو پسند کیا، جن میں پہلے سے کچھ زرعی و کاروباری صلاحیت موجود تھی بخلاف اس کے عربوں کی عام بستیوں اور آبادیوں کو اس طرح کی کوئی خصوصیت حاصل نہیں تھی، ہاں مکہ کو کعبۃ اللہ اور بیت الحرام کی وجہ سے دینی اہمیت و مرکزیت ضرور حاصل تھی، اور اسی کی کشش دور دور سے لوگوں کو یہاں کھینچ لاتی تھی، اور اس طرح وہ سال کے کچھ مہینوں میں تجارتی منڈی بن جاتا تھا، لیکن بذات خود اس میں کوئی زرعی، تجارتی صلاحیت نہیں تھی، اور اسی لئے رب کعبہ نے اس کو قرآن پاک میں وادی "غیر ذی زرع" سے تعبیر کیا ہے،

بلادِ حجاز میں طائف اور مدینہ دو ایسے مقامات تھے، جنہیں تجارتی اور زرعی اہمیت بھی حاصل تھی، اور جہاں عربوں کی عددی اکثریت بھی تھی، اور یہود اقلیت میں تھے، مگر وہاں کی تجارت و زراعت پر یہودی ہی چھائے ہوئے تھے۔ ان دونوں مقامات کا تذکرہ اوپر آچکا ہے،

یہ وجوہ ہیں، جن کی بنا پر ہمارا قیاس ہے کہ یہ پیشہ عربوں میں یہودیوں ہی کے ذریعہ آیا ہوگا،

تجارتی بازار عربوں کی ہر مشہور بستی میں چھوٹے بڑے میلے اور بعض جگہ ہفتہ وار بازار لگتے تھے[1]،

---

[1] نظام حکمرانی ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۲۴

ان کے علاوہ سال میں بعض اور بھی بڑے بڑے بازار اور میلے لگتے تھے، جہاں یہود کے شرکت کی تصریح کم ملتی ہے، مگر وہ ان میں شریک ضرور ہوتے ہوں گے۔ اسلئے کہ جزیرہ عرب کے ۲۰ مشہور شہروں میں سے تقریباً دس، گیارہ شہروں میں یہود کا معاشی واقتصادی غلبہ تھا، محمد بن حبیب نے لکھا ہے کہ بحرین اور دومتہ الجندل میں جہاں یہودی آباد تھے، دو مشہور میلے لگتے تھے،[۱] یقیناً ان میلوں میں ان کی موثر شرکت ہوتی ہوگی، مدینہ میں ایک بازار سوق بنی قینقاع تو یہود کے مشہور قبیلہ قینقاع ہی کے نام سے مشہور تھا جس کا تذکرہ سیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

سامان تجارت | سامان تجارت میں عموماً غلّے، کھوریں، اسلحے اور کپڑے وغیرہ ہوتے تھے، جنہیں یہ بیچنے کیلئے باہر لیجاتے تھے، بعض حصوں کے یہود مچھلی کی بھی تجارت کرتے تھے مثلاً مقنا کے یہودیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدہ کیا تھا، اس میں جو چیزیں بطور ٹیکس لینا طے پائی تھیں، ان میں مچھلیاں بھی تھیں[۲]۔

ظہور اسلام کے وقت جزیرہ سے باہر یہود سے زیادہ عرب اور ان میں خصوصیت سے اہل مکہ ہم کو تجارتی سفر کرتے نظر آتے ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہود، جن کا قدیم زمانہ سے عرب سے باہر بھی کاروبار تھا، اور جن کا ایک فرد ابورافع یہودی آخری دور میں بھی، بہت زیادہ مشہور تھا، یہاں تک کہ اس کا لقب ہی تاجر الحجاز والشام پڑ گیا تھا[۳]، ظہور اسلام کے وقت دفعۃً ان کی برآمدی تجارت کیوں کم ہوگئی، اور ان کی برآمدی تجارت کیوں کم ہوگئی، اور ان کا کاروبار اندرون ملک تک کیوں محدود ہو کر رہ گیا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی قابل ذکر امر ہے کہ پورے جزیرۂ عرب میں ربا یعنی سودخوری کا بھی رواج تھا، جس میں یہود ونصاریٰ، اور مشرکین عرب سب برابر کے شریک تھے، خصوصیت سے اہل طائف سودی کاروبار میں زیادہ مشہور تھے، معجم البلدان میں ہے۔

---

[۱] کتاب المحبر ص ۲۶۵ [۲] فتوح البلدان ذکر مقنا [۳] تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۱۲، صحیح بخاری باب قتل النائم والمشرک

كانوا اصحاب ربا — اہل طائف بڑے سود خوار تھے ۔

مشرکین عرب اگر سودی کاروبار کرتے تھے، تو کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ لیکن یہود ونصاریٰ کی سودخواری البتہ حیرت انگیز ہے کہ وہ صاحب شریعت اور اہل کتاب تھے، اور قرآن کی تصریح ہے کہ ان کو جہاں اور بہت سی باتوں پر ملامت کی گئی تھی، اور ان کو ان سے روکا گیا تھا، انہیں ایک سود بھی تھا، مگر وہ باز نہ آئے ۔

واكلهم الربوٰ وقد نهوا عنه — اور ان کے سود لینے کی وجہ سے (ملامت کی گئی) حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے ۔

البتہ عربوں کا خیال تھا کہ ربا بھی ایک قسم کی تجارت ہے، قرآن میں ہے ۔

قالوا انما البيع مثل الربوٰ — ان لوگوں نے کہا کہ بیع مثل ربا کے ہے ۔

بہرحال یا تو یہ لعنت یہود کے ذریعہ عربوں میں آئی، یا عربوں کے اثر سے یہود اس میں مبتلا ہوئے، دونوں باتوں کا امکان ہے ۔

لیکن سورہ مائدہ میں جہاں یہود کے ان معائب کا جو بہت قدیم زمانہ سے ان میں موجود تھے، تذکرہ ہے، ان میں ایک سودخواری بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے وہ اس میں مبتلا تھے، اس کے برخلاف عربوں کی تجارتی تاریخ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے، اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ اس طریق تجارت کو یہود ہی نے یہاں فروغ دیا ہوگا۔ جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ربا کا جتنا عام رواج یہود میں تھا اور اس کی جتنی سخت شرحیں وہ مقرر کرتے تھے عرب اس میں ان سے پیچھے تھے ۔

رہن وارتہان کا طریقہ بھی یہود اور عرب دونوں میں رائج تھا خصوصیت سے مدینہ اور خیبر کے یہودیوں میں یہ بہت عام تھا، یہ بھی سودخواری ہی کی ایک شاخ تھی اس کو وہ ایک قسم کی تجارت سمجھتے تھے ۔

ت وحرفت | صنعت وحرفت کا رواج اگرچہ جزیرۂ عرب کے تمام باشندوں میں تھا، مگر یہود اس
بہت ممتاز تھے، اور عموماً کپڑے، اسلحے اور سونے اور لوہے کا کام کرتے تھے، اور بعض
وں کے یہودیوں میں لکڑی کی صنعت بھی تھی[1]، روئی کی کتائی، اور کپڑے کی بنائی میں مردوں
لے ساتھ عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں، یثرب کے یہودیوں میں تو کپڑے کی صنعت بہت کم تھی، مگر
ا، دومتہ الجندل اور یمن کے یہودی اس میں بڑی مہارت رکھتے تھے[2] اسلحہ سازی یہود کا خاص
یفہ تھا، یہود جس جگہ آباد تھے، یہ صنعت ان میں موجود تھی، مدینہ میں بنو قینقاع اور خیبر کے یہودی اس میں
ت ممتاز تھے، اس زمانہ کے ہر قسم کے مروج اسلحے مثلاً تلوار، نیزے، ڈھال، خود اور زرع وہ
رکرتے تھے، خیبر کے یہود تو شاید منجنیق تک جو اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ اسلحہ تھا، تیار کرتے
ھے۔ غزوۂ خیبر میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اسے استعمال بھی کیا تھا، کیا عجب ہے کہ مسلمانوں
بنیق یہیں سے ہاتھ لگی ہو جسکو انھوں نے بعد میں طائف وغیرہ کی جنگ میں استعمال کیا،

اس صنعت کی وجہ سے یہود اپنے کو دفاعی حیثیت سے بہت زیادہ مضبوط اور
ون تصور کرتے تھے، اور اس کی وجہ سے ان میں ایک قسم کا غرور و تکبر بھی پیدا ہو گیا تھا چنانچہ
قینقاع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور تحدی کے کہا تھا کہ ہم سے مقابلہ ہوگا تو معلوم
گا، فن تعمیر میں بھی عربوں کے مقابلہ میں یہود زیادہ ترقی یافتہ تھے، مدینہ اور خیبر کے یہودیوں
کے بعض مکانات اور قلعوں کے نشانات اب بھی باقی ہیں جو ان کے ذوق تعمیر کی
شہادت دیتے ہیں،

---

[1] ابن سعد ج ۲ ص ۲۸، فتوح البلدان ۶۷ و ۶۸

[2] فتوح البلدان،

اشہد رفیق اعظمی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

قرآن مجید میں نظم و ترتیب اور مولانا فراہیؒ

علمائے علم و ادب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ربط و مناسبت کلام کا لازمی جزء ہے، کلام کی تمام ترخوبیاں و رعنائیاں نظم کلام میں مضمر ہیں، کتنی ہی فصیح و بلیغ عبارت ہو، اگر اسکو نظم کے شیرازہ سے علیحدہ کر دیا جائے تو اسکا پورا حسن و جمال برباد ہو جاتا ہے۔ اور الفاظ کی جذالت، زبان کی لطافت و اسلوب کا تنوع سب بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، مگر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن مجید جو علوم و معارف کا منبع، اسرار و حکم کا بحر ذخار، رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور زبان و ادب کا اعلیٰ معیاری نمونہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسی کے نظم و ربط کو مشکوک بنا دیا ہے (واأسفاہ) ارباب تفسیر و ماہرین علوم قرآن سے اسکے متعلق دو متضاد رائیں منقول ہیں۔ ایک جماعت نظم قرآن کی یکسر منکر ہے تو دوسری جماعت اس کو فہم قرآن کا بنیادی وسیلہ اور اعجاز قرآن کا لازمی جزء قرار دیتی ہے۔
زیر نظر مضمون میں انھیں اقوال و آراء کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

امام شوکانیؒ

نظم قرآن کی طرف سے بے اعتنائی تو اکثر مفسرین سے ہوتی ہے، لیکن بعض حضرات نے صاف و صریح الفاظ میں قرآن میں نظم کا انکار کر دیا ہے، ان میں سب سے نمایاں اور اہم شخصیت امام شوکانیؒ کی ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر "فتح القدیر" میں جا بجا اس کا انکار کیا ہے، اور ساتھ ہی قائلین نظم پر سخت طعن و تشنیع بھی کی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "بہت سے لوگوں نے (قرآن مجید میں) ایک نیا علم ایجاد کر ڈالا ہے۔ انھوں نے ایسے اتاہ سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ جس سے پار نکلنا مشکل ہے اور اپنے قیمتی اوقات کو ایسے کام میں صرف کر رہے ہیں جس کا کچھ حاصل نہیں .... یعنی مصحف کی موجودہ ترتیب آیات کے درمیان یہ حضرات ربط و مناسبت بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسی دور از کار باتیں کہیں ہیں جن کا حق و انصاف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلغاء کا کلام بھی جس سے ابا کرتا ہے چہ جائیکہ کلام خداوندی حد تو یہ ہے کہ بعض حضرات نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تصنیف کر ڈالی ہیں۔ اور اپنی تصنیف کا اسے اہم اور بنیادی مقصد قرار دیا ہے۔ (۱)

(۱) فتح القدیر جلد اول ص ۷۲

شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ

دوسری نمایاں شخصیت شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی ہے ۔ علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے الاتقان فی علوم القرآن" میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے "نظم کلام کی اہمیت و افادیت تو ں جگہ مسلم ہے ۔ لیکن قرآن مجید جو بیسؔ سال سے بھی زیادہ طویل عرصہ میں مختلف حالات ے پیش نظر گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا ہے جس چیز کا نزول اس تدریج کے ساتھ ہوا ہو ں میں کسی قسم کا ربط و نظم کیوں کر ممکن ہے" (۱)

ضرت شاہ ولی اللہ ہلویؒ کا موقف

نظم کے مخالفین میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا بھی نام لیا جاتا ہے ، ہمارا خیال یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے باب میں یہ رائے ان کے اِن اقوال کی بنا پر قائم کی ہوگی ،

" قرآن مجید کا نزول (اس دور کے طرز تصنیف و تالیف کے مطابق) ابواب و فصول ں شکل میں نہیں ہوا ہے کہ ایک بحث کیلئے ایک باب یا فصل مخصوص ہو پھر اس کا ذکر دوبارہ بں نہ آئے ۔ بلکہ قرآن مجید کی حیثیت ان مجموعہ احکام و فرامین کی ہے ، جسے امراء و سلاطین انہ کے حالات و ضروریات کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنی رعایا کے پاس بھیجتے رہے ہوں پھر ند میں اسے کسی نے کتابی شکل دے دی" (۲)

" بعد کے مصنفین نے تصنیف و تالیف کا جو طریقہ ایجاد کیا ہے ۔ عرب اس سے واقف ں نہ تھے ۔ اگر تمہیں ہمارے اس دعوئی میں ریب و تذبذب ہو تو خود شعراء مخضرمین کے ,اوین اٹھا کر دیکھ لو ۔ خطبات نبویؐ و فاروقیؓ کا مطالعہ کر ڈالو ، حقیقت اپنے آپ آشکارا ، جائیگی ۔ ایسی صورت میں اگر قرآن مجید کا انداز بیان وہ ہوتا ، جس سے کہ عرب نا آشنا نوس تھے ، تو ان کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث ہوتا اور ان کے ذہن میں طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے" (۳)

"کلام الٰہی کا مقصد صرف نامعلوم باتوں سے واقف کرانا نہ تھا بلکہ اس طرح واقف کرانا ہ دل و دماغ میں جاگزیں ہو جائے ، اس لئے صحیح اور مناسب طریقہ یہی تھا کہ کلام ، ربط کی رعایت کئے بغیر ایک بات بار بار کہی جائے" (۴)

[illegible]

اس کے برعکس "الفوزالکبیر" ہی میں متعدد ایسے اقوال بھی ہیں جس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ صرف نظم کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ سرگرم مدعی بھی ہیں۔ بطور مثال چند اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کلام پاک میں غور و فکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا کلام ایسا منظم و مربوط ہے کہ اس بات کا گمان ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ مختلف اوقات میں جستہ جستہ نازل ہوا ہے" (۱)

ایک دوسرے موقع پر رقمطراز ہیں کہ .... اگر تم غور کرو گے تو اندازہ ہوگا کہ کلام جب باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں تو مخاطب کے دل میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے اور اس سے اشتیاق مزید بڑھتا ہے" (۲)

واقعات و قصص کے تکرار کا سبب بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ "اس طرح سے جتنے واقعات قرآن مجید میں ایجاز، اطناب، تفصیل اور اجمال کے مختلف رنگوں میں بار بار لائے گئے ہیں۔ یہ ان اسالیب کے تقاضہ کے تحت ہیں، جو سورہ میں ملحوظ رکھے گئے ہیں" (۳)

نظم قرآن سے متعلق یہ شیخ الاسلام محدث دہلویؒ کے خیالات کا خلاصہ ہے۔ راقم الحروف ان مباحث کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو نظم کے سرگرم حامیوں میں شمار کرنا "افراط" اور منکرین نظم میں شامل کرنا "تفریط" ہے حضرت شاہ صاحبؒ کا موقف درمیانی ہے، جسے مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "شاہ صاحبؒ نظم بین الآیات کے تو قائل ہیں لیکن مناسبت بین السور کو تسلیم نہیں کرتے، اسی طرح وہ اس طرح کے نظم کے قائل نہیں ہیں، جس کا اس وقت تصنیف و تالیف میں رواج ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک سورتوں کا اسلوب احکام و فرامین کے اسلوب کے مماثل ہے۔ جو کہ بلاشبہ مربوط و منظم ہوتے ہیں۔ پوری سورت کے اسلوب میں وہ یکسانیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ سورتوں کے درمیان ان کے نزدیک ربط و مناسبت کا کوئی سوال اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ وہ سورتوں کی ترتیب کو اجتہادی (یعنی صحابۂ کرام نے اپنے اجتہاد سے ترتیب قائم کی ہے) قرار دیتے ہیں۔

---

(۱) حوالہ مذکور ص ۹۴ (۲) حوالہ مذکور ص ۱۲۵ (۳) حوالہ مذکور ص ۹۵ (۴) حوالہ مذکور ص [illegible]

دوسری طرف علمائے سلف و خلف کے ایک بڑی تعداد نے اس موضوع پر توجہ دی ہے کسی نے اپنی تفسیر میں جابجا نظم کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے ۔ کسی نے اپنی تفسیر کی بنیاد ہی نظم پر رکھی ہے ۔ اور بعض نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ ان بزرگوں کے اسمار کی فہرست خاصی طویل ہے ۔ ان میں چند اہم نام یہ ہیں (۱) امام رازیؒ (۲) علامہ زمخشریؒ (۳) شیخ مخدوم علیؒ مہائمی (۴) امام بقاعیؒ (۵) شیخ ابوبکر نیشاپوریؒ (۶) ابن العربیؒ (۷) شیخ ولی الدین ملویؒ (۸) علامہ سیوطیؒ (۹) امام زرکشیؒ (۱۰) مولانا حمید الدین فراہیؒ ۔ ذیل میں ہم ان اکابر کے اقوال و آرار کا خلاصہ نقل کرتے ہیں ۔

امام رازیؒ

سلف میں امام رازیؒ نے نظم و ترتیب کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ حکمت قرآن کا اصل خزانہ اس کے نظم و ترتیب میں مضمر ہے "(۱)

تفسیر کبیر میں انھوں نے درجنوں مقامات پر نظم کے اہتمام پر زور دیا ہے ۔ اور منکرین نظم پر کڑی نقطہ چینی کی ہے ۔ آیت " وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا " (۲) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " لوگ کہتے ہیں یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں نازل ہوئی ہے ۔ جو از راہ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا ، لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب اللہ کے ساتھ بڑی زیادتی ہے ۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم کوئی ربط ہی نہیں ہے حالانکہ یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے ایسی صورت میں قرآن کو معجزہ ماننا تو الگ رہا ۔ اس کو ایک کتاب کہنا بھی مشکل ہے ۔ میرے نزدیک صحیح اور معقول بات یہ ہے کہ یہ سورۃ شروع سے آخر تک بالکل مربوط و منظم ہے " (۳)

شیخ مخدوم علی مہائمیؒ

اس سلسلہ کی دوسری اہم شخصیت علامہ مخدوم علی مہائمیؒ کی ہے ۔ موصوف نے دو ضخیم جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے ۔ جس کی بنیاد ہی نظم پر ہے ، غالباً اسی مناسبت سے اس کا نام بھی " تبصیر الرحمان و تیسیر المنان ، بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن " رکھا ہے ۔ ابتدا میں ایک مبسوط

---

(۱) الاتقان جلد ثانی ص۱۰۸ (۲) سورہ حٰم ۔ سجدہ آیت ۴۴ (۳) تفسیر کبیر جلد ۲۷ ص۱۳۲

مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے جن احساسات و جذبات کا اظہار کیا ہے اس کے چند جملوں کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں " میرے اوپر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے کہ میں آج ایسے اہم موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں جس کو مجھ سے پہلے کسی نے تعرض نہیں کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ تک میں خود اسی مہیب سمندر میں ڈبکیاں مارتا رہا جس میں سے مجھ سے پہلے بہت سے لوگ ہلاکت و تباہی سے دوچار ہوئے۔ لیکن یہ محض فضل خداوندی ہے کہ آج میں نظم قرآن کے حسن و جمال، اس کی رنگینی و رعنائی کو واضح کرنے جا رہا ہوں۔ وللہ الفضل (۱)

علامہ ولی الدین ملویؒ بھی اس جماعت کے نمایاں بزرگ ہیں وہ فرماتے ہیں، جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول باقتضائے حالات جستہ جستہ ہوا ہے اس لئے آیات میں باہم تعلق تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کو سخت دھوکہ ہوا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید حسب حالات جستہ جستہ نازل ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت مضمر ہے" (۲)

امام بقاعیؒ اس مسلک کی ایک اور سرگرم شخصیت شیخ برہان الدین البقاعیؒ کی ہے، ان کی تمام تر کوشش نظم قرآن کے اثبات اور اس کے حسن و جمال کو اجاگر کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ ان کی تفسیر لفظاً و معنیً ہر دو اعتبار سے نظم میں ڈوبی ہوئی ہے جس کا اندازہ تفسیر کے نام " نظم الدرر فی تناسب الآیات والسورۃ " سے کیا جا سکتا ہے۔ نظم سے متعلق ان کے بھی کچھ الفاظ کا نظر سے گذرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

" نظم قرآن وہ علم ہے جس سے ..... قرآن کے مرتب ہونے کے اسباب معلوم ہوتے ہیں ..... اسی وجہ سے اس علم کو بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا تعلق علم تفسیر سے اتنا گہرا ہے جیسا کہ علم البیان کا تعلق علم نحو سے " (۳)

چند اور اکابر علامہ جاراللہ زمخشریؒ بھی نظم کے بہت دلدادہ ہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق تفسیر " الکشاف " کا پہلا جملہ یہ ہے " شکر و ستائش کا سزاوار خداوند قدوس ہی ہے۔

---

(۱) تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان جلد اول صـ۳ (۲) الاتقان فی علوم القرآن جلد ثانی صـ۱۰۸ (۳) نظم الدرر فی تناسب الآیات والسورۃ جلد اول صـ۶

جس نے قرآن جیسی منظم اور مربوط کتاب نازل فرمائی" (۱)

علامہ ابوجعفرؒ اور امام سیوطیؒ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں نظم قرآن سے متعلق وہ "الاتقان" میں لکھتے ہیں کہ "نظم کا علم نہایت اعلیٰ و اہم ہے۔ لیکن اس کے مشکل ہونے کی وجہ سے ہمارے مفسرین کرام نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے" (۲)

یہی بات امام زرکشیؒ نے "البرہان فی علوم القرآن" میں بھی لکھی ہے، علم مناسبت بہت اعلیٰ علم ہے اور اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے اس کی وجہ سے اجزاء کلام ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور ان میں پختگی آجاتی ہے۔ (۳)

یہ چند مفسرین عظام کے اقوال کا خلاصہ ہے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے مفسرین نے بھی اس راہ میں بڑی مفید کوشش کی ہیں۔ جس سے نظم کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ کی یہ شکایت بھی بجا ہے کہ "جن لوگوں نے نظم کا دعویٰ کیا ہے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہ پیش کر سکے، جو کہ اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کر سکے (بلکہ بعض نے قدر تکلف سے کام لیا ہے کہ معاندین کو نکتہ چینی کے لئے مزید موقع فراہم ہو گیا ہے) اس راہ میں سب سے پہلے کامیاب کوشش کی سعادت میرے استاذ مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوئی۔ (۴)

مولانا فراہیؒ ایک تعارف

مولانا حمیدالدین فراہیؒ اس عہد کے نادرہ روزگار ہستی تھے، علم و ہنر، فضل و کمال، زہد و ورع میں اپنی مثال آپ تھے، وہ مغرب و مشرق کے جامع کے علاوہ اپنے معاصرین میں ایک معلم، ایک مفکر، ایک مدبر، اور ایک عظیم مفسر کی حیثیت سے جانے گئے، وہ کلام پاک کے سچے واقف اسرار و دانائے رموز تھے، ان کی پوری زندگی کا حاصل قرآن مجید اور صرف قرآن مجید تھا، انھوں نے

---

(۱) الکشاف جلد اول ص۳ (۲) الاتقان فی علوم القرآن جلد ثانی ص۱۰۸ (۳) البرہان فی علوم القرآن جلد اول ص۳۶ (۴) تدبر قرآن جلد اول ص

اپنی زندگی میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ لیکن ان میں سب سے فائق اور سب سے اہم کارنامہ ان کا "فلسفۂ نظام القرآن" ہے بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ "اس فکر نے انھیں صرف معاصرین ہی نہیں بلکہ متقدمین پر بھی فوقیت دے دی۔ (۱)

مولانا فراہیؒ نے علوم قرآن میں متعدد بلند پایہ تصنیفات چھوڑیں۔ کلام پاک کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی تھی، لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور چند سورتوں پر ہی کام رک گیا "نظم قرآن" ان کا اصل موضوع تھا، نظم کے اثبات میں انھوں نے ایک مدلل وجامع کتاب لکھی جو "دلائل النظام" کے نام سے مشہور ہے اس کتاب میں انھوں نے نظم کو مدلل طور پر ثابت کرنے کے علاوہ، نظم سے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں انھیں بھی رفع کیا ہے۔ نیز تلاش نظم کے اصول بھی بتائے ہیں، ذیل میں ہم قدرے تفصیل سے ان کے فکر کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا فراہیؒ کا دعویٰ

"مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر "نظام القرآن" میں بنیادی طور پر اسی نظم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے بارہ میں اکابر امت کا جو یہ اتفاق ہے کہ وہ اسرار وحکم کا ایک لازوال خزانہ ہے، یا علوم و معارف ایک ناپیداکنار سمندر ہے، اس کا راز اسی نظم کے اندر پوشیدہ ہے۔ یہی نظم ہے جو قرآنی علوم ومعارف کی کلید ہے۔ اور یہ کلید جب ہاتھ آجاتی ہے تو آدمی پر علوم ومعارف کے ایسے دروازے کھلتے ہیں جو اس کی شان گمان میں بھی نہیں ہوتے ہیں" (۲)

نظم کے دلائل

مولانا کی کتاب "دلائل النظام" پوری نظم کے دلائل وشواہد ہی پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف میں بھی نظم کے دلائل بکھرے ہوئے ہیں۔ ان دلائل سے صحیح طور پر واقفیت تو اصل کتاب کی جانب رجوع کرنے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے تاہم مولاناؒ کے بعض اہم دلائل یہاں ہم اختصار کے ساتھ اپنے لفظوں میں نقل کرتے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ فاتحہ تفسیر نظام القرآن ص ۲۴ (۲) علامہ فراہی ایک عظیم مفسر...... مؤلفہ مولانا عنایت اللہ اصلاحی ص ۵۳

(۱) نظم کلام کا جزر لاینفک ہے۔ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی محال ہے پس وہ کتاب جسکی فصاحت و بلاغت کے سامنے بڑے بڑے عرب شعراء داد بار نے گھٹنے ٹیک دیے وہ نظم سے کیونکر خالی ہو سکتی ہے۔ (۱)

(۲) امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیات کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ آپؐ نے، مکی، مدنی، ترتیب نزول، مخاصمت و احکام ہر ترتیب کو چھوڑ کر ایک نئی ترتیب اختیار کی، اس لئے یہاں ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے لئے کوئی عظیم الشان حکمت داعی ہوئی ہے۔ (۲)

(۳) سورتوں کا اسلوب بیان، معنوی ربط و مناسبت، بسا اوقات ایک ہی آیت یا فقرہ کی بار بار تکرار (ترجیع آیات) فواصل میں اوزان کی رعایت، یہ سب بھی قرآن کے منظم و مربوط ہونے کے واضح دلائل ہیں۔ (۳)

(٤) امت میں حد درجہ اختلاف و انتشار کے باوجود قرآن مجید کی موجودہ ترتیب پر سب کا اتفاق ہے۔ سب کے نزدیک صحیح ترتیب یہی مانی جاتی ہے۔ جو بجائے خود نظم قرآن کیلئے بین ثبوت ہے۔ (۴)

(۵) معانی کے صحیح ادراک کیلئے سیاق و سباق کا لحاظ ضروری ہے۔ تاویل کا بیشتر اختلاف اس بات کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا خیال نہیں رکھا۔ اگر تفسیر کے وقت سیاق و سباق نیز سورہ کے محور اور مرکزی مضمون کو پیش نظر رکھتے تو کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا، بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے اور سب کے منہ سے ایک ہی آواز بلند ہوتی۔ "کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَاءِ" (۵)

نظم کیوں پوشیدہ رہا؟

یہ سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں نظم و ربط ہوتا تو یہ راز ان لوگوں سے کیونکر مخفی رہ سکتا تھا۔ جنکی دیدہ وری اور نقطہ رسی پر تمام امت کا اتفاق ہے۔

---

(۱) دلائل النظام صـ۲۲ (۲) حوالہ مذکور صـ۲۶ (۳) حوالہ مذکور صـ۴۰ (٤) الاصلاح جولائی ۳۶ئہ (۵) مقدمہ نظام القرآن صـ۹ و دلائل نظام القرآن صـ۲۶

مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب میں اس سوال کا جواب بھی دیا ہے۔ نیز نظم قرآن سے متعلق دیگر شکوک و شبہات رفع کئے ہیں۔ یہاں بھی اختصار کی غرض سے ہم اسے اپنے ہی لفظوں میں نقل کر رہے ہیں۔

(۱) مولانا کے نزدیک خفار نظم کی بڑی وجہ اس کا مشکل اور دشوار ہونا ہے۔ اکثر لوگوں نے انکار محض اس وجہ سے کیا ہے کہ اعتراف کے بعد اسے ثابت کرنا ضروری ہوگا۔ بصورت دیگر معاندین کی نکتہ چینی کا اندیشہ تھا (۱) علامہ سیوطیؒ اور امام زرکشیؒ نے بھی یہی سبب بیان کیا ہے۔(۲)

(۲) قرآن مجید لوگوں کو حق و ہدایت کی سیدھی راہ دکھانے کیلئے نازل ہوا ہے۔ اس کے احکام و قوانین پر عمل کرنا چاہیئے، اس کی روشنی سے ہدایت حاصل کرنا چاہیئے۔ اس سے بلاغی نکات و ادبی لطائف کا استنباط اس کے مقصد کے منافی ہے۔ اور تلاش نظم اسی قبیل سے ہے۔ بعض مفسرین نے یہ سمجھ کر اس طرف اعتنا نہیں کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ کہتے ہیں کہ بلاشبہ ان حضرات کو حقیقت واقعہ سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ بلاغی نکات ادبی لطائف اور وجوہ اعجاز درحقیقت یہ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ نظم کلام اور ربط بین الآیات کی معرفت بھی مقصود اصلی نہیں ہے، اصل مقصد تو قرآن مجید میں غور و فکر کرنا اور اس کے معانی کو سمجھنا ہے، اور نظم کی معرفت اس کا اہم اور بنیادی وسیلہ ہے۔ (۳)

(۳) خفار نظم کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگوں نے قرآن کو عموماً یا تو مجموعۂ قوانین کی حیثیت سے دیکھا، یا علمی کتاب کے مشابہ بنا دیا۔ ان خیالات کا ضعف صاحب نظر سے مخفی نہیں۔

(۴) نظم کلام جس کا ایک خاص محور و عمود ہوتا ہے۔ یہ عرب کی عادات میں نہیں ہے اسی وجہ سے ان کے اشعار فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے باوجود نظم و ربط سے خالی ہوتے تھے۔ وہ خیالات کی وادیوں میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے تھے، جسے قرآن نے "اِنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ" سے تعبیر کیا ہے اس خیال سے بھی کچھ لوگوں نے قرآن کے

۱؎ دلائل النظام صفحہ ۱

(۲) الاتقان جلد ۲ صفحہ ۱ والبرہان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۳۶ (۳) دلائل النظام ص ۱۰

منظم ہونے سے انکار کیا ہے۔ (۱)

مولانا فراہیؒ اس زعم کو باطل قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور کلام عرب پر جنکی گہری نظر ہے وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ "کلام عرب بھی نظم و ربط سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا بھی ایک مخصوص نظام ہے وہ لکھتے ہیں،

"یہ کلام عرب کی خصوصیت اور فن بلاغت کی فطرت ہے کہ گفتگو کسی ایک موضوع پر شروع ہوتی ہے اور بات سے بات نکلتی جاتی ہے (یہاں تک کہ بسا اوقات بات بے جوڑ معلوم ہونے لگتی ہے) لیکن پھر کلام کا رخ مڑتا ہے اور سلسلہ آکر اس مضمون پر ختم ہوتا ہے مخاطب اگر کلام کی ان نزاکتوں سے واقف ہوتا ہے تو اسے اس کا نظم سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوتی" (۲)

اس سلسلہ میں دوسری بات مولانا یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اسلوب، اس کا انداز بیان اور اس کی ترتیب یہ عرب شاعری نہیں بلکہ زیادہ تر حکما رعرب کے کلام اور ان کے خطبات کے مماثل ہے اس لئے کہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ عرب شاعری کو محض تفریح کا سامان سمجھتے تھے۔ شرفاء عرب تو شاعری کو پسند بھی نہ کرتے تھے۔ باوجودیکہ وہ اس سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ (۳)

(۵) جن لوگوں نے نظم کا انکار کیا ہے ان کی سب سے بڑی اور اہم دلیل یہ ہے کہ "قرآن مجید جستہ جستہ نازل ہوا ہے۔ اس لئے اس میں ربط و نظم کی تلاش بے معنی ہے ـــ اس دلیل کا ہلکا پن بہت واضح ہے۔ اسلئے کہ پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب ترتیب نزول کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے ذریعے اسے لوح محفوظ کے طریقے پر مرتب فرمایا ہے۔ اس کی جانب قرآن مجید میں بھی اشارہ موجود ہے (اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ) (۴) حدیث شریف میں بھی اس کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے (۵)

نظم کے فوائد

مولانا فراہی کا کہنا ہے کہ نظم کے فوائد و خصائص سے صحیح طور پر وہی واقف ہو سکتا ہے جس پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہو گئے ہیں اور جنہوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔

---

(۱) حوالہ مذکور ص ۲۰-۲۱ (۲) حوالہ مذکور ص ۵۵ (۳) دلائل النظام ص ۲ (۴) حوالہ مذکور ص ۴۹ (۵) حوالہ مذکور ص ۔ تفصیلات تفسیر سورۃ القیامہ للفراہی ملاحظہ فرمائیں

یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار عجائب کا کیا عظیم الشان خزانہ ہے۔ جس کی کلید صرف نظم ہے۔ تاہم نظم کے ان فوائد سے کوئی بھی نہیں انکار کر سکتا۔

(۱) نظم کلام کے صحیح معانی و مطالب کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے جن لوگوں نے نظم کا انکار کیا ہے۔ انھیں مطالب کی صحیح تعیین میں بہت دشواری پیش آئی ہے۔

(۲) اگر کسی آیت کی تفسیر میں متعدد احتمالات ہوں تو اس موقع پر سیاق و سباق (نظم کلام) ہی سے صحیح مفہوم کی تعیین ہو سکتی ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔

سورہ نور کی ایک آیت " لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا " کی تفسیر میں امام رازیؒ نے چار قول نقل کئے ہیں۔

(۱) پہلا قول جسے مبرد اور قفال نے اختیار کیا ہے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو اپنا حکم نہ سمجھو اور اس کی دعوت و پکار کو اپنی جیسی دعوت کی حیثیت نہ دو کیونکہ اس کا حکم واجب العمل ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا قول جو حضرت سعید بن جبیرؓ سے مروی ہے کہ " نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح سے مخاطب نہ کرو جس طرح آپس میں خطاب کرتے ہو یعنی یا ابا قاسم! یا اے محمد نہ کہو بلکہ یا رسول اللہ یا یا نبی اللہ کہہ کر خطاب کرو۔

(۳) تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ " نبیؐ کو بآواز بلند نہ پکارو جیسا کہ ایک دوسری آیت (إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ) میں ہے۔

(۴) چوتھا قول یہ ہے کہ " نبی کی بد دعا سے ڈرو کیونکہ اس کی دعائیں عام لوگوں کی دعاؤں کی طرح نہیں ہیں۔

آخر میں امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ پہلا قول راجح ہے سیاق کلام سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اس پر مولانا فراہیؒ کا یہ حاشیہ ہے " اس کے معنی یہ ہیں کہ جب نبیؐ تم کو بلائے تو ضرور حاضر آؤ۔ چاہے جس مقصد کیلئے بھی بلائے اور اس کی باتوں کو سنو، اس کے حکم کی اطاعت کرو

اور جب تک مقصد پورا نہ ہو جائے اٹھ کر ہرگز نہ بھاگو، کیونکہ نبی کی مخالفت بہت بڑا گناہ ہے مبرد و قفال شاید یہی معنی مراد لیتے ہیں۔ لیکن امام رازیؒ اس بات کو نہیں سمجھ سکے، اس معنی کے صحت پر سب سے بڑی دلیل اسی آیت کا آخری حصہ ہے "فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (۱)

(۳) نظم قرآن سے قرآن کی بلاغت اور اس کے اعجاز کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔[۲]

(۴) نظم قرآن اسباب نزول کے صحیح و سقیم میں فرق کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے نظم کا اہتمام نہیں کیا ہے انھوں نے سبب نزول کا غلط مفہوم سمجھ کر آیت کی تفسیر کچھ سے کچھ کر ڈالی ہے۔ (۳)

یہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ نظام القرآن کا ایک سرسری تعارف ہے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعویٰ میں کس حد تک کامیاب ہیں اس کا اندازہ ان کی تصانیف بالخصوص اجزاء تفاسیر کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جس نے نہ صرف معاصرین بلکہ بعد کے بھی تمام اہل علم سے زبردست خراج تحسین حاصل کی اور آج بھی اس راہ کے مسافر کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔

---

(۱) سورہ (۲) دلائل النظام ص ۴۲ (۳) مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص ۲۶

پیشۂ وکالت کی شرعی حیثیت

(جناب ڈاکٹر منیر احمد مغل ایم۔ اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی)

لفظ "وکالت" کی لغوی تحقیق | لفظ "وکالت" بفتح واؤ اور بکسر واؤ دونوں طرح سے آیا ہے۔ اَلْوَکَالَۃُ اَلْوِکَالَۃُ کے معنی سپردگی اور بھروسہ، محافظت، قائم مقامی اور ذمہ داری کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں شخص کا وکیل ہے یعنی اس کا محافظ، اس کی بجائے یا اس کا ذمہ دار ہے، اس کی جمع وکالات ہے۔

لفظ وکیل کا قرآنی مفہوم | اس لفظ کا مادہ و ک ل ہے، جس کے مختلف صیغے قرآن مجید میں کل ستر مقامات پر آئے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

وَکَّلْنَا	(۱ بار)	تَوَکَّلْ	(۹ بار)	وُکِّلَ	(۱ بار)
توکلو	(۲ بار)	تَوَکَّلْتُ	(۷ بار)	وَکِیْلٌ	(۱۱ بار)
تَوَکَّلْنَا	(۴ بار)	وَکِیْلًا	(۱۳ بار)	نَتَوَکَّلُ	(۱ بار)
یَتَوَکَّلُ	(۱۲ بار)	یَتَوَکَّلُوْنَ	(۵ بار)	المتوکلون (۳ بار)	المتوکلین (۱ بار)

اَلْوَکِیْل وہ شخص ہے جس پر بھروسہ کیا جائے، یا وہ شخص جس کے سپرد عاجز آدمی اپنا کام کر دے۔ اس کے ایک معنی دلیر ہیں اور اس کی جمع وُکَلَاء ہے۔

جب یہ لفظ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہو تو اس وقت اس کے معنیٰ "روزی دینے والا، کارساز، کفایت کرنے والا" ہوتے ہیں، جیسے قرآن پاک میں آیا ہے:

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ اور انھوں نے کہا کہ اللہ ہم کو کافی ہے،

اور وہی سب کام سپرد کرنے کیلئے اچھا ہے،

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلاً	اور اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہے،
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ	اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے،

امام راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) فرماتے ہیں، توکیل سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنے علاوہ کسی دوسرے شخص پر اعتماد کریں، اور اس کو اپنا نائب بنا دیں، وکیل بروزن فعیل ہے مفعول کے معنی میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلاً،	اور اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجیے، اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے،

یعنی اللہ کافی ہے کہ تم معاملہ اس کے سپرد کر دو، اور وہ تمہارا وکیل ہو، اور اسی بناء پر ارشاد مبارک ہے:

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ	اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لیے اچھا ہے،
وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ	اور آپ ان پر کچھ بطور ذمہ داری کے مسلط نہیں کیے گئے،

یعنی ان کے کاموں پر موکل اور ان کے امور کی حفاظت پر مامور نہیں ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا قول مبارک ہے:

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ،	آپ ان پر مسلط نہیں ہیں (جو زیادہ فکر میں پڑیں) مگر جو روگردانی اور کفر کرے گا،

اسی پر اللہ تعالیٰ کا قول:

قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ	آپ کہہ دیجیے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں،

نیز یہ ارشاد باری تعالیٰ:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوَاهُ ۔	اے پیغمبرؐ! آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی، جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفس کو بنا لیا،
أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ،	سو کیا آپ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا کام بنانے والا ہوگا،

یعنی مَنْ يَتَوَكَّلُ عَنْهُمْ

اَلتَّوَكُّلُ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے:

تَوَكَّلْتُ بِفُلَانٍ یعنی تَوَلَّيْتُ لَهٗ ،

نیز کہا جاتا ہے:

وَكَّلْتُهٗ فَتَوَكَّلَ لِيْ وَتَوَكَّلْتُ عَلَيْهِ	یعنی میں نے اس پر اعتماد کیا،

اللہ عزوجل نے فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	پس اللہ ہی پر سب ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے،

نیز فرمایا:

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ،	اور جو بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے،
رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا	اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر ہی بھروسہ کیا،

اور وَاكَلَ فُلَانٌ اس وقت کہتے ہیں جب کسی کا کوئی معاملہ کسی دوسرے کے سپرد ہونے کی بنا پر ضایع ہو گیا ہو،

اور تَوَاكَلَ الْقَوْمُ سے مراد بعض کا بعض پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے، اور رَجُلٌ وَكَلَةٌ تُكَلَةٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے معاملہ کو دوسرے کے سپرد کر دے اور

اس پر بھروسہ کرے۔

اکثر لفظ وکیل کی تفسیر کفیل کے لفظ سے کی جاتی ہے، لیکن وکیل زیادہ عام ہے اس لیے کہ ہر کفیل وکیل ہوتا ہے، لیکن ہر وکیل کفیل نہیں ہوتا۔[1]

امام حافظ احمد بن علی حجر العسقلانی (۷۷۳ھ — ۸۵۲ھ) اپنی مشہور زمانہ کتاب فتح الباری شرح صحیح الامام ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ میں لفظ وکالت کے بارے میں یوں شرح فرماتے ہیں:

"لفظ "وکالت" واو کے زبر اور زیر دونوں طرح بولا جاتا ہے، اور اس کے معنی ہیں تَفْوِیض اور حِفْظ (یعنی سپرد کر دینا، حفاظت و نگہبانی میں دے دینا) آپ جب یہ کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کو وکیل بنایا تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آپ نے اپنا کوئی معاملہ اس کی حفاظت میں دے دیا، اور اس کے سپرد کر دیا، اس طرح اپنا بوجھ ہلکا کر لیا، شریعت (مطہرہ) میں وکالت سے مراد ہے کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کو اپنی جگہ مطلق (مکمل طور پر) یا مقید (خاص طور پر خاص حد تک یا خاص کام کے لیے) مقرر کرنا (وھی فی الشرع اقامۃ الشخص غیرہ مقام نفسہ مطلقاً او مقیداً)"[2]

وکالت کے جائز ہونے کا ثبوت

ہر وہ معاہدہ جو انسان خود کر سکتا ہے، اس کے لیے دوسرے شخص کو بھی اپنا وکیل یا نائب بنا سکتا ہے، اس لیے کہ بعض عوارض و حالات کے پیش نظر انسان بہت سے امور خود سر انجام دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ اور اس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کو ان کاموں کے لیے وکیل مقرر کر دے، اس طرح وہ وکیل

---

[1] المفردات فی غریب القرآن فی اللغۃ والادب والتفسیر وعلوم القرآن۔ العلامۃ الحسین بن محمد ابن المفضل الملقب بالراغب الاصفہانی۔ ص ۵۵۳، مطبوعہ کراچی ۱۳۸۰ھ

[2] فتح الباری۔ ابن حجر العسقلانی، جلد ۴، صفحہ ۴۷۹۔ مطبوعہ لاہور ۱۴۰۱ھ۔

مقرر کر کے اپنی یہ ضرورت پوری کر سکتا ہے، وکالت اس مفہوم کے اعتبار سے ایک جائز امر ہے، اور اس کا جواز مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہے، کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا، اس کے جائز ہونے کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کیا گیا ہے، فابعثوا احدکم بورقکم (یعنی تم کسی اور کو اس کام کے لیے کچھ دے کر بھیج سکتے ہو) وکیل بنانا یہی ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اس امر کو برقرار رکھا ہے کیونکہ اس کے خلاف کوئی حکم نہیں آیا، ہم سے پہلے کی شریعت کے احکام بھی اگر اسکی تنسیخ ہماری شریعت میں نہ ہو تو ہمارے لیے شرعی حکم ہیں[1]،

بعنوائے قرآن پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں زندگی گزارنے کا بہترین نمونہ ہے، نیز جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی، نیز یہ کہ اتباع رسول اللہؐ کا انعام یہ ہے کہ متبعین سے اللہ تعالےٰ محبت کرنے لگتا ہے، مزید برآں یہ کہ رسول اللہ جس کام کے کرنے سے روکیں اس سے رک جاؤ، تو دیکھیں کہ آپ کی پاکیزہ زندگی میں وکیل مقرر کرنے کی کوئی نظیر ملتی ہے،

لفظ وکیل کا حدیث میں مفہوم	حدیث میں وکیل استعمال ہوا ہے، بلکہ وکالت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے،

امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں اس موضوع یعنی کتاب الوکالۃ کے تحت سولہ باب باندھے ہیں، اور ۲۶ احادیث بیان فرمائی ہیں، جن کے اطراف کا احاطہ کیا جائے تو اس طرح کل ۹۲ احادیث ہیں:

۱ــــ وکالۃ الشریک الشریک فی القسمۃ و غیرھا۔

۲ــــ اذا وکل المسلم حربیا فی دار الحرب او دار الاسلام جاز

[1] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ عبدالرحمٰن الجزیری جز ۳ ص ۱۷۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء

٣ ــ الوكالة في الصرف والميزان
٤ ــ اذا أبصر الراعي او الوكيل شاةً تموت او شيئاً يفسد ذبح واصلح ما يخاف عليه الفساد،
٥ ــ وكالة الشاهد والغائب جائزةٌ.
٦ ــ الوكالة في قضاء الدُّيُون،
٧ ــ اذا وهب شيئاً لوكيل او شفيع قوم جاز،
٨ ــ اذا وكّل رجل ان يعطي شيئاً ولم يبيّن كم يعطي فأعطى على ما يتعارفه الناس.
٩ ــ وكالة المرأة الامامَ في النكاح،
١٠ ــ اذا وكّل رجل فترك الوكيل شيئاً فاجازه الموكل فهو جائزٌ وان اقرضه الى اجل مسمّى جاز،
١١ ــ اذا باع الوكيل شيئاً فاسداً فبيعه مردودٌ،
١٢ ــ الوكالة في الوقف ونفقته، وان يطعم صديقاً له وياكل بالمعروف،
١٣ ــ الوكالة في الحدود،
١٤ ــ الوكالة في البدن وتعاهدها،
١٥ ــ اذا قال الرجل لوكيله "ضعه حيث اراك الله" وقال الوكيل قد سمعت ما قلت،
١٦ ــ وكالة الامين في الخزانة ونحوها

امام ابن حجر العسقلانی فرماتے ہیں کہ کتاب الوکالۃ چھبیس احادیث پر مشتمل ہے ان میں سے چھ معلق اور باقی موصولہ ہیں ان میں کی مکرر یعنی جو پہلے بھی گزر چکی ہیں بارہ حدیثیں ہیں اور باقی خالص ہیں۔ امام مسلم نے ان کی تخریج میں امام بخاری کی موافقت کی ہے ماسوائے حدیث عبدالرحمن بن عوف کے جو امیہ ابن خلف کے قتل کے بارے میں ہے اور حدیث کعب بن مالک ذبح شدہ بکری کے بارے میں اور حدیث وفد ہوازن جو ان دونوں کے طریق پر ہے اور حدیث ابو ہریرہ جو رمضان کی زکوۃ کے حفظ کے بارے میں ہے اور حدیث عقبہ بن الحارث جو قصہ نعمان کے بارے میں ہے اور اس میں صحابہ وغیرہم کے آثار و اقوال ہیں سے کچھ آثار ہیں

حضرت جابرؓ کہتے ہیں میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اجازت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا میں نے آپ کو سلام کیا اور عرض کیا میں خیبر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں آپ نے فرمایا تم خیبر میں میرے وکیل سے ملو تو پندرہ وسق کھوریں لینے آمادہ تجھ سے نشانی مانگے تو اس کے حلق پر ہاتھ رکھ دینا گویا یہ نشانی نبی اکرمؐ نے مقرر کر رکھی تھی صحیح بخاری شریف کے محولہ بالا ابواب میں وکالت سے متعلق حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں رسول اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ نے حضرت حکیم بن حزام کو قربانی کی خریداری کیلئے[1] اور حضرت عمر بن ابی سلمہؓ کو شادی کیلئے اپنا وکیل مقرر کیا تھا یعنی عمر بن ابی سلمہ نے اپنی والدہ حضرت ام المومنین ام سلمہ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھا لیکن ظاہر یہ ہے کہ ولایت دی گئی تھی

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جن کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ستاروں سے تشبیہ دی ہے کہ ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پالو گے ان میں سے بعض صدیق فاروق ذوالنورین، حیدر کرار اولین سابقین ہیں۔ بعض عشرہ مبشرہ ہیں۔ بعض شہدا اور سب کے سب رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اور صالحین ہیں

باب العلم سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپؓ نے اپنے متعدد مقدمات میں حضرت عقیلؓ کو اور ان کے زیادہ عمر ہو جانے کے بعد حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو وکیل مقرر کیا تھا امام بیہقی نے بالاسناد عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت کی ہے انھوں نے فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقدمات میں خود حاضر نہ ہوتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہر مقدمہ ایک بڑی مصیبت ہے

---

[1] الترمذی۔ کتاب البیوع۔ باب ۳۴۔ حدیث نمبر ۲۰۵۸۔ سنن ابو داؤد۔ ابواب البیوع۔ باب ۲۸

جو شیطان پیش کرتا ہے پس آپ حضرت عقیل رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب کو مقدمہ کیلئے وکیل مقرر کر دیتے پھر جب ان کو بڑھاپا آگیا اور وہ نحیف ہو گئے تو مجھے ان مقدمات کے لیئے وکیل مقرر فرمایا حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو فیصلہ میرے وکیل کے خلاف ہوگا وہ میرے خلاف ہوگا

فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ میرے شوہر نے مجھے تین طلاقیں دیں اور اور میرے نفقہ (طعام) کیلئے اپنے بھائی کو مقرر کر دیا۔ اور خود یمن کی طرف چلا گیا تو میں رسول اللہ کے پاس اس کے خلاف مقدمہ لے گئی۔ آپ نے میرے لیے نفقہ و سکنی (طعام و قیام) نہیں بتایا[۱] عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو نکاح ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابی سفیان کے واسطے وکیل کیا اور رافع رضی اللہ عنہ کو نکاح میمونہ رضی اللہ عنہا میں وکیل کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت تک امت نے اس کے جواز پر اجماع کیا ہے اور ائمہ حدیث میں سے کسی کا اس میں اختلاف نہ ہونا وکالت کے جائز ہونے کی دلیل ہے جس میں کوئی نزاع نہیں[۱]

وکالت کی تعریف: ایک شخص کا اپنے کاروبار کو دوسرے شخص کے سپرد کر دینے اور اس کو اپنا قائم مقام مقرر کر دینے کا نام وکالت ہے جو شخص اس طرح مقرر کیا جاتا ہے وہ وکیل یا مختار کہلاتا ہے اور مقرر کرنے والا موکل یا اصل کے نام سے موسوم ہوتا ہے[۲]

تکمیل معاہدہ وکالت: یہ معاہدہ یا عقد ایجاب و قبول سے تکمیل پاتا ہے شرع اسلام کے مطابق کسی بھی معاہدہ کے لیئے جس امر کی ضرورت ہے وہ فریقین کی رضامندی کا اظہار ہے جو اظہار رضامندی ابتداءً کیا جاتا ہے وہ ایجاب کہلاتا ہے اور دوسرے اظہار کا نام قبول ہے ایجاب و قبول کا ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہے خواہ وہ مجلس فی الحقیقت ایک ہی ہو خواہ اس کو شرع نے ایک قرار دیا ہو بقول و ایجاب میں توافق ہونا چاہیئے یعنی فریقین کا قصد ایک ہی ہونا چاہیئے بغیر اس کے حقیقی رضامندی کا اظہار نہیں ہو سکتا

شرائط وکالت: ۱۔ موکل ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کو خود تصرف کی لیاقت حاصل ہو اس کے ذمہ احکام لازم ہوتے ہوں ۲۔ وکیل ایسا شخص ہو جو عقد (معاہدہ وکالت) کو سمجھتا ہو اور اس کا قصد کرے ۳۔ وکیل میں ادائے عبارت کی لیاقت ہو =

دوسرے لفظوں میں معاہدہ وکالت کی ظاہری شرط یہ ہے کہ جو شخص مختار مقرر کیا جائے یا وکیل وہ کام مفوضہ

---

[۱] عبد الرحمن الجزیری۔ کتاب الفقہ علی المذاہب اربعہ، ۳: ۱۷۱ لاہور

[۲] المجلۃ الاحکام العدلیہ ...

کی انجام دہی کی قابلیت رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے ایک بچہ جو سن شعور کو نہ پہنچا ہو اور دیوانہ وکیل نہیں ہو سکتا۔

رکن وکالت | لفظ وکلت ہے یعنی میں نے وکیل کیا۔ کی ادائیگی ہے اور وکیل کی طرف سے میں نے موکل کی طرف سے یہ ذمہ داری قبول کی کہنا ہے

حکم وکالت | وکیل مقرر کیے جانے کے بعد وکیل کو اس کام کا تصرف حاصل ہو جاتا ہے جس کام کے لیے موکل نے اس کو اپنا قائم مقام مقرر کیا ہو

وکالت کن امور میں ہو سکتی ہے | وکالت تمام کاروبار میں ہو سکتی ہے جیسے خرید و فروخت اجارہ۔ کرایہ۔ قرض۔ رہن۔ کفالت۔ ہبہ۔ تصفیہ باہمی۔ برأت۔ اقرار۔ مقدمات دخصومت طلب حق شفعہ۔ تقسیم۔ ادائیگی قرضہ۔ حصول قبضہ جائداد وغیرہ۔ اور نیز معاہدہ نکاح میں۔ لیکن شرع بجز اصل شخص کے حقوق کی قائم مقامی کے اور کسی امر میں مختاری ( ) کو تسلیم نہیں کرتی یعنی عقوبات میں وکالت کارآمد نہیں ہو سکتی اور کوئی شخص یہ عذر کر کے کہ وہ فلاں ہر جرم یا جرم کا مرتکب فلاں شخص کی طرف سے بحیثیت مختار یا وکیل کے ہوا تھا بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

موکل کس حد تک اپنے وکیل کے افعال کا پابند ہے اور کس حد تک وہ ان افعال سے منفعت اٹھا سکتا ہے... | قرضہ بلا بدل رہن۔ کفالت۔ عاریت۔ شرکت اور مضاربت کے معاملات میں اگر مختار یا وکیل نے معاہدہ صریحاً موکل کے نام سے نہیں کیا تو موکل اس کا پابند نہ ہوگا لیکن اجارہ بیع یا تصفیہ باہمی میں معاہدہ کا بصراحت تمام موکل کے نام سے ہونا ضروری نہیں ہے جب معاہدہ بصراحت اصل شخص یعنی موکل کے نام سے نہ ہو تو موکل معاہدہ سے مستفید ہو تو سکے گا مگر فریق معاہدہ وکیل ہی سمجھا جائے گا جہاں تک معاہدہ کے... حقوق اور ذمہ داریوں کی تعمیل کا تعلق ہے دوسری صورتوں میں تعمیل کا حق موکل اور وکیل دونوں کو... حاصل رہے گا ایک وکیل یا مختار مجاز ہے کہ موکل کی طرف سے عدالت میں کسی قرضہ کی صحت کا اقرار کرے۔ بیرون عدالت وہ ایسے اقرار کا مجاز نہیں ہے اگر موکل کسی دعوے کے اقرار کی ممانعت کر دے تو وکیل یا مختار اس کی نسبت اقرار نہیں کر سکتا۔ جو جائداد بحق موکل ڈگری ہو اس پر قبضہ کرنے کا مختار یا وکیل عام طور سے مجاز نہیں ہے ÷

جائداد جو وکیل یا مختار کے قبضہ میں ہو | موکل کی جو جائداد وکیل یا مختار کے قبضہ میں بیع یا شراء یا ادائیگی قرضہ

یا قبضہ لینے کی غرض سے ہوگی وہ اس کے پاس امانت متصور ہوگی اور اگر وہ شے بغیر اس کے کسی قصور کے ضائع ہو جائے گی تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں سمجھا جائے گا۔

<u>وکیل کے فرائض بمقابلہ موکل کے</u> وکیل یا مختار پر لازم ہے کہ وہ اپنے موکل کی تمام ہدایات پر عمل کرے اگر وہ خلاف ورزی کرتا ہے تو موکل اس کا پابند نہ ہوگا موکل جو شرائط قیود عائد یا قائم کر دے اس کی پابندی بھی وکیل یا مختار پر لازم ہوگی۔ وکیل یا مختار کو کار وکالت کی انجام دہی میں موکل کے فائدہ کا حتی الامکان پورا لحاظ رکھنا چاہئیے اس بنا پر وہ مجاز نہیں ہے کہ جس جائداد کی خرید و فروخت کے لئے وہ مقرر کیا گیا ہے اس کو اپنے لیے خرید لے۔ وکیل یا مختار اس امر کا مجاز نہیں ہے کہ وہ اس کام کے لئے جس کے واسطے وہ مقرر کیا گیا ہے بغیر موکل کی صریح اجازت کے کسی دوسرے وکیل یا مختار کو مقرر کرے ۔۔۔۔۔

<u>وکالت کفالت اور حوالت میں فرق</u> ؎۱ ایک شخص کا اپنے کاروبار کو دوسرے شخص کے سپرد کر دینے اور اس کو اپنا قائم مقام مقرر کر دینے کا نام وکالت ہے

؎۲ حوالہ یہ ہے کہ زید کو ایک قرضہ بکر سے لینا ہے اور زید خود عمر کا مقروض ہے تینوں آدمی (زید۔ بکر۔ عمر) اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ عمر بجائے اس کے کہ اپنا قرضہ زید سے اور زید بکر سے وصول کرے عمر رقم قرض بکر سے وصول کرے گا ایسے انتقال حق تاں یا حق متعلقہ بذات کو حوالہ کہتے ہیں

؎۳ کسی مطالبہ میں ایک شخص کا اپنی ذمہ داری کو دوسرے شخص کی ذمہ داری میں شریک کر دینے کا نام معاہدہ

ہے یہ معاہدہ کسی شخص کے حاضر لانے

یا قرضہ کے ادا کرنے

یا کسی مال تحویجزہ کی تحویل

کے متعلق ہو سکتا ہے ممکن ہے وہ قطعی

ہو یا مشروط

ہو یا کسی آئندہ تاریخ پر منحصر ہو۔ معاہدہ کفالت کی نوعیت سے خود ظاہر ہے کہ قرض خواہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ ایفاء معاہدہ کے لیے اصل قرض دار یا کفیل

کو مجبور کرے

اس کا ان دونوں میں سے کسی ایک سے طلب ایفا کرنا اس کی طلب ایفاء کے حق کو بمقابلہ دوسرے شخص کے زائل نہیں کرتا جب تک کہ معاہدہ پورے طور سے ادا نہ ہو جائے اگر قرض خواہ اور کفیل میں باہم قرارداد ہو جائے کہ اصل قرض دار بری الذمہ رہے گا تو معاہدہ کفالت نہیں بلکہ معاہدہ حوالہ ہوگا۔

اصل قرض دار کی ذمہ داری میں جو تخفیف ہوگی یا اس کے ساتھ جو رعایت کی جائے گی اس کا فائدہ کفیل کو بھی پہنچے گا اور اگر اصل قرض دار کا قرضہ معاف کر دیا جائے تو کفیل بھی بری الذمہ ہو جائے گا اور اگر اصل

قرض دار کو مہلت دی جائے تو کفیل بھی اس سے مستفید ہو گا لیکن اس کے برعکس صحیح نہ ہوگا یعنی اگر کفیل یا ضامن بری الذمہ کر دیا جائے یا اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے تو اس سے اصل قرض دار کی ذمہ داری میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

وکالت کی اقسام

وکالت کی دو بڑی اقسام یہ ہیں (۱) وکالت قبضہ (۲) وکالت خصومت۔

شرع میں باہمی خصومت وجھگڑا منع ہے لیکن جس شخص نے خلاف حق، کسی مال عین یا دین میں اپنا استحقاق رکھا تو حق دار ضرور اپنے حق کے واسطے مخاصمہ کرتا ہے پس دونوں میں سے جو شخص ناحق ہو وہی گنہگار ہے کیونکہ حق دار تو اپنا حق مانگتا ہے پھر اگر مدعی نے اپنا حق ثابت کیا تو وہ کبھی دوسرے کو وصول حق کے واسطے وکیل کر دیتا ہے تو اس کو وکیل قبضہ کہتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نالش کرنے اور حق ثابت کرنے کے لیے کسی شخص کو اپنا وکیل مقرر کر دیتا ہے ایسے وکیل کو وکیل خصومت کہتے ہیں حقوق کی وصولیابی کی طرح حقوق کی ادائیگی کے لیے بھی وکیل مقرر کیا جا سکتا ہے۔ صرف حدود اور قصاص کے معاملات میں مستثنیات ہیں۔

حدود و قصاص میں وکیل مقرر نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اگر مؤکل عدالت میں موجود نہ ہو تو حدود و قصاص سے متعلق حقوق کی وصولیابی کے لیے وکیل کافی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حدود و قصاص شبہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مؤکل کی عدم موجودگی میں یہ شبہ بہرحال موجود رہے گا کہ اس نے معاف کر دیا ہو۔ بلکہ شریعت نے تو معافی کی ترغیب دی ہے۔ اس کی موجودگی میں بھی زیادہ قرین قیاس ہے کہ مؤکل نے معاف کر دیا ہو۔ [1]

وکیل مقرر کرنا کہاں ضروری ہو جاتا ہے اگر کوئی خاتون پردہ نشین ہو اور اس کی عادت باہر نکلنے اور عدالتوں میں آنے جانے کی نہ ہو تو امام ابوبکر احمد بن علی رازی الجصاص کی رائے میں اس کے لیے وکیل کرنا لازمی ہوگا اس لیے کہ اگر عدالت میں بغیر وکیل کے پیش ہوئی تو شرم اور جھجک کی وجہ سے بول نہ سکے گی اور اس کو وکیل کو مقرر کرنا پڑے گا۔ صاحب ہدایہ کا کہنا ہے کہ بعد کے فقہاء نے اس چیز کو خصوصیت سے پسند کیا ہے۔ [1]

کیا وکیل خصومت وکیل قبضہ ہو سکتا ہے ابوالحسن احمد بن محمد بن احمد جعفر المعروف امام قدوری (م ۴۲۸ھ)

اپنی مختصر میں فرماتے ہیں جو شخص وکیل خصومت ہے وکیل قبضہ بھی ہوتا ہے (چاہے مال عین ہو اور چاہے مال دین میں)، کیونکہ جو شخص کسی کام کا مجاز ہوتا ہے وہ اس کو پورا کرنے کا مجاز ہوتا ہے اور خصومت کا پورا کرنا بقبضہ ہے۔ تو وکیل خصومت کو اختیار ہے کہ قاضی کے حکم کے بعد مال متدعویہ پر قبضہ کر لے۔ امام زفرؒ بن ہذیل بن سلیم العنبری البصری ۔ م ۱۵۸ھ کی رائے اس کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ موکل تو اس کی خصومت کرنے پر یعنی پیروی نالش پر راضی ہوا ہے اور مال پر قبضہ کرنا خصومت کے سوا دوسری چیز ہے اور اس پر وہ راضی نہیں ہوا تو وکیل کو قبضہ کا کبھی اختیار نہیں ہے اس کو مشایخ بلخ او بصیر محمد بن احمد بن ابراہیم ابو لیث فقیہ سمرقندی المشہور بہ امام الہدیٰ (م ۳۷۳ھ) نے اس زمانہ میں اختیار کیا۔ اور آج کل فتوی امام زفرؒ کے قول پر ہے کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض وکیل کی خصومت پر اعتماد و اطمینان ہوتا ہے حالانکہ اس کے مال وصول کرنے کا اطمینان نہیں ہوتا تو اس کو وکیل خصومت کر سکتے ہیں اگرچہ وکیل قبضہ نہ ہو۔ اور اس مسئلہ کی نظیر یہ ہے کہ جو شخص تقاضی قرض کے واسطے وکیل ہو وہ اصل روایت پر بالاتفاق وصول قرضہ کا مختار ہے اس واسطے کہ لغت میں تقاضا معنی قبضہ قرض ہے لیکن عرف اس کے خلاف ہے اور وضع لغت پر عرف کو غالب رکھتے ہیں لہذا مشایخ کا فتوی یہ ہے کہ جو شخص تقاضی کا وکیل ہو وہ قرضہ وصول کرنے کا مختار نہیں ہے

امام محمدؒ م ۱۸۹ھ بن حسن بن فرقد الشیبانی نے جامع الصغیر میں فرمایا کہ اگر وکیل خصومت دو آدمی ہوں تو مال پر اس وقت قبضہ کر سکتے ہیں جبکہ دونوں متفق ہوں یعنی ساتھ ہی قبضہ کریں کیونکہ موکل تو دونوں کی مجموعی امانت پر راضی ہوا اور ایک کی امانت پر راضی نہیں ہوا اور قبضہ میں دونوں کا متفق ہو کر کام کرنا ممکن ہے برخلاف خصومت کے چنانچہ اوپر گذرا کہ قاضی کی عدالت میں دونوں وکیلوں کا خصومت پر متفق ہونا ممکن نہیں ہے ورنہ شور و غوغا ہوگا جب تک ایک خاموش نہ ہو لہذا خصومت کا اثبات و جواب صرف ایک وکیل سے متعین ہوا اور قبضہ کرنا دونوں سے ممکن ہے لیکن معلوم ہو کہ اس زمانے میں امانت غیر معتبر ہونے سے فتوی یہ ہے کہ دونوں قبضہ نہیں کر سکتے ہیں۔

<u>کفیل کے وکیل ہونے کے بارے میں بحث</u> امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ کسی نے کسی آدمی کی طرف مال کی کفالت کی پھر صاحب مال (یعنی مکفول لہ) نے کفیل کو اپنی طرف سے یہ مال اس آدمی سے وصول کرنے کا وکیل کیا تو اس معاملہ میں وہ کبھی وکیل نہ ہوگا اس واسطے کہ وکیل وہ شخص ہوتا

ہو غیر کے واسطے کام کرے یعنی غیر کے واسطے کام کرنا وکالت کا رکن ہے پس اگر مسئلہ مذکورہ کی وکالت ہم صحیح سمجھیں تو وہ اپنی ذات کے واسطے کام کرنے والا ہو جائے گا کیونکہ اس سے وہ بری الذمہ ہوتا ہے تو وہ وکالت کا رکن جاتا رہا اور اس لیے کہ وکالت کے واسطے اس کا قول قبول ہونا لازم ہے۔ کیونکہ وہ امین ہوتا ہے پس اگر مسئلہ مذکورہ میں وکالت صحیح ہو تو یہاں اس کا قول قبول نہ ہوگا مثلاً اس نے کہا کہ میں نے وصول کر کے دے دیا تو قول نہیں قبول ہوگا کیونکہ وہ ذات کا بری کرنے والا ہوگا تو جبکہ وکالت کے واسطے لازم تھی اس کے نہ ہونے سے وکالت بھی معدوم ہو گئی۔ کیونکہ جب لازم نہ ہو تو ملزوم بھی نہیں ہوتا ہے اور ہم نے دیکھا کہ وکیل کا قول قبول ہونا جو لازم وکالت ہے یہاں ندارد ہے تو معلوم ہو گیا کہ وکالت بھی ندارد ہے اور یہ مسئلہ نظیر مسئلہ غلام ماذون ہے کہ اگر مولیٰ نے اپنے غلام قرض دار کو جس کو تجارت کی اجازت دی تھی آزاد کر دیا حتی کہ قرض خواہوں کے واسطے اس کی قیمت کا ضامن ہوا تو غلام سے پورے قرضہ کا مطالبہ کرے گا پس اگر قرض خواہ نے اس کو غلام سے مال وصول کرنے کا وکیل کیا وکالت بدلیل مذکور بالا باطل ہے کیونکہ مولیٰ بقدر قیمت کے بری ہونے کا وکیل ہے اور شرح طحاوی میں مذکور ہے کہ اگر مولیٰ نے اپنے قرض دار غلام کو آزاد کیا تو جائز ہے اور قرض خواہوں کو اختیار ہے کہ چاہیں غلام سے قرض کا مطالبہ کریں اور چاہیں مولیٰ سے مقدار قرضہ یا قیمت میں سے جو کم ہے اس کا مطالبہ کریں پس حاصل یہ ہوا کہ اگر قرض خواہوں نے مولیٰ کو وکیل کیا کہ غلام سے ان کا قرضہ وصول کرے تو یہ وکالت اس وجہ سے نہیں جائز ہے مولیٰ خود بقدر قیمت کے ضامن ہے تو وہ اپنی برأت کے واسطے عامل ہوگا اور یہ جائز نہیں ہے ؛

مال ودیعت قبضہ کرنے کا وکیل امام قدوری فرماتے ہیں اگر ایک شخص نے کہا کہ میں ودیعت رکھوانے والے کی طرف سے ودیعت وصول کرنے کا وکیل ہوں پس مستودع نے اس کے قول کی تصدیق کی تو مستودع کو حکم نہیں دیا جائے گا کہ اس مدعی وکیل کو ودیعت دے دے اس واسطے کہ مستودع نے مال غیر کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ یہ اس مال ودیعت پر قبضہ کرنے کا وکیل ہے اور خود اپنے مال میں ایسا اقرار نہیں۔ بخلاف قرضہ کے اگر قرضہ عین مال سے ادا نہیں ہوتا بلکہ مثل سے ہوتا ہے تو گویا اپنا مال دیتا ہے پس قرضہ دار کا اقرار معتبر ہوتا ہے۔

اور ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میرا باپ مر گیا اور ودیعت کو میرے واسطے میراث چھوڑ گیا اور میرے سوا کوئی اس کا وارث نہیں ہے اور مستودع نے اس کے قول کی تصدیق کی تو مستودع کو حکم دیا جائے گا کہ مدعی کو سپرد کر دے کیونکہ مودع کی موت کے بعد مال ودیعت اس کا مال نہیں رہا اور اب مدعی و مستودع دونوں نے

اتفاق کیا کہ یہ وارث کا مال ہے اگر ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں نے مودع سے ودیعت خریدی ہے پس مستودع نے اس کے قول کی تصدیق کی تو اس کو حکم نہیں دیا جائے گا کہ مشتری کو ودیعت سپرد کرے اس واسطے کہ غیر یعنی مودع زندہ ہے تو مستودع کا تصدیق کرنا مال غیر کا اقرار ہے اس واسطے کہ غیر یعنی مودع ابھی تک مالک ہونے کی لیاقت رکھتا ہے تو مدعی اور مستودع کی تصدیق اس مودع پر نہیں ہوتی امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو اپنا مال وصول کرنے کا وکیل کیا پھر مدعی علیہ قرضدار کہا کہ مالک مال نے اپنا سب مال وصول کر لیا ہے تو مستودع کو حکم ہوگا کہ وکیل مذکور کو یہ مال سپرد کر دے اس واسطے کہ وکالت تو ان دونوں کی باہمی تصدیق سے ثبوت ہو گئی اور مال کو پورا وصول کرنا صرف وکیل مدعی کے قول سے ثبوت ہوتا ہے۔ پس حق دلوانے میں تاخیر نہ کی جاوے گی۔

مسئلہ قرضہ اور مسئلہ عیب مبیع میں فرق اور ان کے احکامات مسئلہ قرضہ اور مسئلہ عیب بیع سے متعلق بحث کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے فرمایا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں اگر کسی نے خریدی ہوئی باندی میں عیب پا کر ایک شخص کو پھیرنے کے واسطے وکیل کیا پس بائع نے دعویٰ کیا کہ مشتری اس عیب پر راضی ہوگیا تھا تو اس کو وکیل واپس نہیں کر سکتا ہے یہاں تک کہ مشتری سے قسم لی جاوے بخلاف مسئلہ قرض کے جو اوپر گذرا۔ چنانچہ وہاں قرضدار کو حکم دیا جاتا تھا کہ وکیل کو قرضہ دے دے بدون اس کے کہ قرض خواہ سے قسم لی جاوے کہ میں نے قرضہ وصول نہیں پایا پس دونوں میں فرق ہے۔ اس واسطے کہ قرضہ کے مسئلہ میں تدارک ممکن ہے بایں طور کہ جب قرض خواہ کی قسم سے انکار کرنے سے خطا ظاہر ہو تو جو کچھ وکیل نے وصول کیا ہے اس کو وکیل سے واپس لیا جا سکتا ہے اور عیب مبیع کے مسئلہ میں تدارک ممکن نہیں ہے کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر قاضی نے بیع فسخ کر دی تو برابر فسخ رہے گی اگرچہ ظاہر ہو جیسا کہ ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے اور اس کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مشتری سے قسم نہیں لی جاوے گی کیونکہ یہ کچھ مفید نہیں ہے یعنی جب حکم قاضی کی وجہ سے بیع ظاہر و باطن میں فسخ ہو گی تو پھر مشتری سے قسم لینا بے فائدہ ہے کیونکہ اس کے بعد فسخ کرنا منسوخ نہیں ہو سکتا ہے اگرچہ مشتری قسم سے انکار کرے اور معلوم ہو جاوے کہ وہ عیب پر راضی ہو چکا تھا یہ فرق امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے۔

اور صاحبین کے نزدیک یہ ہے کہ صورت قرضہ و صورت عیب مبیع دونوں صورتوں میں یکساں جواب ہونا چاہیئے یعنی حکم میں تاخیر نہ کی جاوے یعنی وکیل کو قرضہ دلوایا جائے اور بائع کو مبیع واپس دی

جائے اس واسطے کہ صاحبین کے نزدیک تدارک دونوں صورتوں میں ممکن ہے کیونکہ جب خطا ظاہر ہو تو حکم قضا باطل ہو جاتا ہے پس اگر قرض خواہ نے اگر وکالت سے انکار کیا تو مدیون نے جو کچھ دیا ہے وکیل سے واپس لے گا اسی طرح جب وکیل کے دعوے سے بائع کو مبیع واپس دی گئی پھر مشتری کی حاضری سے معلوم ہوا کہ وہ عیب پر راضی ہو گیا تھا تو ظاہر ہوا کہ حکم قاضی باطل تھا پس بیع بحال ہوگی اور واپسی تو ڑ دی جائے گی۔ اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اصح یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تاخیر دی جائے کیونکہ ابو یوسفؒ انتظار معتبر رکھتے ہیں یہاں تک کہ مشتری سے قسم لی جائے بشرطیکہ بدوں رضا کے بائع کی وہ حاضر ہو تو نگہداشت کے واسطے انتظار کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ وکالت قرضہ کی صورت میں اگر قرض خواہ نے انکار کیا یا وکالت بیع کی صورت میں مشتری کے عیب پر رضامندی ثابت ہوئی تو قاضی کا حکم ٹوٹے گا جیسے مدعی و مدعا علیہ کے واسطے تاخیر ہوگی تاکہ حکم قاضی ٹوٹنے سے محفوظ رہے۔

وکیل خرید کے بارے میں ۱۰ کا ۱۲ وکیل خرید کے بارے میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر زید نے بکر کو دس درہم اس واسطے دئے کہ زید کے بال بچوں پر خرچ کرے۔ پس اس نے اپنے پاس سے دس درہم خرچ کر دئے۔ تو یہ دس درہم بعوض ان دس کے ہو جائیں گے اس واسطے کہ یہ وکیل بالاتفاق وکیل خرید ہے اور اس کا حکم وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور بعض..... مشائخ نے کہا کہ یہ استحسان ہے اور قیاس مقتضی ہے کہ اس کو بدلنا جائز نہیں ہے اور وہ اپنے دس درہم خرچ کرنے میں احسان کرنے والا ہو جائے گا پس موکل سے جو دس درہم لیے اسکو واپس کر دے یعنی اگر قرض دار نے ہزار درہم اپنے وکیل کو دیے تاکہ قرض خواہ کو اس کے ادا کرے وکیل نے ان درہموں کے علاوہ اپنے پاس درہم ہزار ادا کیے تو قیاس مقتضی ہے کہ وکیل نے احسان کیا اس واسطے کہ ادائے قرض بمعنی خرید نہیں ہے بلکہ یہی درہم دینا لازم ہے اور اگر خرید ہوتا تو البتہ اس کا ثمن بذمہ وکیل ہوتا اس کو اختیار ہوتا کہ ان کی مثل ادا کر دے کیونکہ وہ وکیل کے ذمہ قرضہ ہوتے اور جب وہ بذمہ وکیل ہوتے تو لامحالہ وکیل اپنے مال سے بطور تبرع ادا کرنے والا ہو گیا کیونکہ درہم اس کے ذمہ قرضہ لازم نہیں کر سکتے بخلاف اس کے اگر دس درہم اپنے بال بچوں پر خرچ کرنے کے واسطے وکیل کیا تو خرچ کرنا متضمن خرید ہے یعنی ان درہموں سے خرید کر کے صرف کرے گا اور خرید سے جو ثمن اس کے ذمہ واجب ہوا وہ بعینہ درہم نہیں ہیں

بلکہ ان کے مثل ہیں لہذا اچھا ہے اپنے مال سے دے دے اور کچھ احسان نہ ہوگا کیونکہ وکیل کو اختیار ہوتا ہے کہ اس نے جو ثمن ادا کیا ہے وہ موکل سے لے لیوے لے

وکیل کا معزول کرنا امام قدوری اپنی مختصر میں فرماتے ہیں موکل کو اختیار ہے کہ اپنے وکیل کو وکالت سے معزول کر دے اس واسطے کہ وکالت تو موکل کا حق ہے پس اس کو اختیار ہے کہ اپنا حق مٹا دے لیکن اگر وکالت سے کسی غیر شخص کا حق متعلق ہوا تو بغیر اس کی رضامندی کے معزول نہیں کر سکتا مثلاً طالب مدعی کی درخواست سے نالش و خصومت میں وکیل کیا ہو تو بغیر اس کی رضامندی کے معزول نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے میں غیر کا حق مٹانا لازم آتا ہے اور یہ مانند اس وکالت کے ہو گئی جس کو عقد رہن متضمن ہوتا ہے مثلاً زید نے بکر سے ہزار روپیہ قرض لیکر اپنا باغ اس کے پاس رہن رکھا مگر یہ باغ دونوں کے اتفاق سے ایک شخص ثالث عادل کے پاس جس پر دونوں کا اعتماد ہے رکھا گیا اس شرط سے کہ دو سال کے اندر یہ روپیہ ادا کرے گا لیکن نہ کر سکا اور راہن نے بخواہش مرتہن اس عادل کو وکیل کیا کہ وہ اس باغ کو فروخت کر کے مرتہن کا روپیہ ادا کرے تو یہ وکالت متضمن رہن ہے جس سے مرتہن کا حق متعلق ہے لہذا اگر راہن نے چاہا کہ اس درمیان عادل کو وکالت سے معزول کرے تو اس کو یہ اختیار نہیں اور وہ معزول نہ ہوگا اس طرح قاضی کی کچہری میں مدعی کی درخواست پر مدعا علیہ نے وکیل خصومت دیا تو بغیر رضامندی مدعی کے اس کو معزول نہیں کر سکتا یہ اس وقت ہے کہ مدعی کی درخواست پر وکیل کیا ہوا اور اگر بغیر درخواست ہو تو جب چاہے معزول کرے اور واضح ہو کہ وکیل کو خبر پہنچنا ضروری ہے

وکیل کو اس کی معزولی کا نوٹس دینا لازمی ہے۔ امام قدوری فرماتے ہیں پھر اگر وکیل کو معزول ہونے کی خبر نہیں پہنچی تو وہ برابر اپنی وکالت پر باقی رہے گا کیونکہ معزول کرنے میں وکیل کا ضرر ہے خواہ اس راہ سے کہ اس کی ولایت باطل کی گئی یعنی بغیر آگہی کے یا اس راہ سے کہ وکیل جانب حقوق راجع ہوں گے تو خریدی کی صورت میں موکل کے مال سے ثمن دے گا اور بیع کی صورت میں مبیع کو سپرد کرے گا پس اس صورت وہ ثمن یا بیع کا ضامن ہوگا اس سے نقصان اٹھائے گا حالانکہ شرعاً اس کے ذمہ سے ضرر دفع کیا گیا ہے وہ اس طرح پر کہ بغیر اس کی آگاہی کے اس کو معزول کرنا صحیح نہیں ہے اور وجہ قول کی دلیل سے خواہ وکیل نکاح ہو یا دوسرے وکیل ہو سب برابر ہیں

وکیل کا خود معزول ہو جانا یہاں تک تو وکیل کے معزول کرنے کا بیان تھا اور بعض صورتوں میں وکیل جو معزول ہو جاتا ہے جب کہ وکالت باطل ہو جائے اور اس کی کئی صورتیں ہیں ۔

وہ صورتیں جن میں معاہدہ وکالت کالعدم ہو جاتا ہے قدوری اپنی مختصر میں فرماتے ہیں۔ وکالت باطل ہو جاتی ہے اگر موکل مر جائے یا اسکو جنون مطبق ہو جائے (یعنی دائمی طور پر پاگل ہو جائے) یا وہ مرتد ہوکر دار الحرب میں مل جائے ۔

موکل میں پیدا ہونے والے عوارض اس واسطے کہ وکیل میں ایک تصرف غیر لازم ہے تو اس تصرف کے دوام کو اس کی ابتداء کا حکم ہے پس حکم قائم رہنا ضروری ہے حالانکہ وہ ان عوارض سے مٹ گیا تو صحیح یہ کہ وکیل کرنا کوئی ایسا تصرف نہیں جو لازم ہو جاتا ہے بلکہ ہر ایک موکل و وکیل کو توڑنے کا اختیار حاصل ہے پس ایسا جب تصرف ٹھہرا تو اس وکیل کی ابتدا میں جو بات چاہیئے وہ برابر باقی رہنے کے واسطے بھی ضروری ہے اور ابتداء میں موکل کا حکم چاہیے تو ضرور ہوا کہ اس کا حکم باقی رہے تب تو توکیل باقی رہے حالانکہ جب موکل مر تو اس کا حکم بھی معدوم ہوا تو اسی طرح جنون مطبق میں اور مرتد ہوکر دار الحرب سے مل جانے میں بھی حکم کالعدم ہے پس ان سب صورتوں میں توکیل مٹ جائے گی ۔ اور یہ شرط لگائی کہ جنون مذکور ایسا ہو جس کو مطبق کہتے ہیں اس واسطے کہ قلیل جنون بمنزلہ بے ہوش ہو جانے کے ہے حتی کہ اگر برابر ایک ماہ رمضان بھر تمام جنون رہا تو اس پر قضا نہیں ہے اس طرح اس کی توکیل بھی ساقط ہے کیونکہ جب وہ لائق خطاب الہی بعبادات نہیں ہے تو دنیاوی معاملہ بھی ساقط ... ہے اور امام ابو حنیفہؒ سے شیخ جصاص رازیؒ نے روایت کیا اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ جنون مطبق ... ایکسال کامل ہے کیونکہ ایک سال تک مجنون ہونے میں جمیع عبادات ساقط ہو جاتی ہے یعنی زکوٰۃ و حج بھی ساقط ہوتی ہے تو اسی مدت سے احتیاطاً اندازہ کیا گیا ۔

وکیل میں پیدا ہونے والے عوارض امام قدوریؒ اپنی مختصر میں فرماتے ہیں جب وکیل مرگیا یا اس کو جنون مطبق ہو گیا تو وکالت باطل ہو گئی اس واسطے کہ وکیل کا مامور رہنا اس کے جنون ہونے اور مر جانے کے بعد صحیح نہیں ہے ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ وکالت جب ہی باقی رہتی ہے کہ موکل کا حکم دینا اور وکیل کا مامور ہونا برابر صحیح رہے تو جب موکل کا حکم صحیح نہ رہے خواہ اس وجہ سے کہ موکل میں لیاقت نہیں رہی یا اس وجہ سے کہ وکیل میں لیاقت نہ رہی تو توکیل باطل ہو گئی ۔ پس وکیل کے مرنے یا جنون

ہونے پر وکالت جاتی رہی جب کہ جنون مطلق ہو ورنہ خفیف بمنزلہ خواب کے ہے اور اگر وکیل مرتد ہو کر دار الحرب میں مل گیا تو اس کا تصرف جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ مسلمان ہو کر واپس آوے (یعنی دار الاسلام میں چلا آوے) تو وہ وکالت پاوے گا۔

موکل کا وکیل کے سپرد کئے گئے کام کو خود کر لینا اور اس کا اثر | امام قدری اپنی مختصر میں بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی دوسرے کو کسی کام کے واسطے وکیل کیا پس جس کام کے واسطے وکیل کیا تھا اس کو خود کر لیا تو وکالت باطل ہو گئی ۔ یہ کلام بہت سی صورتوں کو شامل ہے مثلاً ایک یہ کہ اپنا غلام آزاد کرنے کے واسطے وکیل کیا ۔ دوم یہ کہ اپنا غلام مکاتب کرنے کے واسطے وکیل کیا پھر موکل نے بذات خود یہ غلام آزاد یا مکاتب کر دیا ۔ سوم یہ کہ وکیل کو کوئی خاص عورت بیاہنے کے واسطے یا کوئی معین چیز خریدنے کے واسطے وکیل کیا پھر یہ کام خود کر لیا ۔ چہارم یہ کہ اپنی زوجہ کو طلاق دینے کے واسطے وکیل کیا پھر موکل نے خود اس کو تین طلاقیں دے دیں یا ایک طلاق دی اور اس کی عدت گذر گئی پنجم یہ کہ اپنی عورت کو خلع دینے کے واسطے وکیل کیا پھر موکل بذات خود اس کو خلع دے دیا تو ان سب صورتوں میں وکالت باطل ہو گئی کیونکہ جب موکل نے بذات خود تصرف کر لیا تو وکیل پر تصرف کرنا متعذر ہو گیا پس وکالت باطل ہو گئی حتی کہ اس کے بعد موکل نے اس عورت سے نکاح کیا اور اس کو طلاق سے بائنہ کر دیا تو وکیل کو اختیار نہ ہوگا کہ موکل کے ساتھ اس عورت کا نکاح کر دے کیونکہ حاجت پوری ہو چکی ۔ بخلاف اس کے اگر وکیل نے خود اس عورت سے نکاح کر کے اس کو بائنہ کر دیا تو وکیل کو اختیار ہے کہ اسکو موکل کے ساتھ بیاہ دے کیونکہ ابھی حاجت باقی ہے ۔[1]

خلاصۃ الکلام | مختصر یہ کہ موکل کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اپنے وکیل یا مختار کو علیحدہ کر دے اور اسی طرح وکیل یا مختار کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے وکالت یا مختاری سے علیحدہ ہو جاوے فریقین میں سے کسی ایک کی موت یا اس کام کے ختم ہو جانے پر وکالت یا مختاری کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن اگر ایک دوسرے سے حقوق کا تعلق ہو گیا ہے مثلاً ایک قرض دار نے اپنی جائیداد رہن کر دی اور بر وقت معاہدہ یا وعدہ گزر جانے سے پہلے جائیداد مرہونہ کی فروخت کے لئے کسی وکیل یا مختار کو مقرر کر دیا تو وہ بغیر (دفعہ ۲۰۲) رضامندی مرتہن کے اس کو موقوف نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایسی صورت میں وکالت یا مختاری موکل کی موت پر ختم ہوتی ہے اور نہ وکیل ایک مرتبہ وکالت کو منظور کر لینے کے بعد اس سے سبکدوش ہو سکتا

کوائف جامعۃ الرّشاد

رجب کے وسط میں جامعۃ الرشاد کے عربی درجات کے طلبہ کے درمیان عربی اور اردو تقریر و تحریر میں مقابلہ ہوا جس میں طلبہ نے پورے ذوق و شوق سے حصّہ لیا، بعض طلبہ نے عربی اور اردو تقریر و تحریر میں امید سے زیادہ صلاحیت کا ثبوت دیا ایسے تمام طلبہ کی ہمّت افزائی کی گئی اور انعامات دیئے گئے۔ انشاءاللہ جلد ہی طلبہ اس کا ایک الگ مجموعہ شائع کریں گے۔ پروگرام کے کامیاب کرنے میں مولانا احمد کمال رشادی ندوی اور مولانا نسیم احمد صاحب اصلاحی کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے۔

کئی سال کے بعد اس سال فضیلت کا آخری درجہ یعنی دورہ کے سال ۹، ۱۰ طلبہ داخل ہوئے جن میں سے چھ طالب علم امتحان میں شریک ہوئے اور ان میں بیشتر کامیاب ہوئے اسی طرح درجہ حفظ و قرآت سے چھ لڑکے حافظ ہوکر نکلے کئی سال سے جلسۂ دستاربندی نہیں ہوسکا تھا امسال خیال تھا کہ جلسۂ دستاربندی کی مبارک مجلس منعقد کیجائے اور اس کے لئے شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی اور مولانا اکرام علی صاحب شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل کو دعوت دی گئی تھی اور ان حضرات نے منظور بھی کر لیا تھا مگر صوبائی بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی طرف سے بابری مسجد کی بازیابی کے لئے ۱۹ر اپریل کو اجودھیا چلئے پھر ۳۰ر اپریل ۱۹۸۶ء کو ہر ضلع میں گرفتاری دینے کا پروگرام بھی بن گیا تھا

چونکہ راقم الحروف کو ضلع اعظم گڈھ کی ایکشن کمیٹی کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور مدرسہ ہی اس تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے اس لئے ان مشغولیتوں کیوجہ سے انتہائی افسوس کے ساتھ دستار بندی کے پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا، اور مولانا اعظمی کو زبانی اور مولانا اکرام علی صاحب کو تار کے ذریعہ التواء کی اطلاع دی گئی اگر کوئی نئی بات پیدا نہ ہوئی تو انشاء اللہ کسی دوسرے وقت یہ مبارک تقریب منعقد ہو جائے گی۔

بحمداللہ مدرسہ کا کتب خانہ پہلے سے ہی اچھا تھا مگر اس سال عزیزی محمد عامر رشادی متعلم مدینہ یونیورسٹی کی کوشش سے تفسیر و حدیث اور دوسرے اسلامی موضوعات کی کئی سو اہم کتابیں آگئیں جن سے کتبخانہ کی علمی زینت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مثلاً عمدۃ القاری، بذل المجہود، الفتح الربانی، تاریخ التراث العربی مصنف عبدالرزاق مصنف ابن ابی شیبہ، الاعلام، تاریخ بغداد، تفسیر فتح القدیر، اضواء البیان، الملل والنحل لابن حزم، مقدمہ ابن خلدون، جمہرۃ خطب العرب، طبقات الشافیہ، الجرح والتعدیل مکمل، کنز العمال، الروض المرجع ۶ جلدیں انکے علاوہ اور بھی بہت سی اہم اور قیمتی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔

(بقیہ صـــ کا)

وکیل بعد علیحدگی کے بھی جہاں تک کہ فریق ثالث کے حقوق کا تعلق ہے، اپنی کارروائی کا مؤکل کو پابند کر سکتا ہے جب تک کہ اس کی علیحدگی کا اعلان نہ ہو جائے[1]

---

[1] المحلی۔ ص ۲۴۸۔

اعلان داخلہ

بحمداللہ جامعۃ الرشاد شہر اعظم گڑھ میں اعلیٰ دینی عربی تعلیم کے ساتھ جدید علوم اور انگریزی زبان بھی بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہے اس کی فضیلت کی سند۔ مدینہ یونیورسٹی، جامعۃ الامام محمد بن سعود اور جامعہ ام القری میں تسلیم شدہ ہے اس کی فضیلت کی سند کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے براہِ راست ایم اے میں اور جامعہ ملیہ دہلی نے عالمیت کی سند کو بی، اے میں داخلہ کے لئے منظور کر لیا ہے۔

عربی درجات اور درجہ حفظ و قرأت اور مکتب و نرسری اسکول میں ۱۰ر شوال سے داخلہ شروع ہو جائے گا، جو طلبہ داخلہ چاہتے ہوں وہ ۲۵ر رمضان تک اپنی درخواست بھیجدیں۔ فضیلت کے آخری سال یعنی دورہ میں صرف ۱۰ نئے لڑکے داخل کئے جائیں گے اور قرآن پاک اور حدیث میں تخصص کے لئے ۵ - ۵ طلبہ کا داخلہ ہوگا تخصص میں کسی بھی درسگاہ کے باصلاحیت فارغ طلبہ ہی لئے جائیں گے۔

مکتب اور نرسری اسکول میں کوئی وظیفہ نہیں ہے۔

مہتمم جامعۃ الرشاد
شہر اعظم گڑھ۔ یوپی

Regd. No AZM / N. P 42 / 84 Phone :-2483
Regd. No. R. N 38937 / 81

Monthly Jameatur Rashad
Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب جو پرائمری اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں .... ادارے کا خرچ .... ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپیہ کے قریب ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنے کے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اسکا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہو جاتا ہے۔

افضل تصویر پریس مئو

جون ۱۹۸۶

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ جامعۃ الرشاد

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمہ

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
یا ۱۲/ پونڈ

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد جامعۃ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 25/-
خصوصی معاون ۱۰۰/-
قیمت فی پرچہ 2/50

جلد ۱۲ | جون ۱۹۸۶ء مطابق شوال المکرم سنہ ۱۴۰۶ھ | شمارہ ۵۹

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر تبلیغ و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ثناء ندوی

مطبوعہ: افضل نعیمی پریس مئو
کتابت: علی برادران ڈھوبیا ٹولہ مئو

رشحات

ہندوستان کو آزادی ملے ہوئے سینتیس برس گذر چکے ہیں، اس پوری مدت میں ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں سطحی ہمدردی دکھا کر مسلمانوں کا سیاسی استحصال کرتی رہی ہیں، مگر جب بھی فرقہ وارانہ فسادات مسلمانوں کی زبان، تہذیب، اور ان کے پرسنل لاء کا مسئلہ سامنے آیا ہے تو تمام سیاسی اختلافات کو بھلا کر حکمراں جماعت کے ساتھ یہ پارٹیاں اس کے خلاف آواز اٹھاتی رہی ہیں، اردو زبان کو کانگریس نے دیس سے نکال دیا اور تمام سیاسی پارٹیاں اس کی ہم آواز رہیں،

نصاب تعلیم میں شریعت اسلامی اور تہذیب اسلامی کے سراسر خلاف مضامین بھر دیئے گئے، غلط قسم کی تاریخیں لکھی گئیں اور نصاب میں داخل کر دی گئیں، مسلم پرسنل لاء کے ایک ایک حصہ کو آہستہ آہستہ یا تو ختم کر دیا گیا یا مجروح کر دیا گیا، مسلم یونیورسٹی پر حملہ کیا گیا، بابری مسجد جو پانچ سو سال سے مسجد کی حیثیت سے باقی ہے اس کو رام جنم بھومی بنانے کی ناپاک کوشش کی گئی، ملازمتوں اور خاص کر اہم جگہوں پر مسلمانوں کا تناسب جس تیزی سے گھٹ رہا ہے اس کو ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، آزادی سے پہلے پورے یوپی میں کلکٹر اور جج آدھے سے زیادہ مسلمان ہوتے تھے مگر آج یہ تناسب ایک فیصدی رہ گیا ہے۔

آپ بتائیں کہ ان میں سے کسی ایک مسئلہ پر واقعی کسی سیاسی پارٹی نے کوئی مہم چلانا تو الگ بات رہی کھل کر مسلمانوں کی حمایت کی؟ الکشن مینفسٹو میں

تو ہر پارٹی اردو زبان اور مسلمانوں کے پرسنل لاء میں مداخلت نہ کرنے کی بات کرتی رہی ہو مگر عملاً ایک دن بھی اس پر عمل نہیں ہوا، لوک دل کے سب سے بڑے لیڈر چرن سنگھ اور یوپی کے ایک سابق کانگریسی وزیر داسدیو سنگھ کھل کر اردو زبان کو غیر ملکی قرار دیتے رہے ہیں، آج تک کسی پارٹی کے لیڈر کو مسلم پرسنل لاء کی حمایت میں ایک لفظ کہنے کی توفیق نہیں ہوئی، بابری مسجد پر بعض لیڈر اس وقت بولے جب بارہ بنکی میں معصوم مسلمانوں کا خون بہہ گیا، چھوٹے چھوٹے مسائل میں جیل بھرو تحریک چلائی جاتی ہے، مگر سینتیس ۳۷ برس میں ہزاروں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ احمد آباد، مراد آباد، راوڑکیلا اور آسام میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اور کروڑوں کی املاک تباہ ہوئیں لیکن سیاسی جماعتیں ہمدردی کیا کرتیں الٹے مسلمانوں ہی کو قصوروار ٹھہراتی رہیں اور آج تک کسی ایک فساد میں بھی ہندوؤں کو قصوروار نہیں ٹھہرایا گیا اور نہ پی اے سی کے نوجوانوں نے تلاشی کے نام پر انکے گھروں اور دوکانوں کو لوٹا۔ یہ تباہی صرف ہمیشہ مسلمانوں کے حصہ میں آئی۔

ڈیڑھ سال سے رام جانکی رتھ پورے ملک میں چکر لگاتا رہا اور زہر پھیلاتا رہا، اسکے ساتھ جو نعرے لگائے جاتے تھے اور دیواروں پر لکھے جاتے تھے یا لکھے گئے ہیں وہ نہ صرف قانونی اعتبار سے قابل گرفت تھے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی انتہائی نازیبا نعرے تھے۔ ان کے بعض نعرے یہ تھے:

گن گن کر بدلہ لیں گے بابر کی سنتان سے، جس ہندو کا خون نہ کھولے خون نہیں وہ پانی ہے۔ ہندوستان میں رہنا ہوگا تو بندے ماترم کہنا ہوگا، وغیرہ وغیرہ

فرقہ واریت کی ہر پارٹی برائی کرتی ہے مگر اتنی ننگی فرقہ واریت اور کھلی ہوئی مسلم مخالف جارحیت کے خلاف کسی سیاسی پارٹی نے کوئی مہم چلائی، کوئی احتجاج کیا؟ کمیونسٹ پارٹی جو مسلم پرسنل لاء کے خلاف پوری مہم چلا رہی ہے اس کو اس رام جانکی رتھ کی کوئی بات قابل اعتراض نظر نہیں آئی، یہی وہ واحد پارٹی ہے جس نے آزادی سے پہلے ہندوستان چھوڑو تحریک کے سلسلہ میں جب ہمارے تمام لیڈر جیل میں تھے تو یہ برطانیہ کی حمایت میں پورے ہندوستان میں نعرے لگا رہی تھی، جب ویٹنام پر امریکی

بھاری ہوئی تھی تو اسے سامراجی ظلم دکھائی دے رہا تھا، اور ان کے خلاف نعرے لگانے میں ان کی حلق سوکھ رہی تھی، مگر افغانستان میں سات برس سے مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے تو یہ روسی ایجنٹ دم سادھے بیٹھے ہیں بلکہ اس کی تائید کر رہے ہیں اسی طرح حکمران جماعت کے افراد اپنی سیاسی مصلحت کے تحت اسرائیل کی مذمت کرتے رہے مگر افغانستان میں روسی مداخلت کی کبھی کھل کر مذمت نہیں کی۔

کسی کو کیا خبر بسمل کے دل پر کیا گزرتی ہے
یہاں سب ہیں خم ابروئے قاتل دیکھنے والے

یہ باتیں جذبات اور نفرت پیدا کرنے کی غرض نہیں بلکہ اس لئے پیش کی جارہی ہیں کہ کسی نیشنل سیاسی پارٹی کے سہارے ابتک نہ ہمارا کوئی مسئلہ حل ہوا ہے اور نہ ہوگا، مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی انتہائی کوشش سے ان کے حوالہ ہوئی، دفعہ ۱۲۵ میں تنہا مسلمانوں کی کوشش سے ترمیم ہوئی، بابری مسجد کے سلسلہ میں مسلمانوں کی قربانی ہی حکومت کو کوئی نہ کوئی منصفانہ فیصلہ کرنے پر انشاء اللہ مجبور کرے گی، دفعہ ۴۴ کے ذریعہ پورے مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہو چکی ہے، نصاب تعلیم وغیرہ میں اسلامی تعلیم کے خلاف مضامین شامل کئے جا چکے ہیں، تاریخی کتابوں میں نفرت کے جذبات بھرے جا چکے ہیں، اگر مسلمان ان سب میں تبدیلی یا اصلاح چاہتے ہیں تو اس سلسلہ میں بھی آپ کو متحد ہو کر قربانی دینی ہوگی، اور آپ کی قربانی ہی ان مسائل کو حل کر سکتی ہے۔

جو سیاسی اور مفاد پرست لوگ ان مسائل سے مسلمانوں کی توجہ ہٹا کر معمولی معمولی مسائل میں ان کو الجھا رہے ہیں اور آپس میں اختلاف پیدا کر رہے ہیں ان سے مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہئے اور انہیں رد کر دینا چاہیئے ہر تحریک میں

کچھ لوگ میر صادق و جعفر کا رول ادا کرتے رہے ہیں ان ظالموں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے یہ لوگ اپنی ذات اور اپنے مفاد کیلئے پوری ملت کو بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ مسلمانوں کو چاہئیے کہ اپنے مسائل کے سلسلہ میں سیاسی افراد کو قریب نہ آنے دیں یہ اتنے بڑے ظالم اور سیاہ قلب لوگ ہیں کہ مظلوم کا نہیں بلکہ ظالم کا ساتھ دینے کے عادی ہیں، ان کو کسی کے چاک دامانی کی فکر نہیں، وہ صرف اپنے پیرہن کی سلامتی چاہتی ہے۔

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں مسلمانوں کا جو کنونشن لکھنؤ میں بلایا تھا اس میں انہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ مسلمان اپنا الگ سیاسی وجود ختم کر دیں اور وہ مختلف نیشنل سیاسی پارٹیوں میں شامل ہو جائیں اور انہی کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرائیں، ممکن ہے کہ مولانا کا یہ مشورہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے صحیح رہا ہو مگر ۳۰ برس کے تجربہ کے بعد تو مسلمانوں کی ملی زندگی کیلئے یہ مشورہ موت کا پیغام معلوم ہوتا ہے۔

اس پوری مدت میں نیشنل پارٹیاں اپنے اپنے مفاد کیلئے مسلمانوں کو نہ صرف استعمال کرتی رہی ہیں، بلکہ ان کے ملی اور دینی احساس کو بھی کچلتی رہی ہیں، آج ان پارٹیوں کے ایم، پی۔، ایم، ایل، اے ہی نہیں بلکہ ان کے سرگرم ممبروں سے بھی بات کیجئے تو وہ کھل کر دین و ملت کی بات کرنے میں گھبراتے ہوئے نظر آئیں گے، وہ مسلمانوں کے مجمع میں تو ہمدردی اور حمایت کی بات کر دیں گے لیکن اسمبلی اور پارلیمنٹ میں ان کی زبانوں پر تالے پڑ جاتے ہیں، آپ مسلم پرسنل لاء

اور بابری مسجد اور بہت سے دوسرے مسائل کے سلسلہ میں اسکا تجربہ کر چکے ہیں، اسلئے ہم کو مولانا آزاد کے اس مشورہ کو نہ صرف رد کر دینا چاہئے بلکہ مسلمانوں کی موجودہ بیداری سے فائدہ اٹھاکر اپنی وحدت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ وحدت سیاسی اغراض کے تحت نہیں بلکہ ملی مفاد کے تحت قائم کرنا ضروری ہے، اس کیلئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ مسلم "مجلس مشاورت" جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مشترکہ ادارہ ہے جس کو ۷۵ فیصدی مسلمانوں کی حمایت حاصل رہ چکی ہے اگر ہم کوشش کریں تو آج بھی اسے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہمارے رہنما ان حالات میں اسکی اہمیت کو محسوس کریں، خاص طور پر اگر ہمارے محترم مولانا اسعد صاحب اپنے جماعتی تشخص کے ساتھ اسکی اہمیت کو محسوس کر لیں تو شاید یہ کام آسانی سے ہو جائے ہم ۳۷ برس سے دوسروں کے سہارے اپنے مسائل کے حل کا تجربہ کرتے رہے ہیں اور اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں ایک بار ہم یہ تجربہ بھی کر کے دیکھیں اس تجربہ کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ہمارے ممبروں کا تناسب گھٹ جائے مگر انشاء اللہ ہمارا اصلی وزن اس سے بڑھ جائیگا

ہے دشت اب بھی دشت مگر خون پائے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

اس تجربہ کے سلسلہ میں فرقہ واریت کے بڑھنے کا ہوا کھڑا کیا جائے گا، ہندوستان کی دوسری تقسیم کا مسلمانوں پر الزام لگایا جائے گا، ان کو دیش دروہی کہا جائے گا مگر ہم تو یہی کہیں گے۔

ارے سود و زیاں دیکھا نہیں جاتا محبت میں
یہ سودا اور سودا ہے، یہ دنیا اور دنیا ہے

خوشی کی بات ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور ملت کے دوسرے دردمند افراد کی کوششوں اور مسلم عوام کے پرشور احتجاجوں سے فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے سلسلہ میں ایک ترمیمی بل پارلیمنٹ سے

پاس ہوگیا مگر کچھ لوگ اس کے بعض حصے سے اختلاف کر رہے ہیں، لیکن راقم الحروف کے خیال میں جس شدید مخالفت کے ماحول میں یہ بل پاس ہوا ہے اب اسکی مخالفت کرنا کسیطرح مناسب نہیں ہے۔

دفعہ ۱۲۵ ۱۹۷۳ء میں بنی تو مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں نے اسوقت اسکی مخالفت کی اور ان کی شدید مخالفت کے نتیجہ میں اندرا گاندھی نے دفعہ ۱۲۷ پاس کرا کے مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تھا، مگر اپریل ۱۹۸۵ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ نے ایک مسلمان عورت شاہ بانو کے مقدمہ میں جو فیصلہ دیا اس نے دفعہ ۱۲۷ کو نظر انداز کر کے دفعہ ۱۲۵ کے تحت یہ فیصلہ دیدیا کہ مطلقہ عورت عدت کے بعد بھی اسوقت تک اپنے پہلے شوہر کی بیوی سمجھی جائیگی جبتک وہ دوسری شادی نہ کر لے یا اسکی موت نہ ہو جائے اور اسوقت تک سابق شوہر اسکا خرچ برداشت کرتا رہے گا۔ جج صاحب نے صرف یہ فیصلہ ہی نہیں کیا بلکہ یہ بھی فرمادیا کہ قرآن کے رو سے یہی صحیح ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ دفعہ ۴۴ پر پورے طور پر عمل کیا جائے یعنی پورے ہندوستان کے باشندوں کیلئے یکساں سول کوڈ بنا دیا جائے۔

اسی فیصلہ کے خلاف مسلم پرسنل لاء بورڈ اور عام مسلمانوں کے پر شور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں یہ بل پاس ہوا، اس بل میں مطلقہ عورت کی تعریف شریعت کے مطابق کر دی گئی ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عدت کے بعد سابق شوہر پر اسکے نان نفقہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مخالفین کی طرف سے سب سے زیادہ عورت کے بے سہارا ہونے کی رٹ لگائی گئی تھی اسلئے بل میں نان نفقہ کی وہ شرعی ترتیب قائم رکھی گئی ہے جو فقہ کی کتابوں میں درج ہے، اب اس کے بعد یہ بات کہدی گئی ہے کہ اگر کوئی میاں بیوی دفعہ ۱۲۵ کے تحت نان نفقہ کا کوئی معاہدہ کر لیں تو ان کو اختیار ہے، ظاہر ہے کہ اوپر کی تفصیل کے بعد اس شق کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی اور اگر کوئی مرد اخلاقی طور پر اپنی طرف سے اپنی سابقہ بیوی کو کچھ دینا چاہتا ہے تو اس سے کونسا شرعی حکم مجروح ہو رہا ہے؟ غالباً مخالفین کو چپ کرنے کیلئے برائے بیت یہ شق لگادی گئی ہے،

افسوس ہے کہ اس بل کی مخالفت مولانا ارشد القادری صاحب جیسے لوگ کر رہے ہیں جو اس سلسلہ میں وزیر اعظم سے مل کر اپنی ترمیم ان کے سامنے رکھ چکے تھے اور ان کے بیان کے مطابق جن پہلوؤں کو مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ممبران نہیں سمجھا سکے تھے وہ وزیر اعظم کو سمجھا کر آئیں ہیں. مگر اسکے بعد

جب بابری مسجد کا قضیہ پیش آگیا تو ان حضرات نے ایسی چپ سادھ لی کہ جیسے کوئی اہم بات ہی نہیں ہوئی ہے اعلان کی ساری جوشیلی تقریریں چار مہینے تک صرف بابری مسجد کے سلسلہ میں ہوسکیں اور نہ بل میں ان کی پیش کی ہوئی اپنی ترمیمی تھیں اس مدت میں ان کو یاد آئیں لیکن اب جبکہ یہ بل پاس ہوگیا تو اسکی مخالفت شروع کر دی کہ اسکا سہرا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سر کیوں بندھا ہے۔

ان تمام حضرات سے میری گذارش ہے کہ دفعہ ۱۲۵ کے سلسلہ میں تو ایک لنگڑا لولا بل پاس ہوگیا، لیکن ابھی ضابطہ اصول کی دفعہ ۳۴ کی لڑائی اور زمینداری ابالیشن ایکٹ میں ترمیم اور حق شفعہ کو واپس لانے، ہبہ، وقف اور عدالتی مداخلت کی لڑائی باقی ہے۔ آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ سے پہلے اس لڑائی کو شروع کر دیجئے، انشاء اللہ سارے مسلمان اس لڑائی میں آپ کے ساتھ شریک رہیں گے اور بقول آپ کے "مسلم پرسنل لاء بورڈ کے کمزور قسم کے ممبران" بھی آپ کے جرأتمندانہ اقدام کی تائید پر مجبور ہوں گے۔

مخالفت کرنیوالے لوگوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ میں ہندوستان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد اور پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں اگر آپ ان کو مجروح کر دیں گے تو آپ اپنے حلقہ ارادت کے بل بوتے پر یہ لڑائی کبھی نہیں جیت سکیں گے،

اس سلسلہ میں ہم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں کی خدمت میں یہ ضروری عرض کریں گے کہ جب سے دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کا بل پاس ہوا ہے اس کے بعد آپ حضرات کی تحریروں اور گفتگوؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب آپ نے بورڈ کا رخ اصلاح معاشرہ کی طرف پھیر دیا ہے، بیشک یہ بہت اہم کام ہے، مگر بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جرأت کرونگا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام اسلئے عمل میں آیا تھا کہ حکومت یا عدلیہ کی طرف سے مسلم پرسنل لاء میں جو مداخلت ہو چکی ہے یا آئندہ ہوگی وہ اسکی مدافعت کرے گا اور مسلم پرسنل لاء کو ۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ یا انگریزوں کے عہد کے محمڈن لاء کے مطابق کرنے کی جدوجہد کریگا اور اب تک یہی کام وہ کرتا رہا ہے۔

رہا اصلاح معاشرہ کا کام تو تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اچھے بڑے پیمانہ پر اور کسی حد تک جمعیۃ العلماء کر رہی ہے پھر مسلم پرسنل لاء بورڈ کی کیا خصوصی حیثیت رہ جائے گی؟ غالبًا ہمارے اکابر ایک سالہ امید و بیم کی جنگ کے بعد اب کسی دوسری پرخطر لڑائی کیلئے تیار نہیں ہیں، مگر میں عرض کروں گا کہ ۲۰ برس کی پوری مدت کے بعد ایک سال سے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں مسلمان قوم کا جو اعتماد آپ کو حاصل رہا ہے اور جس طرح اس نے آپ کی آواز پر قربانی دی ہے اور دینے کیلئے تیار ہے اس میں آپ کو ذرا بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر خدانخواستہ آپ نے اتحاد کی اس صورت سے پورا فائدہ نہ اٹھایا اور دوسرے درجہ کے لوگ ان مسائل میں ہاتھ ڈالنے لگے تو اس سے نہ جانے کیا کیا ناگوار صورتیں سامنے آئیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوں، ہمیں امید ہے کہ اس پہلو پر آپ حضرات ضرور غور کریں گے اور دفعہ ۳۴ اور دوسری حق تلفیوں کی تلافی کے لئے پھر قوم کو آواز دیں گے۔

سباق (گھڑدوڑ)

شرعی نقطۂ نظر سے

مولانا ریاض الحسن نوری (مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

قرآن کریم نے معاشرہ کی دو لعنتوں اور تباہ کن اشیاء کا اکٹھا ذکر کیا ہے یعنی خمر اور میسر۔ دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔ گویا تمام نشہ آور اشیاء اور ہر قسم کے جوئے سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا قانون بنایا ہے۔ دونوں کا اکٹھا ذکر کرنا بھی قرآن کا ایک معجزہ ہے ان دونوں میں ایک خرابی یہ ہے کہ دونوں Habit Forming یعنی Addiction پیدا کرتی ہے۔ امریکہ میں ۴ ملین Cumpulsive Gamblers ہیں اس سلسلے میں مشہور ماہر نفسیات Wilhen Stakel نے ایک بہت عمدہ مضمون لکھا ہے جس کا عنوان The Gambler ہے وہ لکھتے ہیں۔

Plav and alcohol indulgence show certain relations Like, All the races on earth gamble (more or less); Indians are also said to gamble away everything they possess, including their wives; likewise the Chinese and the Negroes about "Schwein" (i. hog, in German.) The kind-hearted individual turns into a sadist, teasing his antagonist over his own good luck and making fun of him. The [illegible] becomes —— The conditions are different in the case of large mass games, of which "racing" is the best known type (in Europe). A

ترجمہ:۔ کھیل اور شراب کے استعمال سے آپس میں تعلق ہے ..... دنیا میں کم و بیش سب نسلوں کے لوگ جوا کھیلتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جوئے میں اپنی ہر چیز ہار دیتے ہیں حتیٰ کہ اپنی بیویاں بھی .... جوئے کے کھیل کے دوران رحم دل انسان بھی اذیت پسند بن جاتا ہے۔ وہ مخالف کی خوش قسمتی پر اسے تنگ کرنے لگتا ہے اور اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔

لیکن ایسے قمار بازی کے کھیلوں میں جن میں لوگ بڑے پیمانے پر حصّہ لے رہے ہیں حالات مختلف ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا حوالے سے یہ ثابت ہو گیا کہ مغربی دنیا میں جو قمار بازی کا تباہ کن کاروبار چل رہا ہے اس کا اہم ترین رکن گھڑ دوڑ ہے (یورپ میں) ؎

انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہے۔

Distorted estimates of the true probabilities also result from information - a principle much utilized by shrewd professionals. Thus race tracks abound with false tips and spurious "inside information" much of which is deliberatly circulated by touts to mislead..........

Peculiarities Human Behaviour: 2: 233-237.

جیتنے کے امکانات کے بڑھا چڑھا کر اندازے ان معلومات کی بنا پر لگائے جاتے ہیں (جو پھیلائی جاتی ہیں) پیشہ ور چالاک لوگ ان کا بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پس ریس کے میدان میں جھوٹے اندازے اور گھڑی ہوئی باتیں اندرونی معلومات کے طور سے ٹاؤٹوں کے ذریعے پھیلائی جاتی ہیں تاکہ رقم لگانے والے غلط طرف

اپنی رقوم لگا دیں۔ اس بات کو تجرباتی طور پر بار بار دیکھا گیا ہے کہ قمار باز لگاتار اپنی مہارت یا قسمت کے متعلق غلط اندازے لگاتے ہیں۔ مزید باقاعدہ تجربوں کے ذریعے یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ قمار باز کم درجہ کے امکانات کو بڑے درجہ کا سمجھ بیٹھتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ انسائیکلوپیڈیا مزید لکھتا ہے کہ یہ جرائم کا طاقتور منبع اور سیاسی کرپشن کا ذریعہ بھی ہے پھر وہ لکھتا ہے:۔

Like prostitution it is ancient, widespread, and widely disapproved. It flourishes, in spite of ethical taboo and legal sanction, as an institutionalized deviant pattern and as a form of crime in which the victims are willing accomplices.

اگرچہ قمار بازی کو اخلاقی طور سے برا سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بطور ایک عام روش سے ہٹی ہوئی چیز کے زور و شور سے جاری ہے یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے شکار جانتے بوجھتے اس میں آکر پھنستے ہیں۔

اس سلسلے میں مزید لکھتا ہے۔

Why do people who are high in anxiety and in fear of failure elect to gamble at all? Edmund Bergler, the only psychoanalyst who has dealt ex-tensively with the prodlem of addicted gamblers, has argued that such gamblers are genuine neurot-ics driven by unconscious aggression and latent rebellion "against logic, cleverness, moderation,"

The gambler persuades himself that the real source of his guilt and anxiety is the tension of the game itself, and he achieves the needed self-punishment by keeping going until he loses, uncon-sciously, the neurotic gambler wants to lose, and he needs to lose in order to keep his psychological books in balance (see also Bergler 1957; Olmsted 1962).

International encyclopedia of social sciences: 6: 55 P.57 ibid.

اس کی کیا وجہ ہے کہ جو لوگ تفکرات میں گھرے ہوئے ہیں اور جن کو ناکامی کا ڈر گھیرے ہوتا ہے وہ قمار بازی میں حصہ لینے کا کیوں فیصلہ کرتے ہیں؟ ایڈمنڈ۔ جن نے اس مسئلہ پر وسیع تحقیق کی ہے اور عادی قمار بازوں کا جائزہ لیا ہے۔ دلائل کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں جو تحت الشعور تشدد اور بغاوت کے جذبے کی بنا پر قمار بازی میں ملوث ہوتے ہیں۔۔ قمار باز اپنے نفس کو یوں کہتا ہے کہ اس کے فکر اور اعصابی تناؤ کا منبع وہ اعصابی تناؤ ہے جو اسے قمار بازی کے دوران محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ اپنے آپ کو جان بوجھ کر یوں سزا دیتا ہے کہ وہ اس وقت تک کھیلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ ہارنا شروع کر دے۔

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید دور میں لالچی اور جرائم پیشہ لوگ عوام کو بیوقوف بنا کر لوٹتے ہیں۔ اور گھڑ دوڑ اس کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ پس حکومت کو چاہیئے کہ نہ صرف ہر قسم کی گھڑ دوڑ پر پابندی لگائے بلکہ رفیل — انعامی کوپن وغیرہ کے سلسلے میں جو عوام کی نفسیات کو خراب کیا جا رہا ہے۔ اس پر بھی مکمل پابندی لگائی جائے۔

لاٹری کے کھیل یعنی Chance games آدمی کو Superstitious (توہم پرست) بناتے ہیں اور نفسیاتی صحت کے لئے نقصان دہ ہیں انعامی بانڈوں میں بھی Chance پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور محنت پر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ بغیر محنت کے حصول دولت کے رجحان سے ہی رشوت لینے کی طرف بھی لوگ آسانی سے مائل ہوتے لگتے ہیں۔ اور آخر کار رشوت لینے کے بھی اسی طرح عادی بن جاتے ہیں جیسے قمار بازی کے عادی بنتے ہیں۔

اب میں ان دلائل کی طرف آتا ہوں جو کہ ریس کے جواز کے حق میں دیئے

جا رہے ہیں "سباق اسلامی" کے صفحہ ۲ پر قرآنی آیت دی گئی ہے اور ترجمہ میں لکھا ہے۔

"اور ان کے مقابلے میں تیار رکھو جو قوت تمہیں بن پڑے اور گھوڑے باندھے کو تم اس سے ڈراؤ ان دشمنوں کو جو اپنے دشمنوں کو ڈراؤ۔ خود ان کی بیان کردہ آیت میں گھوڑے باندھنے کی جس علت کا بیان ہے وہ دشمنوں کو ڈراتا ہے۔ کیا آج ہمارے دشمن گھڑ دوڑ کرانے سے ڈر جائیں گے؟ ہرگز نہیں! آج ہمارا دشمن گھوڑوں سے نہیں بلکہ جیٹ طیاروں سے ڈرتا ہے۔ پس یہ لوگ اگر واقعی دشمنوں کو ڈرانے اور مذکورہ آیت پر عمل کی نیت رکھتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ لاکھوں اور کروڑوں روپے کے ریس کے گھوڑے بیچ کر حکومت کو ۱۶ F-۱۶ دو یگر طیارے خرید کر فی سبیل اللہ دے دیں۔ کیونکہ آج کے دشمن تو طیاروں کی خرید پر اعتراض کرتا ہے اور خوف ظاہر کرتا ہے۔ نہ آپ کے گھوڑے دوڑانے سے اس کو کوئی خوف لاحق ہوتا ہے اور نہ آپ کے گھوڑے خریدنے سے۔ پس چاہئے کہ تمام جاکیوں کو پائلٹ بنا دیا جائے۔

آج کے دور میں جو فوجی قوت کے تجزیئے مختلف ممالک کے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں طیاروں۔ ٹینکوں۔ بحری جہازوں وغیرہ کی تعداد کا ذکر ہوتا ہے۔ گھوڑوں کی تعداد کا ذکر نہیں ہوتا ہے۔ پس فوجی قوت کے لئے نہ گھوڑے رکھنے کی ضرورت ہے نہ مقابلہ کی۔ ایسی صورت میں ایک گھوڑے پر لاکھوں روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی اور تبذیر کہلائے گا اور فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن نے شیطان کا بھائی کہا ہے۔

فضول خرچی کرنے پر قاضی حجر کا قانون نافذ کر سکتا ہے اور فضول خرچی کو روک سکتا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ماڈرن وار میں گھوڑوں کا کوئی مصرف نہیں رہا۔ آج گھوڑوں پر کروڑوں روپیہ صرف کرنا ظلم عظیم ہے۔ اگر ان گھوڑے کے

مالکوں کے دلوں میں رحم کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود ہے تو ان کو چاہیئے کہ ان گھوڑوں کو بیچ کر اور اس دولت کو جو وہ ان پر صرف کرتے ہیں صدر پاکستان کے اس فنڈ میں دے دیں جو قحط زدہ افراد کے لئے حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔

حدیث میں جو کہا گیا ہے کہ مال لینا مسابقت میں حلال نہیں سوائے اونٹ یا گھوڑے دوڑانے یا تیر چلانے میں۔

لاسبق الافی خف اوحافر او نصل۔ (ابوداؤد)

اس حدیث میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر ہے۔ پھر گھوڑے کا اور پھر تیر چلانے کا۔ کیا وجہ ہے کہ جو لوگ اس حدیث کو دلیل میں لاتے ہیں وہ اونٹوں کی ریس کیوں نہیں کراتے اور تیراندازی کا مقابلہ کیوں نہیں کراتے سب سے پہلی چیز کو کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کا مقصد حدیث سے شغف نہیں بلکہ یورپ کی پیروی میں قمار بازی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اب تیراندازی کا زمانہ ختم ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ گھوڑ سواروں کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ قرون اولےٰ میں گھوڑے کو بہت اہمیت تھی۔ بعض شمشیر زن ہزار جوانوں کے برابر سمجھے جاتے تھے ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک فوج کی مدد کے لئے ایسے ہی دو شمشیر زن شہسوار بھیجے تو خط میں لکھا کہ دو ہزار کی فوج بھیج رہا ہوں۔

حضرت خالدؓ نے ساٹھ شہسواروں کی مدد سے ۶۰ ہزار کی فوج کو شکست دی، اس دور میں ایسے شہسوار ۱۶ ۔ F جیٹ طیاروں کی ذیل میں آتے تھے۔ اسی وجہ سے گھوڑے پالنے اور مسابقت کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ آج گھوڑے نیزہ بازی۔ تیراندازی فوجی قوت کے لحاظ سے ختم ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج جو شخص جہاد کی نیت سے گھوڑا سواری یا تیراندازی سیکھے تو اسکو احمق ہی کہا جائے گا آج دولت جٹ طیاروں۔ لیزر شعاعوں اور جدید ایٹمی ہتھیاروں اور ان کے دفاع کے

سامان پر خرچ ہونا چاہیئے نہ کہ گھوڑوں اور تیروں اور کمانوں پر۔

گھوڑدوڑ کی اجازت صرف جہاد کے گھوڑوں کے لئے تھی۔ آج کی ریس کے گھوڑے ہرگز جہاد کے گھوڑے نہیں ہیں۔ یہ صرف لہو ولعب اور قمار بازی کے گھوڑے ہیں ایسے گھوڑے کی دوڑ جو جہاد کے لئے نہ ہوں ان کی دوڑ تو قرون اولےٰ میں بھی جائز نہ تھی اور آج تو جواز کا سوال بھی اٹھانا بالکل غلط ہے۔ اس سلسلے میں صاحب تفسیر المنار لکھتے ہیں۔ (۵۷)

ولكن لا خلاف بين الفقهاء في ان كل قمار محرم، الا ما اباح الشرع من الرهان في السباق والرماية ترغيبًا فيهما للاستعداد للجهاد، وليس منها سباق الخيل المعروف في عصرنا فانه من شر القمار الذى ترجع جميع انواعه الى كونها من اكل اموال الناس بالباطل۔

یعنی آج کے دور میں جو گھڑ دوڑ ہوتی ہے وہ قمار کی بدترین شکل ہے جس میں لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھایا جاتا ہے۔ [1]

اس سلسلے میں مشہور مالکی فقیہ الدردیر باب المسابقۃ میں یہ کہنے کے بعد کہ

والاصل فيها المنع لما فيها من اللعب والقمار۔

یعنی اصل یہ ہے کہ گھڑ دوڑ منع ہے کیونکہ اس میں لہو ولعب یعنی کھیل تماشہ اور قمار کا پہلو ہے۔

مزید فرماتے ہیں۔

ولكن اجازها الشارع للتدريب على الجهاد ومنع الصائل فلو كانت لمجرد اللهو لم تجز۔

---

[1] تفسیر المنار ۔ ۵ ، ۵۷ تفسیر سورہ مائدہ۔

یعنی ۔ لیکن شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی اجازت جہاد کی تیاری اور ڈیفنس کے سلسلے میں دی ہے۔ اگر یہ صرف کھیل کے طور پر ہو تو جائز نہیں ہے[1]
یہ بات بالکل واضح ہے کہ جوا تو جوا بطور کھیل تماشے کے بھی مسابقت جائز نہیں حدیث میں صرف ان گنتی کی چیزوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے جو جہاد کی بنیاد تھیں یعنی اونٹ، گھوڑے اور تیر اندازی ۔

ایک عباسی خلیفہ کبوتر بازی کا شوقین تھا تو ایک خوشامدی درباری نے ان تین چیزوں میں لفظ جناح کا اضافہ کر دیا تو سخت غصہ آیا اور تمام کبوتر ذبح کرا دیے
پس ثابت ہوا کہ جو گھوڑے فوج کا حصہ نہ ہوں یا جہاد کی نیت سے نہ پالے گئے ہوں ۔ ان کی مسابقت حرام ہے ۔ کیونکہ اجازت جہاد سے مشروط ہے یہی وجہ ہے کہ چوتھی چیز کا ذکر حدیث میں نہیں ہے ۔

اب ہم مسابقت کی اسلامی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں ۔ قرن اولٰی میں گھوڑے کے مقابلہ تو لوگ کرتے تھے کیونکہ جہاد جاری رہتا تھا لیکن گھوڑوں کی دوڑ پر انعام کے واقعات تاریخ و حدیث کی کتابوں میں صرف گنتی کے چند ایک ہی ملتے ہیں ۔ ایک واقعہ وہ ہے جس میں ابن عمرؓ نے بھی حصہ لیا تھا ۔ ایسے مواقع شاذ و نادر ہی ہوتے تھے ۔ کوئی عام رواج نہ تھا ۔ کیونکہ عبادات ۔ خدمت خلق جہاد ۔ تہجد میں مشغولیت رہتی تھی ۔

حضرت ابوبکرؓ یا کسی اور خلیفہ راشد کے دور میں کسی ایسے واقعہ کا ذکر تاریخ یا حدیث کی کتاب میں نہیں ملتا ۔ اس بات سے ثابت ہوا کہ اس کا عام رواج نہ تھا شاذ و نادر ہی انعامی مقابلے ہوتے تھے ۔ ایک واقعہ حضرت عمرؓ کے دور کا ملتا ہے

---

[1] الدردیر ۔ الشرح الصغیر علی اقرب المسالک للمذہب الامام مالک مطبعہ مصر ۲/۳۰۴

کہ مقابلہ میں ایک ذمی مصر میں حضرت عمرو بن العاص کے صاحبزادے سے آگے نکل گیا انہوں نے ذمی کی جیت کو اپنی بے عزتی سمجھا اور اس ذمی کو کوڑوں سے مارا۔ اس ذمی نے شکایت مدینہ لکھ بھیجی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان دونوں کو مع گورنر مصر عمرو بن العاصؓ کے مدینہ طلب کر لیا۔ اور قصاص میں اس ذمی کو حکم دیا کہ گورنر کے بیٹے کو اتنے ہی زور سے کوڑے مارے جتنے زور سے اس کو کوڑے مارے گئے تھے۔ جب ذمی اپنا قصاص لے چکا تو حضرت عمرؓ نے اسے کہا کہ ایک کوڑا گورنر کے بغیر بالوں کے سر پر بھی لگا دو۔ اس پر ذمی بولا ان کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عمروؓ بن العاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام سمجھ لیا ہے۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

مذکورہ بالا واقعہ بڑی تفصیل سے کتب تواریخ میں بیان ہوا ہے۔ لیکن کسی مورخ نے بھی اس دوڑ میں کسی رقم کے دیئے جانے کا ذکر نہیں کیا۔ اگر رقم کا تبادلہ ہوتا تو کسی نے ضرور ذکر کیا ہوتا۔

اس اہم تاریخی واقعہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اگرچہ مقابلوں میں ایک طرفہ شرط کی اجازت بطور انعام شارع نے دے دی تھی۔ لیکن لوگ عام طور سے ان مقابلوں میں کسی قسم کی بھی شرط نہ لگاتے تھے اور اس کا کوئی عام رواج نہ تھا۔ اگر کسی طرح کی شرط کا عام رواج ہوتا تو اس اہم واقعہ میں بھی شرط کا ذکر ضرور آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مال غنیمت کافی آ چکا تھا اور مجاہدین کو مال غنیمت میں کافی مال مل چکا تھا۔ وہ خوشحال ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے مقابلوں میں مالی شرط نہیں لگائی جاتی تھی بلکہ محض اول آنے کی ناموری کافی ہوتی تھی اور ہارنے کی بے عزتی مالی نقصان سے زیادہ بری سمجھی جاتی تھی ویسے بھی ماہرین نفسیات ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی فطرت میں شہرت اور

ناموری کی حیثیت مال سے زیادہ ہے ۔

پس تاریخی حیثیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خلفائے راشدین کے دور میں گھوڑ دوڑ کے مقابلوں میں مالی شرط معدوم ہو چکی تھی ۔ اس کا ایک بھی واقعہ تاریخ میں نہیں ملتا نہ حدیث میں کسی ایسے مقابلے کا ذکر ملتا ہے ،

ایک اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ جہاد کی تیاری کی نیت سے چند سابقوں کا ذکر احادیث میں ملتا ہے ۔ ان میں بھی یہی ہے کہ انعام یا تو حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے ہوتا تھا ۔ یا مقابلہ کرنے والوں میں کوئی ایک شخص جیتنے والے کے لئے رقم مقرر کر دیتا تھا ۔

خاص شرائط سے جو تیسرے شخص کے بطور محلل شرکت کی اجازت کا ذکر ملتا ہے اس میں بھی یہی ہے کہ اگر دونوں طرف سے شرط ہو تو تیسرا شخص بطور محلل شریک ہوگا لیکن وہ کسی صورت میں بھی رقم نہ دے گا ۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تیسرا شخص مالی طور پر ہرگز کوئی حصہ نہیں لے سکتا چاہے وہ خود گھوڑ دوڑ میں شریک ہو رہا ہو ۔ پس کسی ایسے تیسرے یا چوتھے شخص کی شرکت مالی ہرگز جائز نہیں جو مسابقت میں بطور خود گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر حصہ نہ لے رہا ہو ۔ آج جو ریس دیکھنے والے مالی حصہ لیتے ہیں اس کے جواز کا کسی حدیث میں ذکر نہیں ۔ نہ وہ اس وقت جائز تھی اور نہ آج جائز ہے ۔

البتہ اگر کوئی شخص اول یا دوئم آنے والے کے لئے فی سبیل اللہ انعام رکھ دے تو وہ الگ بات ہے ۔ کیونکہ اس میں اسے کسی مالی منفعت کی نہ امید ہوتی ہے اور نہ امکان ہوتا ہے وہ تو اگر کسی اجر کا طالب ہوتا ہے تو صرف آخرت کے اجر کے لئے ۔ اس کا معاملہ الگ ہے ۔ وہ تو آخرت میں ایک درہم کی

جزیرۂ عرب میں یہود کی تاریخ

(تیسری قسط)

(مجیب اللہ ندوی)

عربی ادب میں یہود کا حصہ یہود کی مادری زبان عبرانی تھی، مگر جزیرۂ عرب میں آکر ان کی زبان رفتہ رفتہ بالکل عربی ہوگئی تھی، ان میں عبرانی زبان مذہبی حیثیت سے اب بھی باقی تھی، جس کو ان کے علماء واحبار جانتے تھے، اس میں ان کی مذہبی کتابیں تھیں، اور اسی زبان میں وہ ان کی تلاوت کرتے تھے مگر عوام شاید اس قدر بھی عبرانی نہیں جانتے تھے،

لایعلمون الکتاب الا امانی — ان میں بعض ہیں جو کتاب کا علم نہیں رکھتے مگر صرف خواہشات،

بخلاف اس کے ان کی روزمرہ کی زبان اور ان کی شاعری کی زبان عربی تھی، اور اسی میں وہ کاروبار اور معاہدہ صلح وجنگ کرتے تھے، یہ ضرور ہے کہ عبرانی زبان کی سیکڑوں ترکیبیں، مذہبی اصطلاحیں اور تمدنی ومعاشرتی الفاظ ان کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے، جو ان کے ذریعہ عربی زبان میں داخل ہوئے۔ خود قرآن مجید میں ایسے متعدد الفاظ موجود ہیں، جن کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ عبرانی زبان سے عربی میں آئے ہیں،

مثلاً حبر کا لفظ عربی ادب اور خود قرآن میں مستعمل ہے، عبرانی میں ابتداءً اس کے معنی رفیق (חבר) کے تھے، پھر یہ گروہ اور مذہبی فرقہ کے معنی میں مستعمل ہونے لگا، اس کے بعد عالم کے معنی میں استعمال ہوا، اور اس وقت عربی زبان میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح نسئی کے لفظ کے متعلق بعض مستشرقین نے لکھا ہے کہ عبرانی لفظ ہے، عبرانی میں الناسی (دنا سی) اس شخص کو کہتے ہیں جو مہینوں کو مقدم ومؤخر کرتا تھا، عربی مورخین لکھتے ہیں کہ عربوں میں نسئی کا رواج سب سے پہلے بنو کنانہ میں شروع ہوا[1]، اوپر ذکر آچکا ہے کہ بنو کنانہ میں یہودیت موجود تھی، اس لئے ممکن ہے کہ یہ طریقہ انہوں نے یہودیوں سے سیکھا ہو، اور پھر عربوں میں اس کو رواج دیا ہو، اس خیال کی تائید مقریزی اور بیرونی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ عمل کبیسہ اہل عرب نے یہود سے دو سو برس قبل اسلام سیکھا تھا[2]

لفظ آطام کے متعلق بھی بحث ہے کہ یہ خالص عربی لفظ ہے، یا عبرانی، اس لفظ کے جتنے عربی مشتقات ہیں، ان سب میں ارتفاع، بلندی، حفاظت اور بند کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں[1]۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عبرانی سے عربی میں آیا ہے، اس لئے کہ عبری میں اطم تقریباً ان ہی مذکورہ معنوں میں مستعمل ہے ظہور اسلام کے وقت یہ لفظ عام طور پر قلعوں اور اونچے ٹیلوں کے معنی میں بولا جاتا تھا، مگر یہود خصوصیت سے اطم کو قلعہ کے علاوہ ان مقامات کیلئے بھی استعمال کرتے تھے جن میں وہ جمع ہوکر مشورہ کرتے تھے[2]، یہ لفظ زیادہ تر شمالی حجاز میں مستعمل تھا، عرب کے دوسرے حصوں میں اسکا استعمال شاید نہیں تھا، اور اگر تھا تو بہت کم جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہود کے ذریعہ یہاں آیا۔ ان وجوہ کی بنا پر اسے عبرانی کہنا زیادہ صحیح ہے۔

امام سیوطی نے قرآن کے ان جملوں کو عبرانی سے ماخوذ بتایا ہے۔

کفر عنہم سیاٰتہم، اس کے معنی عبرانی میں محا عنہم ہیں، اخلد الی الارض کے معنی عبرانی میں رکن ہیں، اناھدنا الیك کے معنی۔ ثبنا الیك ہیں،

ان الفاظ کو بھی عبرانی الاصل بتایا گیا ہے۔

رمز، مرقوم، اداہ، یم، حطۃ، اسباط، داعنا، بعیر، لینۃ، قسیس، ابلیس جہنم، شیطان،

ان میں بعض لفظ ایسے ہیں جن کے ساتھ ایک دینی اصطلاح اور ایک تاریخ وابستہ ہے ظاہر ہے کہ ان اصطلاحوں اور ان واقعات کی تفصیل سے زیادہ تر یہودی واقف تھے، اس لئے اہل عرب ان کے متعلق سوالات کرتے ہوں گے، اور وہ ان کی تشریح کرتے ہوں گے جس سے کتنے نئے واقعات اور کتنے نئے تصورات، کتنے جدید الفاظ سے عربی زبان کا دامن مالامال ہوتا ہوگا اسی بنا پر اہل عرب یہود کے بارے میں کہتے تھے

لکم علم لیس لنا[3]، تم لوگوں کے پاس علم ہے جس سے ہم بے بہرہ ہیں

---

[1] دیکھئے لفظ اطم لسان العرب ج ۱۴ [2] ابن ہشام بحوالہ تاریخ الیہود ص ۸۴

تحریر کا رواج | اس سلسلہ میں یہ بحث بھی آتی ہے کہ عربی تحریر کا رواج سب سے پہلے کس کے ذریعہ ہوا؟ صاحب فتوح البلدان نے عربی خط پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب سے پہلے قبیلہ طے کے چند افراد نے عربی خط ایجاد کیا، اور اس کے حروف تہجی کی بنیاد انہوں نے سریانی زبان پر رکھی، اس کے بعد ان سے اہل انبار نے اور اہل انبار سے اہل حیرہ نے سیکھا، پھر اہل حیرہ سے دومۃ الجندل کے حکراں بشر بن عبدالملک نصرانی نے سیکھا، اور اسی نے اس کو مکہ میں رواج دیا[1]، پھر آگے لکھا ہے کہ قبیلہ طے کے ان ہی افراد سے بنوکلب اور اہل وادی القریٰ نے بھی عربی تحریر سیکھی[2]

اس بیان سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربوں ہی کی ایجاد ہے، مگر اس کی ایجاد کا جو زمانہ اس میں بیان کیا گیا ہے وہ ظہور اسلام سے کچھ ہی پہلے کا ہے، حالانکہ عربی خط کی تاریخ اس سے قدیم ہے،

معجم البلدان کا ایک دوسرا بیان یہ ہے۔

کان الکتاب (الکتابۃ) بالعربیۃ فی الاوس والخزرج قلیلاً وکان بعض الیہود قد علم کتاب العربیۃ وکان تعلمہ الصبیان بالمدینہ فی الزمن الاوّل[3]	قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ عربی میں لکھنا پڑھنا بہت کم جانتے تھے، مدینہ کے بعض یہود نے بہت قدیم زمانہ سے عربی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، اور اپنے بچوں کو بھی اس کی تعلیم دیتے تھے،

اسی بیان کو سامنے رکھکر تاریخ الیہود کے مصنف نے لکھا ہے کہ

ان یہود یثرب کانوا اساتذۃ العرب فی تعلم الکتابۃ العربیہ (ص ۱۳)	یثرب کے یہود عربی تحریر میں عربوں کے استاذ تھے،

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۷۰ [2] ایضاً [3] فتوح البلدان ۴۷۳

بلاذری کے بیان سے یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ پورے جزیرۂ عرب میں یہود کے ذریعہ عربی تحریر کا رواج ہوا، مگر اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ شمالی حجاز میں یہود ہی کے ذریعہ اسے فروغ ہوا، یہ قرین قیاس بھی ہے، اس لئے کہ تحریر کی ترویج و ترقی تمدن و حضارت کے سایہ میں ہوتی ہے، اور وہ اہل عرب میں مفقود تھی، بخلاف یہود کے کہ وہ عربوں کے مقابلہ زیادہ متمدن تھے، پھر ان کو تجارتی کاروبار میں بھی اس کی ضرورت پڑتی ہی ہوگی، ظہور اسلام کے وقت مکہ اور مدینہ میں جو چند پڑھے لکھے لوگ ملتے ہیں وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ تمدنی ضرورت نے انہیں پڑھنے لکھنے پر مجبور کیا، ورنہ اس سے پہلے یہ چیز ان میں ناپید تھی[1]۔

شعروشاعری شعروشاعری اہل عرب کے خمیر میں تھی، اس کا چرچا ہر محفل اور ہر گھر میں تھا اس کے ذریعہ بڑے بڑے معرکے سر ہوتے تھے اور اسی کے سہارے قبیلوں اور خاندانوں کی سیادت و قیادت ملتی تھی۔ جزیرہ میں جتنی قومیں آباد تھیں، یہودی، نصرانی یا مجوسی، وہ سب عربوں کے شعروشاعری سے متاثر ہوئیں اور انہوں نے خود بھی اس میں حصہ لیا اور اس طرح سے عربوں کے بہت سے اخلاق و عادات اور تصورات غیر محسوس طور پر ان میں رواج پا گئے،

جزیرۂ عرب کے یہود میں متعدد خطباء و شعراء پیدا ہوئے، ابن سلام نے طبقات الشعراء میں ان کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان میں کسی قدیم شاعر کا نام نہیں ہے، ان میں بیشتر ظہور اسلام کے وقت موجود تھے، یا اس سے کچھ پہلے گذر چکے تھے، ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) سموئل بن عادیا، یہ یہود کے صاحب دیوان اور فحول شعراء میں تھا اس کا دیوان الاب شیخو صاحب المنجد نے بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے[2]، اس کا زمانہ ظہور اسلام سے کچھ پہلے ہے، اسی کے لڑکے حضرت رفاعہؓ صحابی ہیں، جنکا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔

(۲) رافع بن الحقیق قبیلہ بنو نضیر سے اس کا تعلق تھا۔ اس نے اسلام کے خلاف اپنے اشعار

---

[1] اس کی تفصیل کا موقع نہیں ورنہ اس کے دلائل پیش کئے جاتے، [2] اس کے یہودی یا نصرانی ہونے کی بحث کتاب میں موجود ہے اسلئے ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں،

میں بہت زہر افشانی کی ہے، سیرت اور طبقات کی کتابوں میں اس کے بہت سے اشعار موجود ہیں،

۳:۔ کعب بن اشرف، یہود مدینہ کا سب سے مشہور شاعر اور ان کا سرگروہ تھا، اس کو شاعری پر پوری قدرت تھی، اسلام سے اس کو طبعی بغض تھا، اسلئے وہ اپنے اشعار کے ذریعہ اسلام کے خلاف خوب زہر اگلتا تھا، مقتولین بدر کا مرثیہ لکھ کر اس نے قریش سے خراج تحسین وصول کیا، ادب و سیرت کی کتابوں میں اس کے مراثی اور دوسرے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔

ان کے علاوہ شریح بن عمران، شعبہ بن غریض، ابوقیس بن رفاعہ، ابوالذیال، درہم بن زید وغیرہ یہودی شعراء کا تذکرہ بھی ابن سلام نے کیا ہے بعض یہودی شعراء کا تذکرہ اس کتاب میں بھی موجود ہے، اغانی میں ایک یہودی شاعر کا تذکرہ موجود ہے جس نے یہودی مقتولین کا مرثیہ کہا تھا[1] اسی طرح صاحب تاریخ الخمیس نے ایک خاتون شاعرہ عصماء کا تذکرہ کیا ہے[2]

طوالت کے خیال سے ان شعراء کے اشعار نقل نہیں کئے گئے لیکن ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عربی شاعری کی عام خصوصیات ان کی شاعری میں بھی بڑی حد تک پائی جاتی ہیں خصوصیت سے سموئل اور کعب اس حیثیت سے بہت زیادہ ممتاز ہیں۔

شعراء یہود کی شاعری اس حیثیت سے عام عرب شعراء سے ممتاز ہے کہ ان کے اشعار میں مذہبی اصطلاحیں، مذہبی تصورات، انبیاء اور کتب مقدسہ کے نام، خدا و آخرت کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے بہت سے تمدنی اور مذہبی تصورات شاعری کے ذریعہ بھی عربوں میں آگئے ہوں گے،

اجتماعی ادارے | عربی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر یہود کے اجتماعی ادارے بھی قائم تھے، خود مدینہ میں بیت المدارس کے نام سے ان کا ایک ادارہ تھا، جس میں ان کے احبار اور صاحب امر یکجا ہو کر آپس میں صلاح و مشورہ کرتے تھے، ممکن ہے کہ مراسم عبادت بھی وہیں ادا کرتے ہوں اور وہیں پر ان کی مذہبی کتابیں محفوظ رہتی ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ

---

[1] اغانی ج ۱۹ ص ۹۰ [2] ج ۱ ص ۳۰۶

کئی بار بغرض تبلیغ یہاں تشریف لے گئے تھے[1] خصوصیت سے حضرت عمرؓ کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ اکثر ان کے مدارس میں جاتے رہتے تھے، جس کی بنا پر یہود ان سے کہتے تھے کہ ہم کو آپ سے بہت انس ہے[2]

اس کے علاوہ ان کے قلعے بھی اجتماعی کاموں میں استعمال کئے جاتے تھے، خیبر میں ان کے مذہبی اور مالی دونوں الگ الگ ادارے تھے، اور ان کے علیحدہ علیحدہ ذمہ دار تھے۔

مذہبی اثرات اوپر ذکر آچکا ہے کہ اہل عرب یہود کو علمی اور مذہبی حیثیت سے ممتاز سمجھتے تھے۔ اور بہت سے امور میں ان کی اقتدا کرتے تھے، یہ بھی بیان ہوچکا ہے کہ ادب وشاعری کے ذریعہ ان کی بہت سی مذہبی اصطلاحیں، اور الفاظ اور تصورات عربی زبان میں داخل ہو گئے تھے اس سلسلہ میں حضرت سلمہؓ نے ظہور اسلام سے قبل کا ایک واقعہ جو قابل ذکر ہے، بیان کیا ہے فرماتے ہیں،

میرے پڑوس میں قبیلہ بنو اشہل کا ایک یہودی رہتا تھا، اس نے ایک دن تمام بنو اشہل کو جمع کیا اور ان کے سامنے قیامت، بعث بعد الموت، حساب کتاب، میزان، جنت اور دوزخ وغیرہ کے متعلق ایک وعظ کہا، اور آخر میں کہا کہ یہ اہل شرک اور بت پرست لوگ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہیں ہیں، اس پر حاضرین نے کہا کہ تم کیا بک رہے ہو، کیا مرنے کے بعد ہم لوگ پھر زندہ کئے جائیں گے، اور ہمارے اعمال کا محاسبہ ہوگا؟ یہودی نے پھر مجمع کو اس کے بارے میں سمجھایا، مجمع نے اس سے دوبارہ مطالبہ کیا کہ وہ اس کی کوئی دلیل اور نشانی بتائے، اس نے کہا کہ اس سرزمین سے ایک نبی پیدا ہوں گے، اور وہ اس کے بارے میں بتائیں گے[3]

قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرب عام طور پر آخرت اور بعث بعد الموت کے قائل نہیں تھے، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ، وہ اس کے قائل تو نہیں تھے، لیکن یہود کے ذریعہ ان سے

---

[1] روض الانف ج ۲ ص ۳۸ [2] تفسیر طبری ج ۱ ص ۳۲۶ [3] ابن ہشام بحوالہ تاریخ الیہود

آگاہ ضرور ہو گئے تھے ۔

سیر کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہود تین وقت کی نماز بھی پڑھتے تھے [1] ابن الہیبان یہودی عالم جسکا تذکرہ اس کتاب میں آیا ہے، اس کے متعلق کتابوں میں ہے کہ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتا تھا [2]

نماز کے اعلان کے لئے وہ بوق بجاتے تھے [3]، وہ روزے بھی رکھتے تھے [4]،

ظاہر ہے کہ یہود کے ان مذہبی مراسم کو عرب اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہوں گے ان میں انکا چرچا رہتا ہوگا، اوران کا اثر بھی ان پر پڑتا رہا ہوگا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جہاں جتنے زیادہ یہود آباد تھے وہاں اسی قدر ان کے اثرات بھی عربوں پر نمایاں تھے، مثلاً مدینہ کے عرب یہود کے رسم ورواج اور مذہبی امور سے سب سے زیادہ واقف اور متاثر نظر آتے ہیں اور غالباً اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ انصار نے بہت آسانی سے اسلام قبول کر لیا، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کی حقانیت سے وہ پہلے سے آگاہ ہو چکے تھے، سوال یہ ہے کہ عقائد کے لحاظ سے اسلام سے اس درجہ قریب ہونے کے باوجود خود یہودیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں کیوں تاخیر کی اور کیوں لیت ولعل سے کام لیا واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہود کا صالح طبقہ آپ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کا قائل اور اس کی قبولیت کی طرف مائل ضرور تھا، لیکن ان کیلئے کچھ موانع تھے. جن کی وجہ سے وہ اس سعادت ابدی سے محروم رہے، پھر بھی ان میں جو صاحب عزم اور صاحب همت تھے، اور ان موانع کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکتے تھے، وہ قبول حق سے باز بھی نہیں رہے، تفصیل آگے آئے گی،

قبائلی نظام اوپر یہودیوں کے علمی وتمدنی اثرات کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے، اس سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہود عربوں کے مقابلہ میں زیادہ متمدن اور صاحب علم تھے،

---

[1] ایضا [2] تاریخ الیہود ص ۸۸ [3] سینگ کی طرح کی کوئی چیز ہوتی تھی، [4] عام کتب حدیث

مگر اس کے ساتھ جب ہم ان کی معاشرتی زندگی پر غور کرتے ہیں تو وہ عربوں سے کچھ مختلف نظر نہیں آتے، عربوں کی طرح وہ بھی مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے، ہر قبیلہ کا ایک جدا سردار اور علیحدہ نظام تھا، اور صلح وجنگ کے مواقع پر وہ اپنی قبائلی مصلحتوں کے تحت ایک دوسرے سے معاملہ کرتے تھے، اسی کا اثر تھا کہ متعدد جاہلی اور اسلامی لڑائیوں میں وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں یا ایک دوسرے کے خلاف مدد کرتے نظر آتے ہیں، تفصیل آگے آئے گی، اسی طرح یہود کا رہن سہن، معاشرت اور وضع ولباس وغیرہ بھی تقریباً وہی تھا جو عربوں کا تھا، ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کی قبائلی زندگی کا ان پر اچھا خاصا اثر پڑا تھا،

یہود کی دینی اور اخلاقی حالت | قرآن نے یہود کی دینی حالت اور اخلاقی معائب کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں دنیا کے تقریباً تمام یہود مبتلا تھے، مگر ہمارا موضوع بحث صرف جزیرۂ عرب کے یہود ہیں، اسلئے قرآن نے ان کے جن معائب کی نشاندہی کی ہے، ہم اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

دینی گمراہیاں | تمام انبیاے کرام کی تعلیم میں یہ بات مشترک رہی ہے کہ عزت شرافت اور آخرت کی فلاح وسعادت کا مدار اور خدا کے نزدیک محبوبیت اور مقبولیت کا معیار ایمان وعمل ہے نہ کہ نسل وذات، مگر یہودیوں کی ایک بنیادی غلطی اور گمراہی یہ تھی کہ انھوں نے شرافت ونجات کا معیار ہی سرے سے بدل دیا، اس کا ایمان مدار وعمل کے بجائے نسل وذات پر رکھا ان کے نزدیک یہودی گھرانے میں پیدا ہونا ہی سب سے بڑا شرف اور نجات آخرت کیلئے کافی تھا، کہتے تھے کہ

نحن ابناء الله واحباءہٗ[1] (مائدہ) — ہم اللہ کے لڑکے اور اس کے محبوب ہیں،

اور سمجھتے تھے کہ

---

[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس سلسلہ میں متعدد یہود مدینہ کا نام بھی لیا ہے، طبری میں انکا قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہود عام طور پر یہ خیال تھا۔

لن تمسنا النار الا ایاماً معدودۃ (بقرہ) ہم دوزخ میں چند دن کیلئے ڈالے جائیں گے ۔

ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ۔

قل ان کانت لکم الدار الاٰخرۃ	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے لئے (اے یہود!)
عند اللہ خالصۃ من دون	آخرت کی فلاح مخصوص ہے تو پھر موت کی
الناس فتمنوا الموت ان کنتم	تمنا کر کے دکھلاؤ اگر تم سچے ہو ،
صادقین (بقرہ)	

دوسری جگہ قرآن نے ان کو خطاب کر کے فرمایا ہے

قل یاایہا الذین ھادوان زعمتم	آپ فرما دیجئے کہ اے یہود! اگر تم کو زعم ہے کہ
انکم اولیاء للہ فتمنوا الموت	تم اللہ کے محبوب ہو، تو موت کی تمنا کرو
ان کنتم صادقین (جمعہ)	اگر تم سچے ہو ،

اسی غلط تصور کا نتیجہ تھا کہ ان کے نزدیک کسی بدعقیدگی ، بدمعاملگی اور بداخلاقی کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی تھی ، یہودیت کی سند مل جانے کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ ان کی کوئی برائی برائی نہیں رہ جاتی ، یہی وجہ تھی کہ ان میں وہ تمام برائیاں گھس آئیں جن کا کم از کم ایک صاحب شریعت قوم میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا ، عقائد میں سب سے اہم اور اساسی چیز عقیدۂ توحید ہے اسی کی صحت اور اسی میں اخلاص کی بنیاد پر سارے دین کی عمارت تعمیر ہوتی ہے ، اگر اس میں کہیں سے کوئی نقص اور کمی آجاتی ہے تو پھر دین کمزور اور اس کے دوسرے اقدار بالکل بے روح ہو کر رہ جاتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم یہی رہی کہ ،

لا الہ الا انا فاعبدون میرے سوا کوئی معبود نہیں تو تم میری ہی عبادت کرو ،

یہود ایک صاحب شریعت قوم تھی جس کو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ پہلے ہی دن یہ سبق دیا گیا تھا کہ ،

لا الہ الا انا فاعبدنی میرے سوا کوئی معبود نہیں تو تم میری ہی عبادت کرو ۔

واقم الصلوٰة لذکری (طٰہٰ) — اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو

مگر یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ عقیدۂ توحید میں رخنہ اندازی کی اور اس چشمۂ صافی کو کفر و شرک اور فسق و فجور سے گدلا کرنے کی برابر کوشش کی، جزیرۂ عرب کے یہود بھی اس جرم میں دنیا کے دوسرے یہود سے پیچھے نہیں تھے، قرآن گو واضح طور پر ان پر کفر و شرک کے ارتکاب کا الزام عائد کرتا ہے۔

لعنہم اللہ بکفرھم[1] (نساء) — ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت کی

سورہ نساء کے آخر میں ان کے بارے میں د بکفرھم کے الفاظ بار بار دہرائے گئے ہیں گویہ کفر، کفر باللہ ہو، مگر کفر باحکام اللہ تو ضرور تھا، جیسا کہ ایک جگہ قرآن نے ان کے بارے میں واکثرھم الفاسقون[2]۔ اور ان میں اکثر فاسق ہیں۔ اسی بنا پر قرآن ان سے کہتا ہے کہ۔

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ (آل عمران) — (اے اہل کتاب) آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کریں

وہ شرک میں بھی مبتلا تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے تھے[3]

وقالت الیہود عزیر ابن اللہ — اور یہود نے کہا کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔

انہوں نے اپنے علماء احبار کو وہ مرتبہ اور درجہ دے دیا تھا جو صرف اللہ ہی کیلئے مخصوص ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (توبہ) — انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو اپنا رب بنا رکھا ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں بعض یہودیوں مثلاً رفاعہ بن زید وغیرہ کا واقعہ تفسیروں میں درج ہے، [2] آل عمران،
[3] بعض مستشرقین نے لکھا ہے کہ صحف قدیم میں اسکا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ اسوقت یہود کا یہ عقیدہ ہے یہ بحث طویل ہے اس لئے ہم نظر انداز کرتے ہیں، مختصراً اتنا لکھ دینا کافی ہو کہ یہودیوں میں یہ خیال عیسائیوں کے اثر اور انکی ضد سے پیدا ہوا، اور عرب کے یہودیوں میں ظہور اسلام کے وقت یہ عقیدہ تھا چنانچہ طبری وغیرہ نے متعدد یہود کا نام بھی لیا ہے، مثلاً فنحاص سلام بن مشکم وغیرہ، پھر انکے اس قول نحن ابناء اللہ واحباءہ اور اتخذوا احبارھم وغیرہ کو سامنے رکھا جائے تو اس میں کوئی تعجب باقی نہیں رہتا۔

یہ آیت یہود اور نصاریٰ دونوں کے بارے میں ہے، نصاریٰ کے سوءاعتقاد کے بارے میں حضرت عدیؓ بن حاتم کی روایت حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہے، یہود سے متعلق اس آیت کی تفسیر میں طبری میں یہ روایت ہے کہ۔

قال الربیع قلت لابی العالیہ کیف کانت الربوبیۃ فی بنی اسرائیل قال ما امرونا ائتمرنا وما نھونا عنہ انتھینا لقولھم وھم یجدون فی کتاب اللہ ما امروا بہ وما نھوا عنہ فاستنصحوا الرجال۲	ربیع نے ابو العالیہ سے پوچھا کہ بنو اسرائیل نے کس طرح سے اپنے احبار کو ارباب بنا لیا تھا، انھوں نے فرمایا کہ جس چیز کا وہ احبار حکم دیتے تھے اسکو ہم کرتے تھے، اور جس بات سے وہ روکتے تھے ہم رک جاتے تھے یہ سب انکے کہنے کیوجہ سے کرتے تھے حالانکہ وہ باتیں کتاب میں موجود ہوتی تھیں، چنانچہ اسطرح انہوں نے احبار و علماء کے اقوال وافعال کو اختیار کر لیا اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈالدیا۔
(طبری ج ۱۰ص ۷۰)	

اس کفر وطغیان نے ان کے قلوب کو اتنا سخت اور ان کے ذہن و دماغ کو اسقدر ماؤف کر دیا تھا کہ وہ خدائے قدوس کے بارے میں گستاخانہ اور طنز آمیز الفاظ استعمال کرنے لگے تھے۔

وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ	یہود کہتے تھے کہ اللہ کا ہاتھ تنگ ہوگیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ وہ کہتے تھے،

ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء	اللہ فقیر اور ہم غنی ہیں۔

کتاب الٰہی (توراۃ) کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ کچھ اچھا نہیں تھا، وہ کتاب کی تاویل و تفسیر اپنی خواہشات اور دنیاوی اغراض کے تحت کرتے تھے۔ قرآن میں ہے،

۱ے اس انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو العالیہ بھی اہل کتاب میں تھے، یہ غلام تھے، اسلئے ان کے اہل کتاب ہونے کا اور بھی قوی امکان ہے ۲ے طبری ج - ص ۷۰

يحرفونه من بعد ما عقلوه وهم يعلمون ... يكتبون الكتاب بايديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا (بقرہ)

پھر اسکو بدل ڈالتے تھے اس کے سمجھنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ کچھ روپئے پیسے حاصل کریں۔

جب اس معنوی تحریف سے کام نہ چلتا تو کلام الٰہی کو چھپا دیتے (مائدہ) اگر ضرورت پڑتی تو لفظی تحریف بھی کر ڈالتے[1]

يحرفون الكلم من بعد مواضعه (مائدہ) — کلام الٰہی کو اسکے موقع و محل سے بدل دیتے ہیں

يحرفون الكلم عن مواضعه (مائدہ) — وہ کلام الٰہی کو اسکے موقع سے بدلتے رہتے ہیں

یہ تو پڑھے لکھے یہودیوں کا حال تھا، جو اپنی ہر خواہش اور غرض کی تکمیل کیلئے کتاب اللہ کو آلۂ کار بناتے تھے، اور اس کی من مانی تفسیریں کرتے تھے، لیکن ان کے عوام جو ان اسلحہ کا استعمال نہیں جانتے تھے، وہ صرف اپنی خواہشوں اور تمناؤں ہی کو آخری سند سمجھتے تھے

ومنهم اميون لا يعلمون الكتب الا امانى (بقرہ - ۱۰)

اور ان میں بہت سے ناخواندہ ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن دل خوش کن باتیں۔

حضرت زید بن سعنہ کے حالات میں تحریف کی ایک مثال آئے گی۔ جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ اس میں کس درجہ بے باک تھے،

ختم رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں تورات میں جو پیشین گوئیاں اور بشارتیں تھیں، اور جن کو پڑھ کر متعدد صالح الفطرت یہود حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کو انہوں نے چھپانے کی کوشش کی، اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ رجم سے متعلق، تورات کے حکم کو بھی انہوں نے پوشیدہ رکھنا چاہا۔

---

[1] اس سلسلہ میں متعدد واقعات عہد نبوی میں پیش آئے جنہیں سے بعض کا تذکرہ اوپر آچکا ہے

مگر بعض حق پرست علمائے یہود نے اسے آپ پر ظاہر کر دیا، اور آپ نے اس کے مطابق عمل کیا، (بخاری ومسلم)

انبیاء ورسل کے ساتھ بھی انہوں نے ہمیشہ طغیان وسرکشی ہی کی روش اختیار کی یہاں تک کہ ان نفوس قدسیہ میں سے بعض کو انہوں نے قتل کر ڈالا، اسی وجہ سے حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے ان پر لعنت کی، (مائدہ)

جزیرہ عرب کے یہودی بھی اس بارے میں اپنے پیشرؤں سے کچھ مختلف نہیں تھے، حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ یہودی تھے (آل عمران) قرآن نے ان کے اس خیال سے تردید کی (آل عمران) نبوت ورسالت صرف یہود کیلئے مخصوص سمجھتے تھے (جمعہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کے پیشرؤں نے اپنے وقت کے انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ کیا، تفصیل آگے آتی ہے۔

فرشتوں کے متعلق ان کے خیالات عربوں سے بالکل مختلف تھے، عرب ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، اور یہ ان سے دشمنی وعداوت رکھتے تھے، خصوصیت سے حضرت جبرئیلؑ کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ ان کا قدیم دشمن ہے، قرآن نے ان کے اس خیال کی شدت سے تردید کی [۱]

مشرکانہ اوہام وخرافات، جادو، گنڈا، اور عملیات وغیرہ پر ان کا اعتقاد تھا، لبید، عاصم وغیرہ بہت سے یہودی عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے [۲] یہ ان کے دینی معائب کا ایک مختصر خاکہ ہے، جن میں وہ دور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم تک مبتلا تھے اب ان کے اخلاق ومعاملات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

---

[۱] اس سلسلہ میں طبری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ سے یہود کی گفتگو کو نقل کیا ہے ج ۱، ص ۴۲۷ [۲] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الطب،

اخلاق ومعاملات | اخلاق ومعاملات کے اعتبار سے جزیرۂ عرب کے یہود نہایت ہی گرے ہوئے تھے، یہ اخلاقی گراوٹ ان ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس میں ہر جگہ کے یہود برابر کے شریک تھے، ان کے اخلاق واعمال حد درجہ مبتذل، رکیک اور قابل نفریں تھے جنکا انسانیت، شرافت اور فضائلِ اخلاق سے کوئی دور کا بھی تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا، سورہ بقرہ اور آل عمران میں خاص طور سے ان کے ایک ایک عیب کی نشاندہی کی گئی ہے، ذیل کی سطروں میں ان کے چند بنیادی عیوب کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

نفاق | یہود حجاز جن اخلاقی کمزوریوں کا شکار تھے ان میں سب سے اہم منافقت ہے یہ روح انسانی کیلئے ایسا روگ ہے جو انسان کی تمام اخلاقی خوبیوں اور فطری صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے، جس فرد یا جماعت میں یہ مرض پیدا ہو جائے اس سے کسی خیر کی امید نہیں کی جا سکتی، چنانچہ یہود حجاز کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان میں بھی نفاق نے اچھی طرح گھر کر لیا تھا، انہوں نے اسلام کے بارے میں مسلسل نفاق کا ثبوت دیا، اور ان کی وجہ سے مدینہ منورہ میں ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا تھا، جو مرتے دم تک اس روگ میں مبتلا رہا، اور اسلام اور مسلمانوں کو نقصان اور اذیت پہنچاتا رہا، قرآن کہتا ہے۔

واذا لقوکم قالوا آمنا واذا خلوا عضوا علیکم الانامل من الغیظ قل موتوا بغیظکم (آل عمران)	وہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب تم سے جدا ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غصہ کے آپ کہدیجئے کہ مر رہو اپنے غصہ میں۔

سورہ بقرہ (ع۔ ۸) میں اسی طرح کی ایک آیت موجود ہے،

دوسروں کو بھی اس نفاق پر ابھارتے تھے

فقالت طائفۃ من اھل الکتاب آمنوا بالذی انزل علی الذین	بعض اہل کتاب نے کہا کہ ایمان لے آؤ اس پر جو مسلمانوں پر نازل ہوا (یعنی قرآن) اور

امنوا وجه النہار واکفروا آخرہ — صبح کے وقت اور شام تک اس سے انکار کردو

لعلہم یرجعون (آل عمران) — شاید کہ وہ پھر جائیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے ساتھ انہوں نے مستقلاً جو منافقانہ طرزعمل اختیار کر رکھا تھا، اس کی پوری تصویر ان آیتوں میں آگئی ہے، وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ نفاق نہیں برتتے تھے، بلکہ اس عادت بد کی وجہ سے اپنوں تک سے منافقانہ پیش آتے تھے، اور ایک دوسرے کو دھوکا اور فریب دیتے تھے، غزوات کے سلسلہ میں متعدد مواقع پر انہوں نے خود ایک دوسرے کو دھوکا دیا[1]

حرام خوری | حرام خوری بھی ان کا شاید قومی خاصہ ہوگیا تھا، قرآن میں ہے ۔

اکّٰلون للسحت (مائدہ) — یہ بڑے حرام کھانے والے ہیں،

سورہ مائدہ میں ان کی حرام خوری کو متعدد بار دہرایا گیا ہے ۔

ان کے سودی کاروبار کا ذکر آچکا ہے، رشوت ستانہ اور ناجائز طریقہ پر شکم پری کے بھی یہ عادی ہوگئے تھے،

واکلہم اموال الناس بالباطل (نساء) — اور ان کے ناحق طریقہ سے مال کھانے کی وجہ سے،

دوسروں کا حق مارنے کیلئے جھوٹی قسمیں کھا جاتے تھے ،

ان الذین یشترون بعہد اللہ وایمانہم ثمناً قلیلا — یقیناً جو لوگ حقیر رقم لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو انہوں نے اللہ سے کیا ہے، اور بمقابلہ اپنی قسموں کے

اس سلسلہ میں حضرت اشعثؓ اور ایک یہودی کا واقعہ تفسیروں میں ملتا ہے ۔

ان کے علماء و احبار بھی دوسروں کا مال ہڑپ کر لیتے تھے، (توبہ)

---

[1] مثلاً غزوۂ نضیر اور غزوۂ خندق وغیرہ کے مواقع پر ،

حرص وطمع | یہ مالدار اور خوش حال تھے، مگر ان کی حرص وطمع کا یہ حال تھا کہ دو دو چار چار روپے کے لئے معصوم بچوں کو ہلاک کروا دیتے تھے[1]، سودی قرضوں میں بچوں اور عورتوں کو رہن رکھ لیتے تھے[2] ان کے پاس سونے چاندی کا ڈھیر تھا، مگر راہِ حق میں ایک پیسہ بھی نہیں خرچ کر سکتے تھے،

والذین یکنزون الذھب	(حرص کی وجہ سے) جو لوگ سونا چاندی جمع کر
والفضۃ ولا ینفقونہا فی	رکھتے ہیں، اور ان کو اللہ کی راہ میں
سبیل اللہ (توبہ)	خرچ نہیں کرتے،
ام لہم نصیب من الملک فاذا	کیا ان کے پاس سلطنت کا کوئی حصہ ہے اگر ہوتا تو
لا یاتون الناس نقیراً (نساء)	وہ ایک ذرہ برابر اس میں سے دوسروں کو نہ دیتے

خیانت | خیانت حرص وطمع ہی کا نتیجہ ہے، چنانچہ ان میں یہ عیب بھی موجود تھا،

ومنہم من ان تامنہ بدینار	ان میں بعض ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار
لا یؤدہ الیک الا مادمت	بھی امانت رکھو تو تم کو وہ ادا نہ کریں گے جبتک
علیہ قائماً (آل عمران)	کہ تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ،

پھر اس خیانت کو اپنے لئے جائز اور اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے،

قالوا لیس علینا فی الامیین	(یہ خیانت) اسلئے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ غیر اہل کتاب
سبیل (آل عمران)	(کے مال) کے بارے میں ہم پر کوئی جرم نہیں،

بغض وحسد | بغض وحسد کا جذبہ ایک بدترین جذبہ ہے، اس کی موجودگی میں کبھی حق وانصاف کا جذبہ آدمی کے دل میں پرورش نہیں پاتا، جس کے اندر یہ جذبہ موجود ہوتا ہے اس کو دوسروں کی خوبیاں اور بھلائیاں نظر ہی نہیں آتیں، یا اگر نظر آتی ہیں تو وہ ان کی طرف سے صرف نظر کر لیتا ہے، اگر کسی کو کوئی شرف اور فضل حاصل ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کو

---

[1] صحیح ... [illegible] ... اعتکام ... [illegible]

انتہائی تکلیف ہوتی ہے یہود کی زندگی اس برے جذبہ کا مکمل نمونہ تھی

ام یحسدون الناس علیٰ ما اتا	کیا دوسرے آدمیوں سے ان چیزوں پر جلتے ہیں
ھم اللہ من فضلہ (نساء)	جنہیں اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کی ہیں،
ھا انتم اولاء تحبونہم و لا	ہاں تم ایسے ہو کہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہو
یحبونکم (آل عمران)	اور یہ لوگ تم سے قطعاً محبت نہیں رکھتے،

قرآن نے ان کے اسی بغض وحسد کی بنا پر فرمایا کہ

موتوا بغیظکم	اپنے غصہ سے مر رہو،

دروغ گوئی اور بدعہدی دروغ گوئی، بدعہدی اور جھوٹی قسمیں کھانا ان کا شیوہ تھا،

سمّٰعون للکذب (مائدہ)	یہ لوگ غلط باتوں کے سننے کے عادی ہیں،
اتخذوا ایمانہم جنۃ (مجادلہ)	انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے،

عہد نبوی میں ان کی دروغ گوئی اور بدعہدی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، معاہدہ کے ذکر میں، اس کی تفصیل آئے گی

اسی طرح وہ فواحش اور بے حیائیوں سے بھی باز نہیں رہتے تھے، عرب عورتوں کو چھیڑا کرتے تھے، اور ان سے کھلا ہوا مذاق کرتے تھے، کعب بن اشرف ان کا مشہور شاعر اس میں بہت بدنام تھا، ایک مرتبہ ایک انصاری بزرگ نے اس سے قرض مانگا تو اس نے ان سے برجستہ کہا کہ اس کے بدلے اپنی بیوی کو میرے یہاں گرو رکھدو، اس کی دنائت اور اس کا سفلہ پن اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ازواج مطہرات، اور صحابیات کا نام لیکر تشبیب [1] کرتا تھا [2]

ایک برائی ان میں یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شریف ومعزز آدمی زنا کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی اور کم رتبہ آدمی اسکا ارتکاب کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے [3]

---

(۱) وہ اشعار جن میں حسن وعشق کے جذبات ظاہر کئے جائیں (۲) طبقات الشعراء ص ۱۱، (۳) صحیح مسلم باب رجم یہود

ان میں خود غرضی اور قساوتِ قلبی بھی حد درجہ تھی، جس کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے یہودی بھائیوں کو گھر سے نکال دیتے، اسی خود غرضی کی وجہ سے وہ آپس میں برابر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے خلاف اپنے دشمنوں تک کو مدد دیتے تھے[1]

قرآن نے ان کے ان معائب کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

تقتلون انفسکم وتخرجون	تم ایک دوسرے سے قتل وقتال بھی کرتے ہو
فریقاً منکم من دیارھم (بقرہ)	اور ایک دوسرے کو گھروں سے نکالتے ہو،
تحسبھم جمیعاً وقلوبھم	تم انکو متفق خیال کرتے ہو حالانکہ ان کے دل
شتّٰی (حشر)	آپس میں متفق نہیں ہیں،

اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت مسند احمد میں ہے، آپ نے فرمایا کہ جاہلیت میں یہود دو گروہ میں بٹ گئے تھے، ان میں ایک غالب تھا اور دوسرا مغلوب جب غالب گروہ کا کوئی آدمی قتل کیا جاتا تو اس کی دیت مغلوب کو زیادہ دینی پڑتی، اور اگر مغلوب کا کوئی آدمی قتل ہو جاتا تو، اس کی دیت کم ملتی، جاہلیت میں تو مغلوب گروہ، اس ظلم کو برداشت کرتا رہا، مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، ایک بار جب ایسا واقعہ پیش آیا تو اس نے زیادہ دیت دینے سے انکار کر دیا، اور غالب گروہ کے پاس کہلا بھیجا کہ اب نبی موعود صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد یہ ظلم و ستم سہنے کے لئے تیار نہیں ہے[2]۔

پھر ان تمام اخلاقی جرائم پر وہ خوش ہوتے اور چاہتے تھے کہ جو خوبیاں ان میں نہیں ہیں ان پر بھی ان کی تعریف و تحسین کی جائے،

---

[1] اوپر ذکر آچکا ہے [2] مسند ج ۱ ص ۲۴۶

الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (آل عمران) — یہ لوگ اپنے اخلاق و کردار پر خوش ہیں اور جو کام انہوں نے نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو،

ان کے دینی اور اخلاقی انحطاط کا یہ بہت مجمل خاکہ ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس قوم میں اتنا زیادہ دینی انحطاط، اور اتنے زیادہ ذمائم اخلاق ہوں اس کی موجودگی میں کوئی صالح معاشرہ اور پرسکون ماحول کیسے پیدا ہو سکتا ہے، چنانچہ جب تک یہودیوں کا معاشی اقتصادی، سیاسی تغلب اور ان کا زور باقی رہا، پورے حجاز اور خصوصیت سے مدینہ میں سکون و اطمینان کی فضا پیدا نہ ہو سکی، مگر جوں جوں ان کا زور ختم ہوتا گیا، امن و سلامتی کی فضا پیدا ہوتی گئی، تا آنکہ پورا حجاز ان کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں سے پاک و صاف ہو گیا۔

ایسے معائب، مثالب اور ذمائم اخلاق میں گھرے ہونے پر بھی اس بدباطن اور کج فطرت قوم کے جتنے افراد بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، وہ اسلام کی بڑی کامیابی ہے ورنہ ایسا دین جس کے قبول کرنے میں کوئی جبر و سختی نہ ہو[1] اس میں ایسی تیرہ بخت اور دون فطرت قوم کے ایک دو فرد کا داخل ہونا بھی درحقیقت اسلام کا ایک معجزہ ہے۔ (جاری)

---

[1] لا اکراہ فی الدین دین میں کوئی جبر نہیں ہے، چنانچہ مدینہ سے یہودی قبائل کے اخراج کے بعد متعدد یہودی موجود تھے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن ان سے کوئی تعارض نہیں کیا گیا بعض کا تذکرہ اس کتاب میں آیا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے اپنی ایک جائداد کے متعلق اپنے یہودی رشتہ داروں کو وصیت کی تھی،

پیشہ وکالت کی شرعی حیثیت

(۲)

جناب ڈاکٹر منیر احمد مغل ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پاکستان۔

احادیث سے وکالت کا ثبوت

(۱) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کے اونٹوں کی جھولیں اور ان کی کھالوں کو خیرات کر دوں۔

(۲) عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بکریاں دیں کہ آپ کے صحابہؓ میں تقسیم کر دیں۔ تو ایک بکری کا بچہ باقی رہ گیا۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا خود اس کی قربانی کر لو۔

(۳) عبدالرحمٰن بن عوفؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے امیہ بن خلف کو ایک خط لکھا کہ وہ مکہ میں میرے سامان کی حفاظت کرے میں مدینہ میں اس کے سامان کی حفاظت کروں گا جب میں نے خط میں اپنا نام عبدالرحمٰن لکھا تو اس نے کہا میں عبدالرحمٰن کو نہیں جانتا تو اپنا وہ نام لکھو جو جاہلیت میں تھا۔ تو میں نے عبد عمرو لکھا۔ الی آخر الحدیث۔

(۴) ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو خیبر کا عامل مقرر کیا تو وہ آپ کے پاس عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آیا۔ آپؐ نے فرمایا کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں، اس نے کہا کہ ہم ایسی کھجور ایک صاع دو صاع کے عوض یا دو صاع تین صاع کے عوض خرید لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ تمام کھجوریں درہم کے عوض فروخت کرو پھر ان درہموں کے عوض اچھی کھجوریں خرید کر لو۔ اور وزن سے فروخت ہونے والی چیزوں کے متعلق بھی آپ نے اسی طرح ارشاد فرمایا۔

(۵) کعب بن مالک سے روایت ہے کہ ان کے پاس بکریاں تھیں جو مقام سلع میں چرتی تھیں ہماری ایک لونڈی نے دیکھا کہ ہماری ایک بکری مر رہی ہے تو اس نے ایک پتھر توڑ کر اس سے اس بکری کو ذبح کر ڈالا کعب نے لوگوں سے کہا تم نہ کھاؤ جب تک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ لوں ۔ یا یہ کہا کہ کسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجدوں کہ وہ آپ سے دریافت کرے۔ انہوں نے خود اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا اس نے پوچھا جس کو انہوں نے بھیجا تھا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کا حکم دیا ۔ عبیداللہ کا بیان ہے کہ مجھے یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی کہ اس نے لونڈی ہو کر ذبح کر دی عَبْدَہ نے عبیداللہ سے اس کے متابع حدیث روایت کی ہے ۔

(۶) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک خاص عمر کا اونٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی شخص کا قرض تھا وہ آپؐ کے پاس تقاضہ کرنے کیلئے آیا تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اسے دیدو ۔ لوگوں نے اس عمر کا اونٹ تلاش کیا ۔ اس عمر کا اونٹ تو نہ ملا لیکن اس سے زائد عمر کا اونٹ ملا ۔ آپ نے فرمایا ۔ اس کو دے دو ۔ اس آدمی نے کہا آپ نے میرا حق پورا دیدیا اللہ آپ کو بھی پورا دے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرض کو اچھی طور پر ادا کر دے ۔

(۷) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تقاضہ کرنے کے لئے آیا اور شدت اختیار کی ۔ صحابہؓ نے اسے مارنا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو چھوڑ دو ۔ جس کا حق ہوتا ہے وہ اسی طرح گفتگو کرتا ہے ۔ پھر فرمایا کہ اسکو اس کی عمر کا اونٹ دیدو ۔ لوگوں نے عرض کیا ۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عمر کا تو نہیں لیکن اس سے زیادہ کا ہے ۔ آپ نے فرمایا وہی اسکو دیدو ۔ تم میں بہتر وہی شخص ہے جو اچھے طور پر قرض ادا کرے ۔

(۸) مروان بن حکیم اور مسور بن مخرمہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب

ہوازن کا وفد آیا تو آپ کھڑے ہوئے ۔ آپ سے ان لوگوں نے درخواست کی کہ ان کے قیدی واپس کر دیے جائیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس سچی بات بہت پسندیدہ ہے اس لئے دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کر دیا تو قیدی واپس لے لو یا مال ۔ اور میں نے تو ان کے آنے کا جعرانہ میں انتظار کیا تھا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا دس راتوں سے زائد انتظار کیا ۔ جب طائف سے واپس ہوئے تھے ۔ چنانچہ جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چیزوں میں سے ایک ہی چیز واپس کریں گے تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم اپنے قیدیوں کو اختیار کریں گے ۔ (یعنی قیدیوں کو واپس کر دیجئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور اللہ کی تعریف بیان کی جس کا وہ مستحق ہے پھر فرمایا ۔ اما بعد تمہارے یہ بھائی ہمارے پاس تائب ہو کر آئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کے قیدی ان کو واپس کر دوں اس لئے جو شخص بطیب خاطر (بخوشی) واپس کرنا چاہے تو واپس کر دے اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا حصہ باقی رہے اس طور پر کہ جو سب سے پہلی فتح ہو گی تو ہم اس کا عوض دیدیں گے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نہیں جانتے کہ تم میں کس نے اس کو منظور کیا اور کس نے نامنظور کیا ۔ تم لوگ لوٹ جاؤ اور تمہارے سردار ہمارے پاس آکر بیان کریں ۔ لوگ لوٹ گئے اور ان کے سرداروں نے گفتگو کی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹ کر آئے ۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ لوگ قیدی واپس کرنے پر راضی ہیں ۔

(۹) جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا لیکن میں ایک سست اونٹ پر سوار تھا ۔ اور سب سے پیچھے رہتا تھا ۔ چنانچہ میرے پاس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا جابر بن عبداللہ ۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے میں نے جواب دیا ۔ میں ایک سست رفتار اونٹ پر سوار ہوں ۔ آپؐ نے فرمایا تمہارے پاس کوئی چھڑی بھی ہے ۔ میں نے عرض کیا جی ہاں ۔

آپؐ نے فرمایا مجھے دیدو۔ میں نے وہ چھڑی آپؐ کو دیدی۔ آپؐ نے اس کو مارا اور اونٹ اس جگہ سے چلا تو سب سے آگے بڑھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا اس کو میرے ہاتھ بیچ دو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپ ہی کا ہے (یعنی بلا معاوضہ لیجئے) آپ نے فرمایا اس کو میرے ہاتھ بیچ دو۔ پھر فرمایا کہ چار دینار کے عوض میں نے اس کو خرید لیا اور تو مدینہ تک اس پر سوار ہوگا۔ جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو میں اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ آپ نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے میں نے عرض کیا کہ میں نے ایک بیوہ سے نکاح کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کنواری عورت سے کیوں نہ کیا کہ تو اس سے کھیلتا وہ تجھ سے کھیلتی میں نے عرض کیا کہ میرا باپ مرگیا اور کئی بیٹیاں چھوڑ گیا میں نے چاہا کہ ایسی عورت سے نکاح کروں جو تجربہ کار اور بیوہ ہو۔ آپ نے فرمایا تو ٹھیک ہے۔ جب ہم مدینہ پہنچے تو آپ نے فرمایا، اے بلالؓ جابرؓ کو اس کی قیمت دیدو۔ اور زیادتی کے ساتھ دو۔ چنانچہ مجھے چار دینار اور ایک قیراط سونا زیادہ دیا۔ جابر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا۔

ایک قیراط سونا ہم سے جدا نہ ہوتا اور وہ جابر کی تھیلی میں برابر رہتا۔ کبھی جدا نہ ہوتا۔

(۱۰) سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنی جان آپؐ کو ہبہ کردی۔ ایک شخص نے کہا کہ میرا نکاح اس عورت سے کر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا میں نے تمہارا نکاح اس عورت سے اس قرآن کے عوض کر دیا جو تمہیں یاد ہے۔

(۱۱) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی زکوٰۃ کی حفاظت پر مقرر فرمایا۔ میرے پاس ایک شخص آیا اور لپ بھر کر اناج لینے لگا۔ میں نے اس کو پکڑ لیا۔ اور کہا خدا کی قسم میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لیجاؤں گا اس نے کہا میں محتاج ہوں اور مجھ پر بیوی بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ہے اور مجھے سخت ضرورت ہے۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا صبح ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے سخت ضرورت اور بال بچوں کی شکایت کی تو مجھ کو رحم آگیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپؐ نے فرمایا وہ جھوٹا ہے اور وہ پھر آئے گا چنانچہ میں اس کا منتظر رہا۔ وہ آیا۔ اناج لپ بھر کر لینے لگا میں نے اسے پکڑ لیا۔ اور کہا کہ میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤنگا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دو میں محتاج ہوں اور مجھ پر بیوی بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ہے۔ اب میں نہیں آؤنگا۔ چنانچہ مجھے رحم آگیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا جب صبح ہوئی تو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے سخت ضرورت بیان کی اور بیوی بچوں کی ذمہ داری کی شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آگیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا یاد رکھو وہ جھوٹا ہے پھر آئے گا۔ میں تیسری رات اس کا منتظر رہا۔ وہ آیا اور اناج لپ بھر کر لینے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ضرور لے جاؤنگا اور یہ تیسری بار ہے تو نے ہر بار یہی کہا کہ پھر نہیں آؤنگا لیکن تو ہر بار آجاتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں تمہیں ایسے کلمات بتاؤں گا۔ جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تم کو فائدہ پہنچائے گا۔ میں نے پوچھا وہ کیا ہیں۔ اس نے کہا جب تو اپنے بستر پر آجائے تو آیۃ الکرسی لاالہ الا ھوالحی القیوم آخر آیت تک پڑھے۔ اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تیری نگرانی کرے گا اور صبح تک شیطان تیرے پاس نہیں آئے گا۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تیرے رات کے قیدی کا کیا ہوا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے کہا کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھائے گا جس سے اللہ تعالیٰ مجھ کو فائدہ پہنچائے گا۔ اس لئے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ آپ نے پوچھا وہ کلمات کیا ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس نے مجھ کو بتایا کہ جب تو اپنے بستر پر جائے تو اللہ لاالہ الا ھوالحی القیوم والی آیت کو

آخر تک پڑھا کرو اس طرح اللہ کی طرف سے تیرا ایک محافظ ہوگا۔ اور تیرے پاس صبح تک شیطان نہیں آئے گا اور صحابہؓ خیر کے بہت حریص تھے، آپ نے فرمایا کہ یہ تو اس نے ٹھیک کہا لیکن وہ بہت جھوٹا ہے۔ اے ابوہریرہؓ تم جانتے ہو کہ تین رات تم کس سے گفتگو کرتے رہے ہو۔ ابوہریرہؓ نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے فرمایا وہ شیطان تھا۔

امام غزالیؒ کے نزدیک وکالت

امام ابوحامد محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء علوم الدین میں فرماتے ہیں۔
لفظ توکل مشتق وکالت سے ہے جس کے معنیٰ دوسرے پر اعتماد کر کے کام سپرد کرنے کے ہیں جس کو کام سپرد کرتے ہیں اس کو وکیل کہتے ہیں اور جو کام سپرد کرتا ہے اس کو موکل اور متوکل کہتے ہیں بشرطیکہ وکیل پر اس کے نفس کا اطمینان اور اعتقاد ہو اور اسکو متہم عجز اور قصور کا نہ سمجھتا ہو غرضیکہ توکل صرف وکیل پر اعتماد دلی کو کہتے ہیں۔ اب ہم مقدمات کے وکیل کو بطور مثال فرض کئے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دوسرے پر فریب سے جھوٹا دعویٰ کرے اور مدعا علیہ اس سے لڑنے کے لئے اپنی طرف سے ایسے شخص کو وکیل کرے جو اس کا فریب واشگاف کر دے تو وہ وکیل پر متوکل اور اعتماد کرنے والا اور اس کی وکالت پر مطمئن نہ کہلاوے گا جب تک کہ چار باتوں کا معتقد اس میں نہ رکھتا ہوگا۔

(۱) نہایت درجے کی ہدایت

(۲) قدرت کاملہ

(۳) غایت مرتبہ کی فصاحت

(۴) شفقت تام

صداقت اس لئے کہ اس کے باعث فریب کے مقامات جان لے یہاں تک نازک و باریک چیلے بھی اس سے ہرگز چھپے نہ رہیں ۔

قدرت اس لئے کہ حق کی تصریح کرے ۔ حاکم کی منہ دیکھی بات نہ کہے رعب میں نہ آوے شرم و نامردی اظہارِ حق میں روا نہ رکھے اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وکیل کو وجہ فریب طرف ثانی کی معلوم ہو جاتی ہے مگر وہ خوف یا نامردی یا حیا یا کسی اور مانع کے باعث جس سے دل تصریح حق سے ضعیف ہو جاتا ہے اس کو زبان پر نہیں لاتا ۔

فصاحت اس لئے کہ یہ بھی ایک طرح کی قدرت لسانی ہے کہ دل جس بات پر جرأت کرے اور ارشاد کرے اس کو اچھی طرح بیان کر سکے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص فریب کے موقعے جانتا ہو وہ اپنی تیزی زبان سے اس کا عقدہ بھی حل کر دیا کرے ۔

شفقت تام اس لئے کہ اس کے باعث جس قدر کوشش وکیل سے اس کے حق میں ہو سکے اس کو بجا لائے کیونکہ صرف مقدمہ لڑانے پر وکیل کا قادر ہونا کافی نہیں جب تک کہ عنایت توجہ متوکل کے حال پر نہ ہو اور اس کے کام کو ضروری اور قابل دل لگانے کے نہ سمجھے اور اگر ایسی صورت ہو کہ طرف ثانی جیتے تو کچھ غرض نہیں اور متوکل جیتے تو کچھ پرواہ نہیں ۔ اس کا حق مارا جائے گا یا باقی رہے کسی سے کچھ مطلب نہیں ۔

پس اگر متوکل کو ان چاروں باتوں میں خواہ ان میں سے ایک میں بھی شک ہوگا ۔ یا اس کے عندیے میں طرفِ ثانی ان چاروں میں کامل تر ہوگا تو اس کو اپنے وکیل پر خوب اطمینان نہ ہوگا بلکہ دل میں متردد رہے گا اور ہمہ تن اس بات کی تدبیر نکالے گا کہ کس طرح وکیل میں جو کمی ہے دور ہو جائے اور طرفِ ثانی کا غلبہ فرو ہو اور جسقدر متوکل کو ان چاروں باتوں کا وکیل پر اعتقاد ہوگا ۔ اسی قدر اس کا اس پر اعتماد اور اطمینان سمجھنا چاہیئے ۔

عصر حاضر میں پیدا ہونیوالے مسائل

(۱) کیا وکیل مقدمہ میں فیس لے سکتا ہے | وکیل معدمہ لو موجبات مقدمہ مخالف کے موجبات مقدمہ ۔

عدالت میں حاضری ۔ مقدمہ کی پیشی پر پیروی ۔ شہادت کی ادائیگی ۔ جرح ۔ بحث ۔ قانونی اور واقعاتی دلائل سب پر اپنی صلاحیتوں اور وقت وقوت کو صرف کرنا ہوتا ہے اس لئے ان سب باتوں کے تحت اس کا محنتانہ وصول کرنا کسی طور پر بھی خلاف شرع نہیں ۔

(۲) کیا وکیل کا غلط بات کو سچ ثابت کرنا جائز ہے | غلط بات کو سچ ثابت کرنا کسی طور

پر بھی جائز نہیں ۔ بشرطیکہ وہ واقعی غلط ہو ۔ حق تلفی کرنا گناہ ہے اور وکیل اپنے موکل کو حق تلفی سے بچاتا ہے بعض اوقات حق تو ہوتا ہے مگر اسکو ثابت کرنا اور باور کرانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے جس کے لئے بڑی معلومات اور گہری نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو عام سطح کے لوگ نہیں سمجھ سکتے ۔ وکیل کا کام ہے کہ پوری محنت کر کے حق کو محفوظ کرے ۔ ایسا کرتے وقت اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حق کو بھی ناحق وصول کرنے سے بچے ۔

وکیل کو کیسا مشورہ دینا چاہیئے

وکیل کو کوئی ایسا مشورہ نہ دینا چاہیئے جو معاشرے میں صدق وعدل کے منافی ہو اور

جور و ظلم برپا کرنے والا یا اس کا معاون ہو۔ حقوق و فرائض۔ قوانین و قواعد۔ عدل و انصاف اور قانون کا احترام سب احترام آدمی کے لئے ہیں کہ اس کی جان و مال آبرو محفوظ رہے اور کسی طور پر بھی ان کی پامالی یا غصب نہ ہونے پائے اور اگر ہو جائے تو اس کا ازالہ ہو سکے ازالہ کی شکلیں بلاشبہ مختلف ہوں گی۔ لیکن اگر بجائے ازالہ کے مجرم کو تحفظ مل جائے۔ یا غاصب خود کو محفوظ محسوس کرنے لگے تو اس کا انجام معاشرے کی تباہی ہوگی۔

۱ اسلام تمام تر مسلمانوں میں عدل کی روح جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہے اور یہ عدل صرف عدالتوں کی حد تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا آغاز گھر سے ہوتا اور گھر سے باہر زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ ایک وکیل، چونکہ اب اصطلاحاً قانون اور اس کی تفہیم ہی سے وابستہ ہے، اس لئے یہ نکتہ اسے دل میں جاگزیں رکھنا چاہیئے کہ تمام تر قوانین وضع ہی اس لئے کئے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعے عدل قائم کیا جا سکے۔ چنانچہ وکیل کے پیش نظر اپنے پیشہ کے اعتبار سے یہی بنیادی نکتہ رہنا چاہیئے کہ اس نے اپنے مؤکل کو عدالت سے عدل کروانا ہے۔ اور اس سے اسے پرہیز کرنا چاہیئے کہ دوسروں کا حق چھین کر اپنے مؤکل کو دلوا دے۔

(۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ پیشۂ وکالت سے وابستہ فرد کو یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ اگر مؤکل سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہے۔ یا اس سے کسی کی حق تلفی ہوئی ہے اور اس کے خلاف دعویٰ پیدا ہوا ہے۔ تو وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کر، محض چند سکوں کے لئے اس کی مدد پر آمادہ ہو جائے اور اپنی تمام صلاحیتیں اس کے ارتکاب جرم کو بے گناہی ثابت کرنے اور اس کے غلط موقف کو صحیح ثابت کرنے پر صرف کر دے۔ کیونکہ اسے جو صلاحیتیں حاصل ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں اور اس کا یہ فرض ہے کہ ان کا استعمال ناجائز طریقے پر نہ کرے، بلکہ ملزم کو اگر بادی النظر دہ مجرم سمجھے، تو اس کی مدد نہ کرے اور نہ یہ سوچے کہ اس ملزم کا مقدمہ ہاتھ میں نہ لے کر وہ رزق سے محروم رہ

گیا ہے کیونکہ خیر الرازقین تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وکیل اپنے منصب کی معنویت کو بھی سمجھے اور توکل علی اللہ کی عملی تفسیر بننے کی کوشش کرے۔ اگر اس پر کسی نے بھروسہ کیا ہے تو وہ جس پر بھروسہ کیا گیا ہے، کس پر بھروسہ کرتا ہے؟۔ اللہ تعالیٰ نے خلق خدا کو رزق بہم پہنچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ اسے کسی بھی طور پر محروم نہیں رہ سکتا اگر ایک مؤکل خود کسی وکیل کا حاجت مند ہے، اور اس کی صلاحیتوں کا طالب ہے، تو پھر وہ کسی طرح رازق کہلا سکتا ہے بہترین رازق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(ختم)

ص ۱۷ کا بقیہ

بجائے دائمی ہزار ہا درہم کا طالب ہوتا ہے جو منفعت دائمی ہو گئی۔ اس فانی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کیونکہ قرون اولیٰ میں جو چند واقعات ملتے ہیں ان میں نفع صرف شہسوار غازی کو ملتا تھا جو اول آتا تھا۔ اس لئے آج کی ریس کے سلسلے میں ان واقعات کا ذکر کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ آج کی ریس میں دیکھنے والے مجاہد ہوتے ہیں اور نہ ہی مجاہد ہوتے ہیں تو یہ سارا معاملہ ہی بالکل غلط قیاس پر مبنی ہے۔ دونوں کا کوئی تعلق نہیں۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حق شفعہ

مسلم پرسنل لا۔ کے سلسلہ میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے جو مداخلتیں ہوتی ہیں ان میں ایک اہم مداخلت حق شفعہ کے سلسلہ میں ہوتی ہے۔ حق شفعہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنی جائداد کسی اجنبی آدمی کو بیچتا ہے تو اس کے بھائی یا قریبی عزیز یا حصے مسلمان پڑوسی کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ شفعہ کا دعوی کرکے اس بیعنامہ کو منسوخ کرادے اور وہ جائداد اس کے حق میں اسی قیمت پر واگذار ہوجائے۔ اس حق کے ختم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ہزاروں لاکھوں جائدادیں غیرمسلموں کے ہاتھ میں چلی گئیں۔ مگر اس سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ حق مسلمانوں سے تو چھین لیا گیا لیکن اب ہریجنوں کو دیدیا گیا ہے۔ اب ہریجن کی جائداد کوئی غیر ہریجن نہیں خرید سکتا۔

حکومت کے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس کا حق باقی رکھنا سیکولرزم کے خلاف تھا مگر ہریجنوں کے سلسلہ میں یہ عین سیکولرزم ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد ؛ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اسی طرح وراثت، ہبہ اور وقف وغیرہ کے سلسلہ میں بھی مسلم پرسنل لا۔ کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اتنے بڑے بڑے مسائل کے سلسلہ میں ہمارے رہنما کیسے خاموش رہ گئے اور صرف دفعہ ۱۲۵ کی ترمیم کو مسلم پرسنل لا۔ کی حفاظت کی ضمانت سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ملت اسلامیہ ہند کے پورے امتیازات کو مجروح کردیا گیا ہے ؎

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ؛ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

Regd. No AZM / N. P. 42 / 84 Phone:-2461
Regd. No. R. N 38937 / 81

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڑھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں ...... ادارے کا خرچ ...... ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپیہ کے قریب ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنے کے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے، مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ر جون سے شروع ہو جاتا ہے۔

[redacted]

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

جامعۃ

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمہ

جامعۃ الرشاد اعظمگڈھ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
۱۲/=

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 25/=
خصوصی معاون ۱۰۰/=
قیمت فی پرچہ 2/50

جلد ۱۳ | جولائی سنہ ۱۹۸۶ء مطابق ذیقعدہ سنہ ۱۴۰۶ھ | شمارہ ۶۰

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی

طباعت: افضل نعیمی پریس سعید روڈ متو۔
کتابت: شوکت علی محلہ بلاقی پورہ دار العلوم روڈ متو

رشحات

دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کے سلسلہ میں جو بل پارلیمنٹ میں پاس ہوا ہے، ابھی اس کی سیاہی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دفعہ ۴۴ یعنی یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی بات ایوانِ حکومت کے اندر اور باہر شروع ہو گئی ہے، اگر اس کا نفاذ ہوا تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ موجودہ ترمیم بے معنی ہو کر رہ جائے۔

اس سے پہلے ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ دستور میں کچھ بنیادی حقوق (Fundamental rights) کی دفعات، اور کچھ راہنما اصول (Directive Principles) ہیں۔ بنیادی حقوق کو نہ صرف ملکی دستور کے اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل ہے، بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے اور راہنما اصول کا تعلق حکومت کے مزاج اور ملکی حالات سے ہے، اگر کبھی بنیادی حقوق اور راہنما اصول میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو بنیادی حقوق کے مقابلہ میں راہنما اصول کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو بنیادی حقوق بے معنی ہو کر رہ جائینگے مثلاً اگر حکومت یکساں سول کوڈ نافذ کرتی ہے تو بنیادی حقوق کی دفعات ۲۵ تا ۳۰ میں اقلیتوں کو مذہب، زبان، تعلیم، تہذیب اور ضمیر کی جو آزادی دی گئی ہے وہ بہر حال متاثر ہوگی، اور گویا دفعہ ۴۴ کا نفاذ بنیادی دفعات پر براہ راست اثر انداز ہوگا۔ مگر اس تضاد کے باوجود سپریم کورٹ کے جج صاحب نے شاہ بانو کے مقدمہ میں اس کے نفاذ کی سفارش کی تھی اور اب حکومت کے سب سے بڑے ذمہ دار اور ہمارے ملک کے وزیر اعظم نے بنگلور میں یکساں سول کوڈ کے اختیاری نفاذ

کی بات دہراتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ پہلی آواز نہیں ہے بلکہ آزادی کے بعد ہی سے اس کے لئے زمین ہموار کی جارہی ہے۔

ہم اس سے پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اور آج پھر اسے دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جس وقت دستور ساز اسمبلی میں دفعہ ۴۴ پر بحث ہو رہی تھی ہمارے راہنماؤں نے اسی وقت بنیادی دفعات سے اس کے ٹکراؤ کو محسوس کر لیا تھا اور انھوں نے ترمیم پیش کی مگر ان کی ساری ترمیمیں رد ہو گئیں، دفعہ ۴۴ میں کہا گیا ہے کہ:-

The state shall endeavour to secure for citizens a uniform civil code throughout the territory of India.

"ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ ہو"

اس میں دستور ساز اسمبلی کے تین مسلم ممبران جناب محمد اسماعیل صاحب، نذیرالدین صاحب اور محبوب علی بیگ صاحب نے اپنی ترمیمیں پیش کیں، اسماعیل صاحب کی ترمیم یہ تھی:-

Provided that any group, section or community of people shall not be obliged to give up its own personal law, in case it has such a law.

(Directive principles in the Indian Constitution: by K.C Markanden P. 193)

ان ترمیموں پر کئی ہندو ممبران نے بحثیں کیں، جن میں کے. ایم منشی، ایم. آر. مسانی، اے. کے آئر خاص طور پر قابل ذکر ہیں. کے. ایم منشی نے تو یہاں تک کہا کہ:-

It was the desire of the formers of the constitution to divorce religion form Personal law

(do P. 195.)

اس دستور کی تشکیل کرنے والوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ مذہب سے پرسنل لاء کو طلاق دلوائی جائے۔"

اس بحث و مباحثہ میں ڈاکٹر امبیڈکر نے حصہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ جو لوگ یکساں سول کوڈ نہیں چاہیں گے ان پر لادا نہیں جائے گا۔ بہر حال اس بحث و مباحثہ کے بعد تمام ترمیمیں رد کر دی گئیں۔

یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ ہمارے برادران وطن کے پڑھے لکھے طبقے کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ مسلم پرسنل لاء کو اگر پورے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو اس سے علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہوگا، اور قومی یکجہتی کو نقصان پہونچے گا، مگر ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ علیحدگی پسندی کو تقویت مسلم پرسنل لاء سے نہیں بلکہ ان کی تنگ نظری کی وجہ سے ملتی ہے، اور قومی یکجہتی کو نقصان ان کے طرز عمل سے پہونچ رہا ہے۔

آج ملک کے سامنے آسام اور میزورم کا مسئلہ ہے، پنجاب کا مسئلہ ہے، دکن میں ہندی زبان کا مسئلہ ہے، ان کے علاوہ بے شمار مسائل ہیں، جن سے نہ صرف قومی یکجہتی کو نقصان پہنچ رہا ہے، بلکہ علیحدگی پسندی کے رجحان کو تقویت مل رہی ہے۔ آپ بتائیں یہاں کون سے پرسنل لاء کا یا مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ ہے، جب تک برادرانِ وطن کے ذہن میں یہ بات رہے گی کہ آریہ نسل کے جو لوگ چند ہزار برس پہلے بھارت میں آئے، وہ بھارت ماتا کے اصلی سپوت ہیں اور جو لوگ چند ہزار برس بعد میں آئے وہ سوتیلے ہیں، اس وقت نہ قومی یکجہتی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ علیحدگی پسندی کا جذبہ ختم ہو سکتا ہے۔

ضمنی بات اس لئے عرض کر دی گئی ہے کہ مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کی اصلی وجہ یہی ذہنی تنگ نظری ہے اور اس ذہن کے ساتھ دستور میں آہستہ آہستہ ایسی ترمیمات لائی جا رہی ہیں جن کے ذریعہ کامن سول کوڈ قابل قبول بنایا جا سکے، یکساں سول کوڈ کی زمین ہموار کرنے کیلئے ابتک جو ایکٹس پاس

ہوتے ان پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔

آج سے بیس برس پہلے پارلیمنٹ نے ہندو کوڈ بل پاس کیا جو دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ء اور دوسرا ہندو سکسیشن ایکٹ ۱۹۵۶ء، ہندو میرج ایکٹ کی رو سے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کی جاسکتی اور طلاق کا حق مرد کو نہیں بلکہ عدالت کو دیا گیا ہے۔ اگر کوئی ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرتا ہے تو انڈین پینل کوڈ میں اسکے لئے سات سال کی سزا تجویز کی گئی ہے۔

اب اسلامی شریعت کی روشنی میں اس ایکٹ پر غور کیجئے تو یہ سراسر خلاف شرع معلوم ہوگا۔ اسلام نے بے شمار معاشرتی مصالح کے تحت ایک شرط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ وہ شرط ہے عدل یعنی ایک سے زاید شادی کی اجازت اس وقت ہے جب وہ دوسری بیویوں کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھ سکے۔ اگر وہ اپنی نفسانیت کی بنا پر عدل وانصاف قائم نہ رکھ سکے تو اس کو اس کی اجازت نہیں ہے۔

دوسری شادی کی اجازت کے اندر بے شمار مصالح بھی ہیں، اور یہ کبھی زندگی کی ایک شدید ضرورت بھی بن جاتی ہے۔ مثلاً بیوی دائم المریض ہو جائے تو اب اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ طلاق دے یا پھر دوسری شادی کرکے اپنی فطری خواہش کو پوری کرے۔ ظاہر ہے کہ طلاق دینے کے مقابلہ میں اس کو اپنے رشتۂ زوجیت میں باقی رکھتے ہوئے دوسری شادی کرلینا اخلاق و انصاف کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

پھر بیواؤں کی شادی کے مسئلہ کے حل میں بھی یہ اجازت معاون ثابت ہوتی ہے۔ کوئی کنوارہ مشکل سے کسی بیوہ سے شادی کے لئے تیار ہوتا ہے تو اس مسئلہ کے حل کی ایک فطری صورت یہی ہے کہ وہ کسی شادی شدہ آدمی کے حبالۂ عقد میں چلی جائے۔ جس سے جنسی بے راہ روی کا ایک بڑا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک شادی کی قید سے انسان کی زندگی کی کون سی ضرورت پوری ہوتی ہے؟ اس میں مغرب کی اندھی تقلید کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ نہیں دکھائی دیتا۔ مغربی تہذیب نے ایک طرف ایک شادی پر پابندی عائد کر رکھی ہے، اور دوسری طرف مرد کو ناجائز

تعلقات قائم رکھنے میں بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اسلامی شریعت نے زندگی کے تمام ہی مسائل میں انسانی فطرت کی رعایت کے ساتھ اخلاقی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کو بھی پیش نظر رکھا ہے اسلئے اس کا راستہ مغربی تہذیب سے بنیادی طور پر مختلف ہے، ہندوستان جو ایک مذہبی اور اخلاقی ملک ہے، افسوس ہے کہ اس کے ذمہ دار مغربی تہذیب کی تقلید میں اپنی تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔

ایسی صورت میں مسلمان حتی الامکان اخلاقی قدروں کو پامال نہ ہونے دیں گے اور ان کا یہ موقف نہ صرف اسلامی شریعت کے لحاظ سے صحیح ہے بلکہ ہم اس کو ملک کی ایک خدمت سمجھتے ہیں۔

دوسری شادی پر پابندی کے ساتھ اس ایکٹ نے طلاق اور خلع کا حق مرد سے چھین کر عدالت کو دے دیا ہے، یعنی اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو کسی معقول وجہ یا بداخلاقی کی بنا پر طلاق دینا چاہتا ہے یا کوئی عورت اپنے ناکارہ یا بداخلاق شوہر سے خلع چاہتی ہے تو اسے عدالت میں درخواست دے کر مہینوں بلکہ برسوں کچہری کا چکر لگانا ہوگا اور طلاق یا خلع کی معقولیت ثابت کرنی ہوگی اور پھر یہ طلاق یا خلع کا حق شادی کے تین سال بعد ہی اسے حاصل ہوگا، آپ غور کریں اس کا ہر جز اسلامی شریعت سے متصادم ہے۔ مثلاً کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق بائن یا مغلظہ دیدیتا ہے تو اس طلاق کو عدالت تو تسلیم کرے گی نہیں، اب وہ مرد اور عورت کیا کریں؟ اس ایکٹ کے لحاظ سے مرد کو اسے اپنی بیوی اور عورت کو اسے اپنا شوہر بنائے رکھنا ہوگا۔ غور کیجئے کہ یہ ایک مسلمان کے لئے نہ صرف اخلاق و پاک دامنی کے لحاظ سے بلکہ معاشرتی لحاظ سے کتنی پریشان کن چیز ہے۔ خلع کے لئے اگر شوہر راضی نہ ہو تو اسلامی شریعت میں اسے دعویٰ کرنے کا حق ہے مگر اس کا طریقہ نہایت سادہ اور آسان ہے۔ موجودہ عدالتوں کی طرح اس میں مہینوں اور برسوں کچہری میں چکر کاٹنا نہیں پڑے گا۔

وراثت کے سلسلہ میں ہندو سیکشن ایکٹ (Hindu succession Act 1959) اس وقت نافذ ہے، عام طور پر اسے ہندو کوڈ بل کہا جاتا ہے، اس میں جو ضوابط بیان کئے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) اوّل درجہ کے ورثا میں لڑکا، لڑکی۔ بیوہ، ماں اور وہ پوتا اور پوتی ہیں جن کے والدین

انتقال دادا کی زندگی میں ہو چکا ہو، ان میں سے ہر ایک کو برابر حصہ ملے گا، البتہ اور پوتیوں کو مشترکہ طور پر ایک حصہ ملے گا۔

(۲) اگر اوّل درجہ کے ورثاء موجود نہ ہوں تو وراثت دوسرے درجہ کے ورثاء میں تقسیم کر دی جائے گی، اگر دوسرے درجہ کے ورثاء نہ ہوں تو تیسرے درجہ کے ورثاء وارث ہوں گے، اس میں چار درجے ہیں۔ اس میں درجہ اوّل میں صرف باپ ہے۔ درجہ دوم میں پوتی کا لڑکا، اور لڑکی اور بھائی بہنیں ہیں۔ درجہ سوم میں نواسے کا لڑکا اور لڑکی اور درجہ چہارم میں بھتیجا، بھانجا اور بھتیجی وغیرہ شامل ہیں۔

میت اگر عورت ہے تو اس کی جائداد اوّلاً لڑکوں اور لڑکیوں اور شوہر کے درمیان برابر تقسیم ہوگی۔ دوسرے درجہ میں شوہر کے ورثاء اور تیسرے درجہ میں ماں باپ۔

یہ پورا وراثتی قانون اسلام کے قانون وراثت سے ٹکراتا ہے۔ اسلام نے بیوی کا حصہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں ¼ اور اولاد ہونے کی صورت میں ⅛ رکھا ہے۔ ماں کا حصہ اولاد ہونے کی صورت میں ⅙ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ⅓ مقرر کیا ہے لیکن ہندو کوڈ بل میں سب کا حصہ برابر ہے۔

اسی طرح باپ کو دوسرے درجہ کے ورثاء میں رکھا گیا ہے، جب کہ اسلام میں باپ کو ہر صورت میں حصہ ملتا ہے۔

غرض کہنے کی یہ ہے کہ اس ہندو کوڈ بل کی روشنی میں یکساں سول کوڈ کے خد و خال کو دیکھا جا سکتا ہے، جس کی طرف پروفیسر جے۔ ڈنکن (جو لندن یونیورسٹی میں اورینٹل لاء کے پروفیسر ہیں) نے اشارہ کیا ہے:۔

The civil code promised in Article 44 of the constitution is like the 'Hindu code of which we have spoken before' a misnomer, but a convenient one. (Religion law

and the state in India, by J. Duncan P. 546.)

"جس سول کوڈ کا دستور کی دفعہ ۴۴ میں وعدہ کیا گیا ہے وہ ہندو کوڈ کی طرح ہے جس کے بارے میں ہم اس سے پہلے گفتگو کر چکے ہیں۔ اگرچہ کہ (ہندو کوڈ) نام کے اعتبار سے غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، لیکن موزوں سول کوڈ یہی ہے۔"

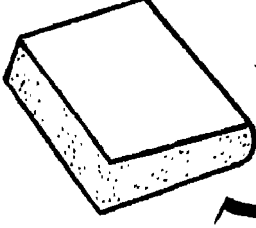
یہ تفصیل اس لئے پیش کی گئی ہے کہ عام طور پر ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کے بعد مسلم پرسنل لا کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جتنی کوشش ۱۲۵ کے بدلوانے میں کی ہے، اس سے کئی گنا زیادہ جدّ و جہد مسلم پرسنل لا کے بقیہ حصّے کی بحالی کے لئے ہمیں کرنی ہو گی، جسے اس وقت معطل کر دیا گیا ہے۔

نوٹ

براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

قرآن کی ایک آیت کا صحیح مفہوم

اور



حضرت ابو شحمہ کا واقعہ

(مجیب اللہ ندوی)

استفسار مندرجہ ذیل واقعات کو واعظین کرام سے مختلف طریقہ سے سنا ہے، اور بعض حضرات اپنے ہی واقعہ بیان کردہ کو صحیح فرما کر دوسرے کے بیان کو غلط قرار دیتے ہیں، لیکن جن لوگوں نے اپنے واقعہ کو صحیح بتلایا ہے، مجھے اس میں بھی شبہ ہے، امید کہ ازالہ فرما کر صحت واقعات سے آگاہ فرمائیں گے۔

(۱) حضرت سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے حضور رب العزت سے درخواست کی، کہ میں تجھ کو دیکھنا چاہتا ہوں تو حکم آیا کہ اے موسیٰ! تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، لیکن تم پہاڑ پر نظر ڈالو (ولکن انظر الی الجبل) جب حضرت موسیٰ نے پہاڑ پر نظر کی، تو حضور رب العزت نے اپنا جلوہ پہاڑ پر ڈالا تو پہاڑ جعلہ دکا وخر موسیٰ صعقا ریزہ ریزہ ہوگیا، اور موسیٰ بے ہوش ہوگئے۔ بعض حضرات واعظین یہاں تک کہتے ہیں کہ طور سینا جل کر راکھ ہوگیا تھا، اور جس کو آج تک ایک عالم بطور سرمہ کے استعمال کرتا ہے، اس سے پہلے عالم وجود میں سرمہ کا وجود نہ تھا۔ کہاں تک صحیح ہے؟

حضور رب العزت نے جب اپنے نور کا پرتو کوہ طور پر ڈالا، تو اس کا جلنا اور خاک سیاہ ہوجانا بعید از قیاس ہے کیوں کہ جلانا نار کا کام ہے، نور کا نہیں، دوسرے وہ تو مظہر الٰہی تھی، نہ کہ قہر الٰہی صحیح اور واقعہ کی جامعیت سے میرے دل اور آنکھوں کو منور فرمائیں۔

(۲) حضرت ابوشحمہ بن عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق واعظین کرام خوب حاشیہ آرائی فرماتے ہیں، یعنی یہ کہ ابوشحمہ نے ایک روز شراب پی، اور بحالت سکر ایک باغبان کی لڑکی سے زنا کر بیٹھے، اتفاق سے باغبان کی لڑکی کو حمل رہ جاتا ہے، اور بچہ پیدا ہوتا ہے اور یہ باغبان کی لڑکی اس بچہ کو لے کر دربار خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں فریادی ہوتی ہے، اور حضرت عمر اس بچہ کا خرچ بیت المال سے مقرر کر دیتے ہیں، اور ابوشحمہ پر حد شرعی جاری کی جاتی ہے، یہاں تک کہ (ثمانین جلدۃ) کے تحت ابوشحمہ پر جب ۵۰ درّے پڑ چکے تو آپ جان بحق ہو گئے، اور بقیہ ۵ درّے ان کی لاش یا میّت پر لگائے گئے۔

(۱) دریافت طلب بات یہ ہے کہ ابوشحمہ نے شراب حدود مصر میں نوش کی، اور دربار حضرت عمرو بن العاص حاکم مصر میں حاضر ہو کر اقبال جرم کیا، جس پر حضرت عمرو بن العاص نے حد شرعی جاری کی، تو کیا دوبارہ خلیفۃ المسلمین سیدنا حضرت فاروق اعظم نے اپنے یہاں بھی حد شرعی جاری کی۔

(۲) اور ابوشحمہ کو دونوں سزائیں یعنی شراب نوشی اور ارتکاب زنا ایک ہی ساتھ دی گئیں، یا الگ الگ یا صرف ایک سزا دی گئی، حضرت عبداللہ بن عمر کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ابوشحمہ کا انتقال اس وقت نہیں ہوا، جس وقت آپ پر حد شرعی جاری کی گئی، بلکہ آپ کا انتقال کسی مرض کی وجہ سے ایک ماہ بعد ہوا، غرض یہ دو واقعات آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، جس پر جمہور کا اتفاق ہو آگاہ فرمائیں۔

حنیف احمد نعمانی، قاضی وارڈ، سکندر آباد

جواب (۱) آپ نے سورۃ اعراف کی جس آیت کے بارے میں سوال کیا ہے، اس کی تشریح و تاویل میں مسلمان فلاسفہ، متکلمین، صوفیہ اور واعظین نے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں جن میں سے ایک دو کا حوالہ آپ نے بھی دیا ہے، مگر صحابہ، تابعین اور انکے بعد کے اہل تحقیق مفسرین نے اس آیت کا جو مفہوم سمجھا ہے، اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے، پوری آیت ملاحظہ ہو:۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا — جب موسیٰ ہمارے مقرر وعدہ پر آئے

وكلمه ربه قال رب ارنى انظر اليك قال لن ترانى ولكن انظر الى الجبل فان استقر مكانه فسوف ترانى فلما تجلى ربه للجبل جعله دكا وخر موسىٰ صعقاً (اعراف ۱۷)۔

اور ان کے رب نے ان کو شرف تکلم بخشا تو انھوں نے کہا کہ اے پروردگار شرف دیدار بھی بخش دے، ارشاد ہوا کہ یہ ممکن تو ہے مگر تم دیکھ نہ پاؤ گے، لیکن اگر یہی چاہتے ہو تو پہاڑ کی طرف دیکھو، تجلی الہٰی کے بعد اگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہ گیا، تو تم بھی میری دید سے سرفراز ہو جاؤ گے، پس جب پہاڑ پر تجلی الہٰی ہوئی تو پہاڑ کو اس نے پاش پاش کر دیا، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اس آیت میں یوں تو بہت سی چیزیں قابل تشریح ہیں، مگر آپ کے سوال کا جواب محض لفظ "دکا" کی تفسیر میں مضمر ہے، اس لئے اس لفظ کی تشریح کے سلسلہ میں مشہور و معتبر اہل لغت، و تفسیر کی روایتیں ملاحظہ ہوں:۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے دکا کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا، جعلہ ترابا یعنی پہاڑ تجلی الہٰی کی وجہ سے پاش پاش ہو کر مٹی کا ڈھیر ہو گیا، ان کے شاگرد عکرمہ نے کچھ اور وضاحت کی ہے، فرماتے ہیں:۔

الجبل كان حجرا اصم فلما تجلى له صار تلا ترابا (ابن کثیر وغیرہ)

یعنی یہ پہاڑ جو ایک سخت چٹان کی طرح تھا تجلی الہٰی کے بعد تو وہ خاک ہو گیا۔

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کی مذکورہ تفسیر کی تائید ائمۂ لغت کی تشریحات سے بھی ہوتی ہے۔ زمخشری اساس البلاغۃ میں لکھتے ہیں، کہ "دک" "اوْدَقَ" دونوں قریب المعنی ہیں، یعنی کسی چیز کو کوٹ کر یا توڑ کر برابر کر دینا، عرب اس کنویں کے لئے جو پاٹ کر برابر کر دیا گیا ہو، بولتے ہیں:۔

دک الركية اى كبسها (ج ۱ ص ۱۶۴)

کنویں کو برابر کر دیا، یعنی اس کو مٹی یا کسی اور چیز سے پاٹ دیا۔

⁂ ⁂ ⁂

امام راغب لکھتے ہیں:۔

الدك الارض الليلة السهلة وارض دكاء مسواة ودكت الجبال دكا جعلت بمنزلة الارض الليلة۔

دک کہتے ہیں اس زمین کو جو ہموار، نرم اور برابر ہو، اور دکت الجبال دکا کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو زمین کی طرح نرم کر دیا،

ابن منظور اور زبیدی وغیرہ نے بھی "دک" کے معنی قریب قریب یہی بتاتے ہیں۔

امام بغوی "معالم التنزیل" میں لکھتے ہیں، کہ اس میں دو قراءت ہے، ایک قرآت میں لفظ "دکاء" ہمزہ کے ساتھ آیا ہے، جیسا کہ سورۃ کہف میں ہے، اور دوسری قراءت "دکا" ہے (بغیر ہمزہ) جن لوگوں نے دکاء ممدودہ پڑھا ہے، انھوں نے اس کے معنی مستویا یعنی برابر کر دینے کے لئے ہیں، چنانچہ عرب اس اونٹنی کو ناقہ دکاء کہتے ہیں، جس کے کوہان نہ ہو، اور اس کی پیٹھ برابر ہو، اور جو لوگ اس کو دکا یعنی مقصور پڑھتے ہیں، اس کے معنی مدقوقاً لیتے ہیں:۔

فمن قصر فمعناہ جعلہ مدقوقاً	جنھوں نے اس کو مقصور پڑھا ہے، اسکے
والدک والدق واحد	معنی انھوں نے مدقوق یعنی کوٹ دیا ہوا
٭ ٭ ٭	لئے ہیں، اور دک اور دق دونوں ہم معنی ہیں۔

انھوں نے ایک معنی اور بھی نقل کئے ہیں:۔

وقیل معناہ دکہ اللہ دکا	دکہ اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اسے
ای فتتہ۔	پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دک کا لفظ کلام عرب میں تین معنوں میں مستعمل ہے، پھاڑ دینا، برابر کر دینا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، اور قرآن مجید میں دک کا لفظ اپنے تینوں مفہوموں کیساتھ مستعمل ہوا ہے، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے سورۃ الفجر کی آیت "اذا دکت الارض دکا دکا" کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"وقتے کہ کوفتہ شود زمین کوفتن بسیار تا آنکہ ریزہ ریزہ شود کوہ ہا و بلندی و پستی زمین ہموار گردد"

قرآن میں ان دو مقامات کے علاوہ بھی یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ ان ہی معنوں میں سے کسی معنی میں مستعمل ہے۔ سورۃ کہف میں ہے، کہ جب ذوالقرنین نے فولادی دیوار تیار کر لی تو وہاں کے باشندوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ:۔

فاذا جاء وعد ربی جعلہ	جب میرے رب کا وعدہ پورا ہو جائے گا تو اسکو
دکاء۔	توڑ پھوڑ کر برابر کر دے گا۔

سورۃ الحاقہ میں قیامت کی ہولناکی کا تذکرہ کرتے ہوئے زمین اور پہاڑوں کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ۔	زمین اور سارے پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لئے جائیں گے اور ان کو کوٹ پیس کر ایک کر دیا جائیگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جعلہ کا مطلب جلا کر خاک سیاہ کرنے کے نہیں، بلکہ توڑ پھوڑ دینے، برابر کر دینے یا مٹی کی طرح ریزہ ریزہ کر دینے کے آتے ہیں۔ جو لوگ کوہِ طور کو سرمہ کی کوئی کان سمجھتے اور سرمہ کی تاریخ کو اس سے وابستہ کرتے ہیں، ان سے فرما دیجئے، کہ پتھر اور مٹی کا کوہِ طور آج بھی جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے، مگر سرمہ والے طور کا وجود اس زمین کے اوپر تو نہیں ہے، ممکن ہے کسی دوسرے عالم میں موجود ہو، جسے واعظین نے دیکھا ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے، کہ اگر کوہِ طور پاش پاش ہو کر مٹی کا ڈھیر ہو گیا تھا، تو کیا اس سطح زمین پر آج بھی وہ اسی حالت میں ہے، یا عام پہاڑوں کی طرح چٹانوں سے ڈھکا ہوا ہے، اگر وہ چٹانوں سے ڈھکا ہوا ہے، تو قرآن کا یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کہ تجلی الٰہی سے وہ ریزہ ریزہ ہو کر مٹی کے مانند ہو گیا۔

محض اس آیت سے اس واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی، تو یہ سوال ضرور پیدا ہوگا۔ لیکن اگر اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو جنہیں قرآن نے دوسرے مقامات پر بیان کیا ہے، سامنے رکھا جائے تو پھر یہ سوال خود بخود حل ہو جائے گا، سورۃ اعراف میں تو اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وواعدنا کم ثلثین لیلۃ۔	ہم نے تم سے تیس راتوں کا وعدہ لیا۔

اس آیت میں یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ وعدہ کس مقام پر پورا ہوا، مگر سورۃ طہٰ میں اس مقام کا ذکر بھی وعدہ کے ساتھ ہی کر دیا گیا ہے:۔

وواعدنا کم جانب الطور الایمن۔	اور ہم نے وعدہ لیا تم سے کوہِ طور کے داہنے جانب آنے کا۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تجلی الٰہی کا ظہور اور جعلہ دکا کا فعل پورے سلسلۂ کوہ پر

ہیں بلکہ ایک خاص حصہ پر ہوا تھا، چنانچہ تفسیر کی بعض روایتوں میں اس حصہ کا نام جبل زبیر[1] بھی بتایا گیا ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ حصہ اب تک ہموار زمین کی شکل میں ہو یا مجری قوت موثر نے پھر اسے پہاڑ کی شکل دے دی ہو، مگر پورا سلسلۂ کوہ اپنی اصلی حالت میں آج کل موجود ہے، اس سلسلہ میں یہ بات بھی آپ کے ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ طور کسی خاص پہاڑی یا پہاڑ کا نام نہیں ہے، بلکہ جزیرہ نمائے سینا کے ایک پورے سلسلۂ کوہ کو طور کہا جاتا ہے جس طرح کوہ ہمالہ اس سلسلۂ کوہ کو کہتے ہیں جو سیکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے جس کے اس حصّہ میں یہ واقعہ پیش آیا جو مصر سے شام جاتے ہوئے پڑتا ہے، اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ حضرت موسیٰ کلام الٰہی اور دیدار الٰہی سے اس وقت نوازے گئے، جب وہ مصر سے بنو اسرائیل کو لے کر شام یعنی بیت المقدس جا رہے تھے۔

اس تفصیل کے بعد اب آپ کے سوال کی اس جز کی تشریح کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، کہ جلانے کا کام نار کا ہے، نہ کہ نور کا، اس لئے کہ قرآن وحدیث یا آثار صحابہ میں کوہ طور کے جلنے پھکنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے اس کی تردید کی گئی ہے، لیکن آپ نے نور و نار کا ذکر چھیڑ دیا ہے، اس لئے چند باتیں اس سلسلہ میں بھی عرض کر دی جاتی ہیں۔

نار اور نور کا جو تصور ہمارے ذہن میں ہے، اور اس کی جدا جدا مادی خاصیتیں جو ہماری اس مادی دنیا میں دیکھنے میں آتی ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ بالکل ان کا اثر بارگاہ قدس میں بھی یہی ہو، اس مادی دنیا میں صفات الٰہی کے جتنے مظاہر آپ کو نظر آتے ہیں، ان پر اگر آپ راہ یاب نہ ہو سکیں گے، دنیا کی تمام قوموں نے اسی جگہ ٹھوکر کھائی ہے، اسی نور کو لیجئے، قرآن وحدیث

م اس ماوراے مادیت ذات کو قیاس نہیں کیا گیا

---

[1] معالم التنزیل آیت ہذا سورۂ اعراف، اس روایت کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں راقم الحروف کوئی رائے قائم نہیں کر سکا ہے، مگر قرآن کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوہ طور کا وہ حصّہ خاص جس پر تجلی الٰہی کا ظہور ہوا تھا، وہ اسی نام سے مشہور رہا ہو، جیسا کہ عموماً بڑے بڑے سلسلہ کوہ کے مختلف حصّوں کے مختلف نام بھی ہوتے ہیں، اور مجموعی طور پر ان کا ایک نام بھی ہوتا ہے۔

[2] اب یہ ایک مشاہد چیز ہے۔

میں نور الٰہی کی جو خاصیتیں اور اس کی جو ہمہ گیری بتائی گئی ہے، کیا وہ اس مادی دنیا میں بھی کہیں دکھائی دے سکتی ہے، قرآن میں ہے:۔

اللہ نور السمٰوات والارض۔ — اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے۔

ظاہر ہے یہ ہمہ گیری کسی دوسرے نور کو تو حاصل نہیں ہے، پھر آگے چل کر اس آیت میں نور الٰہی کو ایک طاق میں رکھے ہوئے، چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ:۔

ولولم تمسسہ نار۔ — اگرچہ اس کو آگ نے نہیں چھویا ہے۔

اس آیت میں نور کس معنی میں مستعمل ہے، اس کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں ہے محض کہنا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چراغ بغیر آگ کے نہیں جلتا، مگر تجلی الٰہی کا چراغ آگ کے بغیر بھی جل سکتا ہے، اور ساری دنیا میں مادی یا روحانی جو روشنی نظر آتی ہے، اسی کا فیضان ہے۔

ہماری مادی دنیا کا چاند سراپا نور ہے، جس سے ہم گرمی نہیں ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں، مگر نور الٰہی جو تمام انوار کا منبع ہے، اس کی ایک ہلکی سی کرن پوری مخلوق کو خاک سیاہ کر سکتی ہے حدیث صحیح میں ہے کہ:۔

لوکشفہ لاحرقت سبحات وجہہ ما انتھی الیہ بصرہ من خلقہ (مسلم) — اگر وہ حجاب ہٹا دے تو اس کے روئے انور کی کرنوں سے ساری کائنات جل اٹھے۔

مگر ذات الٰہی کے سلسلہ میں نار و نور کا تصور ہمارے ادراک سے بالا ہے، اس لئے قرآن نے بار بار یہ اعلان کیا ہے کہ:۔

لیس کمثلہ شئ (مائدہ)۔ — اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

وللہ المثل الاعلیٰ (نحل)۔ — اللہ کی مثال سب سے بلند ہے۔

ولہ المثل الاعلیٰ فی السمٰوات والارض (روم ع ۳) — اس کی مثال یا شان زمین و آسمان میں سب سے زیادہ بلند ہے۔

جب یہ پہاڑ بلکہ زمین و آسمان تک پیغام الٰہی کے اٹھانے کی تاب نہیں لا سکتے تھے، تو پھر تجلی الٰہی جو منبع پیغام ہے، اس کی کیا تاب لا سکتے، قرآن میں ہے:۔

انا عرضنا الامانة على السمٰوات	ہم نے پیغام الٰہی کی امانت کو آسمانوں
والارض و الجبال فأبين	اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا،
ان یحملنها و اشفقن منها۔	پس سب نے انکار کیا اور ڈر گئے۔
لو انزلنا هذا القرآن على جبل	اگر اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو
لرأيته خاشعاً متصدعاً (حشر)	اللہ کے خوف سے پھٹ جاتا۔

مختصراً آیت کا مفہوم یہ ہوا، کہ جب تجلی الٰہی کا ظہور ہوا تو پہاڑ اس کی تاب نہ لاسکا، اور اسکی سنگلاخ چٹانیں پاش پاش ہو کر خاک کا ڈھیر ہو گئیں، اور حضرت موسیٰ جو اس پہاڑ کے ایک جانب کھڑے تھے، یہ کیفیت دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

حضرت ابوشحمہ کا واقعہ

جواب (۲) حضرت ابوشحمہ کے بارے میں جو باتیں آپ نے دریافت فرمائی ہیں وہ بالکل افسانہ ہیں، ان کا کوئی ذکر تاریخ و تذکرہ کی معتبر کتابوں میں نہیں ہے، جن کتابوں میں ان کی شراب نوشی یا ارتکاب زنا کا ذکر ہے، وہ یا تو پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہیں، یا ان کی روائتیں خود اتنی متضاد ہیں، کہ خود ایک روایت دوسری کی تردید کر دیتی ہے، دسمبر ۱۹۴۶ء کے "معارف" میں ایک مضمون حضرت ابوشحمہ رضؓ کے بارے میں شائع ہو چکا ہے، جس میں اس طرح کی تمام روایتوں پر کلام کر کے واقعہ کی صحیح صورت بتانے کی کوشش کی گئی ہے، جس کا خلاصہ اور کچھ مزید باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

ابوشحمہ جن کا نام عبدالرحمٰن الاوسط[1] ہے، ان کو اور عبداللہ بن عمر کو حضرت فاروق اعظم نے

---

[1] حضرت عمر کے تین صاحبزادوں کا نام عبدالرحمٰن تھا، سب سے بڑے عبدالرحمٰن الاکبر کہے جاتے تھے، اور ان کی کنیت ابوعیسیٰ تھی، دوسرے عبدالرحمٰن الاوسط کہے جاتے تھے، جن کی کنیت ابوشحمہ تھی، تیسرے عبدالرحمٰن الاصغر کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

بغرض جہاد مصر بھیجا تھا، اتفاق سے ایک دن ابو شحمہ اور ایک دوسرے صحابی ابو سروعہ نے نبیذ[1] پی، غالباً اس میں سکر آگیا تھا، یا زیادہ پی لینے کی وجہ سے نشہ آگیا، یہ کیفیت دور ہوئی، تو ان کو اس پر ندامت ہوئی، اور یہ خیال ہوا کہ سکر پیدا ہو گیا تھا، اس لئے ان پر حد جاری ہونی چاہیئے، چنانچہ دونوں صاحبان امیر مصر حضرت عمرو بن العاص کے پاس پہونچے' اور:۔

فقالا طهرنا فانا قد سكرنا من	کہا کہ ہم پر حد جاری کر کے پاک کر دیجئے،
شراب[2] شربناه۔	اس لئے کہ ہم نے ایک پینے کی چیز پی،
	جس کی وجہ سے نشہ آگیا۔

خود عمرو بن العاص نے اس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی تھی، اس لئے انھوں نے ان کو کچھ تنبیہ کر کے واپس کر دیا، مگر پھر حضرت ابو شحمہ رض نے اصرار کیا تو حضرت عمرو بن العاص نے اپنے مکان کے صحن میں جہاں وہ عام طور پر حد جاری کرتے تھے، ان پر بھی حد جاری کر دی، مگر حضرت عمر رض کو خبر رسانوں نے یہ اطلاع دی، کہ حضرت عمرو بن العاص نے اجرائے حد میں یہ تساہلی برتی ہے، کہ گھر کے اندر ان پر حد جاری کی ہے، انھوں نے یہ بات سنی تو سخت برہم ہوئے، اور فوراً ایک خط حضرت عمرو بن العاص رض کو لکھا، جس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:۔

بسم الله الرحمن الرحيم	بسم اللہ الرحمن الرحیم
من عبد الله عمر امير المومنين	خدا کے بندے امیر المومنین عمر کی طرف سے
الى العاصى[3] بن العاصى عجبت	گنہگار کے لڑکے گنہگار کی طرف اپنے
لك يا ابن العاصى ولجرأتك	گنہگار کے بیٹے، تیرے اوپر سخت تعجب ہے کہ

---

[1] کھجور کے عرق کو عموماً نبیذ کہتے ہیں، عوام اس کو شراب یعنی پینے کی چیز کہتے ہیں، جب یہ عرق زیادہ دیر تک رہ جاتا تھا تو اس میں نشہ پیدا ہو جاتا تھا، اسی بنا پر ائمہ ثلاثہ اس کو حرام کہتے ہیں، مگر ابتدا میں اس میں سکر نہیں ہوتا، اسی لئے عراق کے فقہا اس کو جائز سمجھتے ہیں، حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

[2] یہ لفظ قابل غور ہے، اگر انھوں نے شراب پی جسے عربی میں خمر کہتے ہیں، تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔

[3] عمرو بن عاص میں عاص کے لفظ کی طرف اشارہ ہے، جس کے معنی گنہگار کے ہوتے ہیں۔

علیٰ وخلاف عهدی[1]۔	تو نے مجھ سے کئے ہوئے وعدے کے خلاف ورزی کی۔

* * *

خط میں حکم تھا کہ ابوشحمہ کو فوراً مدینے بھیجو، حضرت ابن عاص نے ایک خط لکھ کر عبداللہ بن عمر کے حوالہ کیا، اور ابوشحمہ کو سواری دے کر اسی وقت مدینے روانہ کر دیا، خط میں انھوں نے جو صفائی دی تھی، اس کے الفاظ یہ تھے :۔

انی ضربتہ فی صحن داری[2] وباللہ	میں نے ان کو اپنے گھر کے صحن میں کوڑے
لا یحلف باعظم منہ انی لاقیم	لگائے تھے، میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں
الحدود فی صحن داری علے	جس سے بڑی قسم نہیں کھانی چاہیئے، میں اسی صحن
الذمی والمسلم۔	میں تمام مجرموں کو خواہ وہ مسلم ہوں، یا ذمی سزا دیتا ہوں۔

* * *

عبدالرحمٰن ابوشحمہ جب دربار خلافت میں پہونچے تو حضرت عمر نے دوبارہ ان کو سزا دینی چاہی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ان پر حد جاری ہوچکی ہے، دوبارہ حد نہیں جاری کی جا سکتی، مگر حضرت فاروق اپنے اہل وعیال کے بارے میں بہت سخت تھے، اس لئے انھوں نے حد تو نہیں جاری کی، مگر تادیباً کچھ اور سزا دی، ابوشحمہ مصر ہی میں بیمار ہوگئے تھے، مدینہ پہونچ کر اس صدمہ نے ان کی صحت پر اور برا اثر ڈالا، ایک ماہ تک وہ صاحب فراش رہے، اور اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

حضرت عمرو بن عاص اور عبداللہ بن عمر جو اس واقعہ میں شروع سے آخر تک شریک رہے، ان کی روایات کے مطابق ابوشحمہ کا پورا واقعہ محض اتنا ہی ہے، اور قصہ گوؤں نے اور واعظوں نے لطف مجلس کے لئے جو کچھ اضافہ کر دیا ہے، اس کی حیثیت "الف لیلیٰ" اور "طلسم ہوشربا"

---

[1] حضرت عمر نے جب ان کو مصر کا امیر مقرر کیا تھا، تو ممتاز صحابہ نے ان کی مخالفت کی تھی، مگر انھوں نے حضرت عمر کو پورا یقین دلایا تھا، کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے کوئی شکایت پیدا ہو، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] اجرائے حد کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ مجمع عام میں دی جائے، جیسا کہ قرآن میں ہے، صحن میں سزا دینے کی وجہ سے حضرت عمر فاروق کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کے ساتھ خصوصیت برتی گئی ہے۔

کے قصوں سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱) جہاں تک ارتکاب زنا اور اس کی سزا کا تعلق ہے، اس کا ذکر طبری ابن اثیر جزری، حافظ ابن حجر، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن عبدالبر، امام ذہبی، ابن جوزی وغیرہ میں سے کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔

(۲) مذکورہ کتابوں میں سے بعض میں ان کے شراب یعنی خمر پینے کا تذکرہ ہے جو بعض راویوں کی غلطی ہے، اجرائے حد کی وجہ سے انھوں نے گمان کیا کہ شراب پی تھی، لیکن اوپر حضرت عمرو بن العاص اور حضرت عبداللہ بن عمر کی جو روایتیں امام زہری اور محمد بن عمرو غیرہ کے ذریعہ نقل کی گئی ہیں، ان میں خمر کا ذکر نہیں ہے، بلکہ محض ایک پینے کی چیز (شراب بمعنی عربی) کا ذکر ہے، ابن جوزی کہتے ہیں:-

وانما شرب النبیذ متاولاً۔	انھوں نے نبیذ یہ سمجھتے ہوتے کہ اس میں نشہ تو ہوتا نہیں۔ پی

انھوں نے دوبارہ جو سزا دی تھی، وہ حد نہیں تھی وہ تادیب تھی، ابن جوزی لکھتے ہیں:-

واما کون عمر اعاد الضرب علی ولدہ فلیس ذالک حداً وانما ضرب غضباً وتادیباً والا فالحد لا یکرر[1]۔	حضرت عمر کا دوبارہ سزا دینا وہ بطور حد نہیں بلکہ بطور تادیب تھا، اس لئے کہ شرعاً دوبارہ حد جاری نہیں کی جاسکتی۔

ابن اثیر اور ابن عبدالبر لکھتے ہیں:-

فضربہ ابوہ عمر بن الخطاب ادب الولد[2]۔	ان کے والد حضرت عمرؓ ان کو دوبارہ اس حیثیت سے سزا دی جس حیثیت سے ایک باپ اپنے بیٹے کو تادیباً سزا دیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

---

[1] ظاہر ہے کہ حضرت عمر دوبارہ حد کیسے جاری کر سکتے تھے۔

[2] اسد الغابہ والستیعاب۔

(۴) یہ بھی بالکل افسانہ ہے، کہ سزا کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوگیا، اور پھر بقیہ سزا ان کی میت یا قبر پر پوری کی گئی، ابن اثیر اور حافظ ابن عبدالبر دونوں نے یہ لکھا ہے کہ :۔

اما اھل العراق فیقولون انه مات تحت السیاط وذالك غلط۔	اہل عراق کا خیال ہے، کہ وہ کوڑے کھاتے کھاتے جاں بحق ہو گئے، یہ سراسر غلط ہے، انکی موت سزا کے ایک ماہ بعد ہوئی۔

ابن جوزی نے اس پورے واقعہ پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے :۔

وقد اخذ ھذا الحدیث قوم من القصاص فابدوا فیه واعادوا فتارة یجعلون ھذا الولد مضروبا علی شرب الخمر وتارة علی الزنا ویذکرون کلاما مرققا یبکی العوام۔	اس واقعہ کو واعظوں کے ایک گروہ نے لے لیا، اور اس میں خوب رنگ آمیزی کی، کبھی تو وہ کہتے ہیں، کہ ابوشحمہ نے شراب نوشی میں سزا پائی، اور کبھی کہتے ہیں کہ زنا میں، اسی طرح کی رقت آمیز باتیں کرکے عوام کو رُلاتے ہیں۔

امید ہے کہ دونوں سوالوں کے بارے میں خود مستفسر کو اور قارئینِ الرّشاد کو پوری تشفی ہو جائے گی۔

(بقیہ صہ ۳۳ کا)

ہوگا اور وہ کوئی رقم نہیں نکالے گا تو یہ معاملہ جائز ہو جائے گا یہ رائے سعید بن المسیب کی ہے۔ مزید زہری۔ اوزاعی۔ اسحاق اور اصحاب الرائے یعنی حنفیوں کی بھی ہے۔ اس کے برعکس بیان کیا جاتا ہے کہ اشہب نے امام مالک سے محلل کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ میں محلل کو پسند نہیں کرتا۔ اور جابر سے روایت ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا اصحاب رسول محلل کے داخل کرنے میں ہرج سمجھتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس گندگی اور بری بات سے بہت ارفع اور اعلیٰ تھے!

(باقی)

سباق (گھڑدوڑ)
شرعی نقطۂ نظر سے
(۲)

مولانا ریاض الحسن نوری (مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

اس دور میں جو مسابقت ہوتی تھی ۔ یا جس کسی شہسوار غازی کو مال ملتا تھا ۔ اس میں ہر ایک کی نیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ۔ اعلاء کلمۃ الحق کی ہوتی تھی ۔ وہ ایک مذہبی فریضہ کے طور پر ہوتی تھی ۔ آج کے دور میں گھڑ دوڑ کسی مذہبی فریضہ یا جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نہیں ہوتی ۔ پس اس کا قیاس قرون اولٰے کے غازیوں کی دوڑ سے کرنا گویا شراب کا قیاس آبِ کوثر سے کرنا ہے ۔ جو آخرت میں ملے گی ۔ ایسا قیاس نہ صرف قیاس مع الفارق ہے بلکہ گناہ بھی ہے ۔

جدید دور میں ریس کا تعلق ، جرائم اور جرائم پیشہ افراد سے ہے اور جتنی تباہی اس سے پھیل رہی ہے اس کے لئے یہاں گفتگو کرنے کی بجائے ایک تحقیقی کتاب ۔ The sociology of social prodlems. کے متعلقہ ابواب دیکھے جا سکتے ہیں ۔ ریس کلب والوں کا جو کتابچہ "سباق اسلامی" نامی ہے اس کے ٹائٹل پر لکھا ہے کہ "گھڑ دوڑ کے جواز میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز محلل" خاکسار کے نزدیک ان کا یہ دعویٰ درست نہیں !

حدیث پر بحث

اب ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ صحیح حدیث کونسی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں۔

قال النووی رحمۃ اللہ علیہ (الصحیح اقسام ۱ علاھا ما اتفق علیہ البخاری ومسلم، ثم ما انفرد بہ البخاری۔ ثم ما انفرد بہ مسلم۔ ثم ما کان علی شرطھما وان لم یخرجاہ۔ ثم علی شرط البخاری۔ ثم علی شرط مسلم۔ ثم ما صححہ غیرھما من الائمۃ فھذہ سبعۃ اقسام) [1]

یعنی امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح احادیث کی کئی اقسام ہیں سب سے اعلیٰ قسم کی وہ حدیث ہے جس پر کہ بخاری اور مسلم دونوں متفق ہوں۔ اس کے بعد وہ حدیث آتی ہے جسکو صرف بخاری نے روایت کیا ہو۔ پھر وہ حدیث جسکو مسلم نے روایت کیا ہو، اس کے بعد وہ حدیث جو ان دونوں کے شرائط پر پوری اترتی ہو مگر دونوں میں سے کسی نے اسکو اپنی کتب میں درج نہ کیا ہو۔ سب سے اخیر میں وہ حدیث آتی ہے جس کو دوسرے آئمہ نے صحیح کہا ہے۔ پس یہ سات اقسام صحیح احادیث کی ہیں۔

محلل والی وہ حدیث جس سے گھڑ دوڑ کے محلل کا جواز ثابت کیا جاتا ہے وہ نہ بخاری میں ہے اور نہ مسلم میں ابوداؤد نے اسے ذکر کیا ہے۔ دراصل ابوداؤد نے اپنی کتاب میں تمام حدیثوں کو جمع کر دیا ہے جن سے کسی فقیہ نے مسئلہ لیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ابوداؤد کی تمام حدیث صحیح ہوں۔ اس کتاب میں بہت سی ضعیف احادیث بھی ہیں۔ اب ابوداؤد سے ہم محلل کی روایت نقل کرتے ہیں۔ اس کا باب ہے۔ باب فی المحلل۔

---

[1] دیکھئے قواعد الحدیث: ۸۲ مؤلفہ جمال الدین قاسمی مطبوعہ مصر ۱۹۶۱

حدثنا مسدد، ثنا حصین بن نمیر، ثنا سفیان بن حسین وثنا
علی بن مسلم ثنا عباد بن العوام، اخبرنا سفیان بن حسین المعنی
عن الزهری عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ عن النبی
صلی اللہ علیہ وسلم قال" من ادخل فرسًا بین فرسین" یعنی وھو
لا یومن أن یسبق (فلیس بقمار) ومن ادخل فرسا" بین فرسین
وقدامن ان یسبق فھو قمار (حدیث ۲۵۷۹)

حدثنا محمود بن خالد ثنا الولید بن مسلم عن سعید بن
بشیر عن الزھری باسناد عباد ومعناہ۔

قال ابوداؤد: رواہ معمر وشعیب وعقیل عن الزھری عن
رجال من اھل العلم وھذا اصح عندنا۔ (حدیث ۲۵۸۰)

آخری فقرہ کا ترجمہ یوں ہے کہ ابوداؤد نے کہا کہ اسے معمر وشعیب وعقیل نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے زہری سے سنا اور انہوں نے فرمایا کہ کسی اہل علم نے مجھے یوں روایت کیا ہے اور یہ سند ہمارے نزدیک سب سے صحیح ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جس سند کو ابوداؤد سب سے صحیح کہہ رہے ہیں اس میں کیا خرابی ہے۔ (یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ اس کی مکمل سند بھی ابوداؤد نے نہیں دی ہے)۔

اول تو یہ کہ زہری عن سے روایت کر رہے ہیں اور زہری مدلس ہیں اور مدلس راوی چاہے ویسے ثقہ ہو لیکن جب تک تحدیث بیان نہ کرے اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوگی۔ یہ محدثین کا اصول مشہور ہے۔ دوسری خرابی اس سند میں یہ ہے کہ زہری اس شخص کا نام بھی بتانے سے گریز کرتے ہیں اور ان کا شیخ مجہول ہے۔ مجہول راوی کی حدیث قابل حجت نہیں ہوتی۔ پس جو حدیث ابوداؤد کے نزدیک

سب سے بہتر ہے اس میں دو بہت بڑے نقص ہیں جن کی وجہ سے یہ حدیث قابل حجت نہیں رہتی ۔ مزید

امام ذہبی جو مشہور محدث اور اسمائے رجال کے ماہر ہیں وہ زہری کے حالات میں لکھتے ہیں ۔

قال یحیٰی بن سعید القطان : مرسل الزہری شر من مرسل غیرہ لانہٗ حافظ وکل ماقدر ان یسمی سمی وانما یترک من لایحب ان یسمیہ ۔

قلت : مراسیل الزہری کالمعضل لانہٗ یکون قد سقط منہ اثنان ولا یسوغ ان نظن بہ انہٗ اسقط الصحابی فقط ، ولو کان عندہٗ صحابی لاوضحہ بہٖ [1]

ترجمہ :۔ یحیٰی بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ زہری کی مرسل احادیث دوسرے لوگوں کی مرسل احادیث سے زیادہ شر والی ہوتی ہیں کیونکہ یہ حافظ ہیں ۔ جب نام لینا ہوتا ہے تو یہ نام لیتے ہیں ۔ لیکن یہ نام کو اس وقت ترک کر دیتے ہیں جب وہ اس کا نام لینا پسند نہیں کرتے ۔

اس کے بعد ذہبی اپنی ذاتی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زہری کے مراسیل معضل کی مانند ہیں کیونکہ اس کی سند سے دو راوی غائب ہوتے ہیں ۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے یہ صحیح نہیں کہ ہم یہاں یہ خیال کریں کہ صرف صحابی کا نام

---

[1] ذہبی : سیر اعلام النبلاء : ۵ : ۳۳۸ : ۳۳۹ ، یاد رہے کہ ابن قدامہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں ولہٗ علۃ موثرہ ذکرھا غیر واحد من الائمۃ (المحرر فی الحدیث : ۱۴۰) یعنی اسکی علۃ بہت شدید ہے جسے ایک سے زیادہ اماموں نے ذکر کیا ہے ۔

حذف کر دیا گیا ہے۔ اگر ان کے پاس صحابی سند میں ہوتے تو وہ ضرور اس بات کو واضح کر دیتے[۱]

اب اس سند کو دیکھئے کہ اس میں زہری نے صرف اہل علم کہا ہے۔ صحابی نہیں کہا پس ثابت ہوا کہ صحابی کا نام بھی نہیں لیا اور مزید دوسرے شخص کا نام بھی نہیں لیا۔ پس یہاں آخر کے دو راوی غائب ہیں۔ حدیث معضل کی تعریف یہی ہے کہ جس میں دو اور دو سے زیادہ راوی حذف کر دیئے جائیں۔ مدلس راوی اس لئے ان کے نام حذف کر دیتے ہیں کہ وہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

امام شوکانی زہری کے متعلق لکھتے ہیں۔

مراسیلہ قبیحۃ لانہ حافظ لا یرسل الا لعلۃ[۲]

یعنی زہری کے مراسیل روایات قبیح ہوتی ہیں کیونکہ وہ حافظ ہیں اور بغیر کسی علت قبیحہ کے راوی کو حذف نہیں کرتے ابن قدامہ نے اس کے مؤثر نقص کا ذکر کیا ہے[۳] مطلب یہ ہوا کہ کسی دوسرے کے متعلق تو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ بھول گئے ہوں۔ لیکن یہ حافظ ہیں بھولنے والوں میں سے نہیں ہیں بلکہ علت کی وجہ سے ناموں کو حذف کرتے ہیں یا ذکر نہیں کرتے کہ وہ راوی ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ محلل کی روایت کی نسبت حضورؐ اور ابو ہریرہؓ کی طرف کرنا درست نہیں یاد رہے کہ مدلس راوی جو ثقہ ہو اس کی وہ روایت بالکل قبول ہوتی ہے جو وہ متصل سند صحیح سے بیان کریں لیکن عن سے ان کی روایت نا قبول ہوتی ہے۔ زہری مدلس ہیں ابن حجر نے کتاب المدلسین میں ان کا ذکر کیا ہے یہ بڑے بزرگ تھے اس لئے

---

[۱] ذہبی و سیر اعلام النبلاء: ۵: ۳۳۸ب: ۳۳۹، [۲] نیل الاوطار: ۷: ۷ [۳] ابن قدامہ: المحرر فی الحدیث: ۱۴۰ مطبوعہ مکۃ المکرمۃ۔

ان کے متعلق زیادہ نہیں کہنا چاہتے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کی حدثنا والی حدیث البتہ مقبول ہوگی عن والی نہ ہوگی۔

اس روایت کی دوسری اسناد جو اس سے بھی کم درجہ کی ہیں ان میں تو راوی زیادہ ناقابل اعتبار ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس حدیث پر ائمہ نے سخت جرح بھی کی ہے۔ ہم مختصراً بعض جروح کا ذکر کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں ابن قیم لکھتے ہیں۔

وھذا الحدیث معروف بسفیان بن حسین عن الزھری وھو ثقۃ لکن جمھور ائمۃ الحدیث والحفاظ یضعفونہ فی الزھری ولا یرونہ فیہ حجۃ۔ وقد تابعہ مثلہ عن الزھری وھو سعید بن بشیر وھو ضعیف ایضاً وقال عبد الرحمٰن بن ابی حاتم فی کتاب العلل لہ۔ سألت أبی عن حدیث سفیان بن حسین؟ فقال۔ خطاء، لم یعمل سفیان شیئاً لا یشبہ ان یکون عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ واحسن احوالہ ان یکون قول سعید۔ فقد رواہ یحیٰی بن سعید عن سعید بن المسیب الیٰ آخرہ۔

یعنی یہ حدیث سفیان بن حسین عن زہری کے طریق سے مشہور ہے۔ سفیان بن حسین اگرچہ ثقہ ہے۔ لیکن جمہور آئمہ حدیث اور حفاظ حدیث اس کی ان احادیث کو جو وہ زہری سے بیان کرتا ہے ضعیف قرار دیتے ہیں اور ان کو قابل حجت نہیں سمجھتے اس کے علاوہ زہری سے سعید بن بشیر نے بھی اسی حدیث کو روایت کیا ہے لیکن یہ شخص بھی ضعیف ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سفیان بن حسین کی حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ غلط ہے۔ یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں لگتا ہو سکتا ہے کہ سعید کا قول ہو [1]

---

[1] عون المعبود شرح ابی داؤد: ۷ : ۲۴۴

اگلے صفحہ پر مزید نقائص بیان ہوئے ہیں ۔ لیکن ہم طوالت نہیں چاہتے ابن قیم کا قول غور طلب ہے کہ محلل والی روایت حضورؐ کا قول محسوس نہیں ہوتا بلکہ امکان ہے کہ سعید کا قول ہو ۔ سعید کے قول ہونے کی طرف اشارہ موطا امام مالک کی روایت کیطرف ہے موطا کی اس روایت اور امام مالک کے مسلک پر ہم بعد میں بحث کریں گے ۔

لیکن یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں یہ روایت ہرگز صحیح کی ذیل میں نہیں آتی کیونکہ اول تو زہری سے اوپر دو راوی غائب یعنی مجہول ہیں اور جن روایات کی سند میں اوپر کے راوی موجود ہیں ان کی سند میں عنعنہ ہے یعنی زہری مدلس ہیں اور عن سعید بن المسیب کہہ رہے ہیں ۔ پس ان کا عنعنہ قابل حجت نہیں ہے ۔ دوسرے زہری سے نیچے کے راوی بھی سفیان بن حسین اور سعید بن بشیر جیسے ضعیف راوی ہیں ۔ مزید ولید بن مسلم بھی سعید بن بشیر سے عنعنہ سے روایت کر رہے ہیں اور ولید بن مسلم بھی مدلس ہیں ۔

ولید بن مسلم | امام ذہبی ولید بن مسلم کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ابومسہر کہتے تھے کہ ولید بن مسلم مدلس ہیں اور بعض اوقات جھوٹے لوگوں سے تدلیس کرتے ہیں .... ابوداؤد نے کہا کہ ولید نے مالک سے دس احادیث روایت کیں ۔ جن کی کوئی اصل نہیں ۔ ان میں سے چار عن نافع کے طریق پر ہیں .... ذہبی یہ بتانے کے بعد کہ ابوحاتم نے ولید کی فلاں حدیث کو باطل کہا اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں ۔

قلت: اذا قال الولید عن ابن جریج او عن الاوزاعی فلیس بمعتمد لانہ یدلس عن کذابین فاذا قال حدثنا فہو حجۃ ،

یعنی ذہبی کہتے ہیں کہ جب ولید بن جریج یا اوزاعی وغیرہ سے عنعنہ سے روایت کرے تو وہ قابل اعتبار نہیں کیونکہ وہ کذابوں یعنی جھوٹوں سے تدلیس

کرتا ہے۔ جب وہ حدثنا کا لفظ کہے تو وہ حجت ہے۔ [1]

اس حدیث کے سلسلے میں بیہقی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اسی صفحہ پر ترکمانی نے جو اس کی سند میں کمزوریاں بیان کی ہیں اس کا حوالہ نہیں دیا گیا اور ان کمزوریوں سے صرف نظر کر لیا گیا۔ ابن ترکمانی بیہقی کے حاشیہ میں یوں لکھتے ہیں

قال (باب الرجلین یستبقان بفرسیھما الی آخرہ)

وذکر فیہ حدیث أبی ھریرۃ (من ادخل فرسا بین فرسین) الحدیث من وجھین ثم قال (تفرد بہ سفیان بن حسین وسعید ابن بشیر عن الزھری وانحر جھما ابوداؤد) - قلت - ففی تفردھما بہ ثلاث علل - الاولی انہ تکلم فیھما قال البیھقی فی باب اثد ابہ تنفح برجلھا (سفیان بن حسین ضعیف الحدیث عن الزھری قالہ یحیی بن معین) وقال ابن معین سعید بن بشیر لیس بشیء وضعفہ احمد ولنسائی وقال ابن نمیر منکر الحدیث لیس بشیء۔ الثانیہ - ان اباداؤد قال بعد اخراجہ للحدیث من الوجھین رواہ معمر و شعیب وعقیل عن الزھری عن الرجال من اھل العلم وھذا اصح عندنا الثالثہ - ان ابن أبی حاتم قال فی کتاب العلل سالت أبی عن حدیث سفیان بن حسین فقال خطا لم یعمل سفیان شیئا لا یشبہ ان یکون عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم واحسن احوالہ ان یکون قول سعید فقد رواہ یحیی بن سعید عن سعید بن المسیب قولہ -

باب

یعنی اس باب میں جو حدیث ہے اسے زہری سے صرف سفیان بن حسین

---

[1] میزان الاعتدال : ۴ : ۳۴۷ / ۳۴۸

اور سعید بن بشیر نے روایت کیا ہے ۔ ان دونوں سے ابوداؤد نے تخریج حدیث کی ہے ۔ اب ابن ترکمان کہتے ہیں کہ ان دونوں کے تفرد میں تین علتیں ہیں پہلی علت یہ ہے کہ ان دونوں میں کلام کیا گیا ہے خود بیہقی نے ایک باب میں جس کا نام باب الدابۃ ۔

(یعنی باب کہ اگر جانور لات مارے) میں کہا ہے کہ یحیٰی بن معین نے کہا ہے کہ سفیان بن حسین خاص طور سے زہری سے روایت کرنے میں ضعیف ہے ۔ اور ابن معین یہ بھی فرماتے ہیں کہ سعید بن بشیر کوئی چیز نہیں ہے ۔ مزید امام احمد اور امام نسائی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے ۔ پھر ابن نمیر نے کہا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے اور کوئی چیز نہیں ہے ۔ دوسری علت یہ ہے کہ اس حدیث کو دو طریقوں سے بیان کرنے کے بعد خود ابوداؤد نے کہہ دیا کہ معمر و شعیب و عقیل نے عنعنہ سے زہری سے اسے روایت کیا ہے اور پھر زہری عنعنہ سے یعنی سماع کی صراحت کئے بغیر، عن، کا لفظ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اہل علم لوگوں میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں ۔ پھر ابوداؤد (اس مجہول شخص سے عنعنہ کرتے ہوئے جو روایت کرتے ہیں) اس طریقہ روایت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ طریقہ زیادہ صحیح ہے ۔ (حالانکہ یہاں زہری مدلس ایک مجہول شخص سے روایت کر رہے ہیں ۔ تو ثابت ہوا کہ پہلے دونوں طرق تو اس سے بھی قبیح ہیں کیونکہ ہم شوکانی کا قول نقل کر چکے ہیں کہ زہری کی مراسیل قبیح ہوتی ہیں اور یہاں تو زہری ایک اہل علم کہہ رہے ہیں ۔ صحابی بھی نہیں کہتے ۔ نہ معلوم وہ کون اہل علم ہیں ۔ تابعی ہیں یا تبع تابعی ہیں اور کس درجہ کے ہیں ۔

تیسری علت یہ ہے کہ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سفیان بن حسین کی حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ روایت غلط ہے ۔

اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سعید کی اپنی رائے ہے اور اسے بطور سعید کی رائے کے ہی یحییٰ بن سعید نے روایت کیا ہے (حضورؐ کے قول کے طور پر روایت نہیں کیا)

(تصدیق کیلئے سنن بیہقی کا حاشیہ جلد ۱۰ ص ۲۰۰ جس کا فوٹو ہم نے پیش کیا ہے دیکھئے) غرض کہ جس حدیث کو ابو حاتم جیسے عظیم محدّث غلط کہہ رہے ہوں۔ اس سے کیسے حجت پکڑی جاسکتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوگیا کہ محلل والہ حیلہ ہرگز حضورؐ کا تجویز کردہ نہیں ہے ابن قدامہ نے بھی کہا ہے کہ اس میں موثر علت ہے (المحرر فی الحدیث: ۱۶۰)۔

غرضیکہ دونوں ابن قیم اور پھر ابن ترکمان نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے یہ بات لکھدی ہے کہ یہ حدیث حضورؐ کا قول نہیں۔ زیادہ سے زیادہ سعید بن المسیب کی اپنی رائے ہوسکتی ہے۔ مزید ابن قدامہ بھی موثر علت کا ذکر کرتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امام مالکؒ نے اپنے صرف ایک نسخہ میں اسے بیان کیا ہے اور وہ بھی صرف سعید بن المسیب کے قول کے طور پر نہ کہ حضورؐ کے قول کے طور پر۔ تجرید التمہید میں یہ روایت مجھے نہیں ملی۔ پس یہ قول حضورؐ کا نہیں ہے۔؟

اغلب ہے کہ انہوں نے بعد میں اسے حذف ہی کردیا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود امام مالکؒ کا اس قول پر عمل نہیں۔ خود ریس کلب والوں نے اپنے کتابچے میں عینی کے حوالے سے امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ میں محلل کو پسند نہیں کرتا [1]

سیوطی نے جو مؤطا کی شرح تنویر الحوالک کے نام سے لکھی ہے اس کے صفحہ ، پر

---

[1] دیکھئے سباق اسلامی صفحہ ۱۳ / ۱۴

ابن حزم کے حوالے سے لکھا ہے کہ مؤطا میں بھی کچھ روایات ایسی ہیں جن کو محدثین نے غلط کہا ہے۔ اور ستر روایات ایسی بھی ہیں جن پر خود امام مالکؒ کا اپنا عمل نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ محلل کے سلسلے میں حضرت سعید بن المسیب کے قول پر خود امام مالکؒ کا عمل نہیں ہے۔ وہ اسے ناجائز کہتے ہیں۔ یہ بات المغنی کے بیان سے ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر مسابقہ دو اشخاص یا دو پارٹیوں کے درمیان ہو تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ عوض یعنی انعام حاکم وقت کی طرف سے ہو ایسی صورت میں وہ عوض جائز ہو گا چاہے وہ یہ عوض اپنی جیب سے دے یا بیت المال سے دے کیونکہ اس میں مصلحت اور جہاد کی ترغیب ہے اور مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ اگر عوض حاکم کے علاوہ کوئی دوسرا بھی دے دے تو جائز ہو گا۔ یہ رائے ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کی ہے۔ لیکن اس کے برعکس امام مالک کہتے ہیں کہ جائز نہ ہو گا اور غیر امام کا انعام یا عوض دینا ناجائز ہے کیونکہ اس کی ضرورت تو جہاد کی خاطر سے ہے کیونکہ جہاد کا انتظام اور جہاد کے لئے افسروں و سالاروں کو مقرر کرنا حاکم وقت کا کام ہے۔ (پس انعام بھی حاکم ہی دے گا جیسا آج کل فوج میں ہوتا ہے۔)

اس کے بعد صاحب المغنی فرماتے ہیں کہ ہماری دلیل یہ ہے کہ جس بات میں عوامی مصلحت ہو وہ جائز ہو گی۔ جیسے کہ اس رقم سے گھوڑا اور ہتھیار جہاد کے لئے خرید لئے جائیں۔ پھر اگر دونوں میں یہ معاملہ ہو کہ رقم ایک صاحب کی طرف سے مقرر کی جائے اور دوسرے کی طرف سے نہ ہو اور وہ یہ کہے کہ اگر تم آگے نکل گئے تو میں تم کو دس سکے دوں گا اور اگر میں تم سے آگے نکل گیا تو تم پر کچھ دینا نہیں آئے گا۔ یہ معاملہ جائز ہو گا۔ لیکن امام مالک سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ایسا کرنا بھی جائز نہ ہو گا کیونکہ یہ قمار ہے۔ المغنی کے عربی الفاظ ملاحظہ ہوں (امام مالک کے نزدیک یک طرفہ شرط بھی ناجائز ہے۔

مسئلة قيما لو ارادان يستبقا جلد ۱۱ (المغنى والشرح الكبير)

(مسئلة) قال واذا ارادان يستبقا اخرج احدهما ولم يخرج الآخر فان سبق من اخرج احرز سبقه ولم ياخذ من المسبوق شيئا وان سبق من لم يخرج احرز سبق صاحبه)

وجملته ان المسابقة اذا كانت بين اثنين اوحزبين لم تخل اما ان يكون العوض منهما او من غيرهما فان غيرهما نظرت فان كان من الامام جاز سواء كان من ماله او من بيت المال لان في ذالك مصلحة وحثا على تعلم الجهاد ونفعا للمسلمين وان كان غير امام جاز له بذل العوض من ماله وبهذا قال ابو حنيفة والشافئي وقال مالك لا يجوز بذل العوض من غير الامام لان هذا مما يحتاج اليه للجهاد فاختص به الامام لتولية الولايات وتامير الامراء۔

ولنا انه بذل لماله فيما فيه مصلحة وقربة فجاز كما لو اشترى به خيلا وسلاحا، فاما ان كان منهما اشترط كون الجعل من احدهما دون الآخر فيقول ان سبقتني فلك عشرة وان سبقتك فلا شيء عليك فهذا جائز وحكى عن مالك انه لا يجوز لانه قمار،

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ گھڑ دوڑ میں انعام دینا یا عوض دینا دراصل حکومت کا فریضہ ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص انعام بھی دے تو گویا وہ حکومت کا فریضہ پورا کر رہا ہو گا۔ ایسی صورت میں جبکہ گھڑ دوڑ میں عوض دینا بنیادی طور پر حکومت کا فرض ہے تو یہ بات یقینی ہو جاتی ہے۔

کہ حکومت گھڑدوڑ پر کسی قسم کا ٹیکس عائد نہیں کر سکتی اور اسی وجہ سے گھوڑوں پر زکوٰۃ واجب نہیں جیسا کہ خود ریس کلب والوں نے اپنے کتابچے میں تسلیم کیا کہ گھوڑے چونکہ جہاد کیلئے ہوتے ہیں اس لئے ہی ان پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔ گویا گھوڑے اور گھڑدوڑ کا اصل مقصد صرف جہاد کی تیاری ہے نہ کہ کھیل یا تماشہ۔ ان پر شرط لگانا تو دور کی بات ہے۔

حکومت کو تو چاہیئے کہ وہ گھوڑے والوں کو اپنے پاس سے دے نہ کہ ان کے انعام پر بھاری ٹیکس عائد کر دے۔ مجاہدوں کو تو دینا چاہیئے نہ کہ ان سے لینا چاہیئے۔ اور اگر یہ گھڑسوار مجاہد نہیں تو سرے سے ان کی دوڑ ہی جائز نہیں کیونکہ حدیث میں واضح آگیا ہے کہ مسابقہ جائز نہیں سوائے اونٹ گھوڑے یا تیر اندازی میں۔ اور واضح طور پر صرف ان تین چیزوں میں مسابقت کی اجازت صرف جہاد میں ان کی عظیم اہمیت کی وجہ سے دی گئی ہے۔

یاد رہے کہ کسی صحابی کے متعلق حدیث میں یہ منقول نہیں کہ کسی صحابی نے گھڑدوڑ میں محلل داخل کیا ہو۔ بلکہ المغنی نے جو روایت بیان کی ہے اس میں یہ ہے کہ صحابہ کرام محلل داخل کرنے کی گندگی سے بلند اور ارفع تھے۔ مغنی لکھتے ہیں۔

فان ادخل بينهما محللا وهو ثالث لم يخرج شيئا جاز، وبهذا قال سعيد بن المسيب والزهري والاوزاعي واسحاق و اصحاب الراي وحكي اشهب عن مالك انه قال في المحلل لا احبه و عن جابر ابن زيد انه قيل له ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا لا يرون بالدخيل باسا قال هم اعف من ذلك۔

مذکورہ عبارت کا آخری حصہ خاص طور پر قارئین کی توجہ کا مستحق ہے جو یوں ہے ..... اگر دونوں کے درمیان محلل داخل کر دیا جائے جو کہ تیسرا شخص

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

جزیرۂ عرب میں یہود کی تاریخ

مجیب اللہ ندوی

(چوتھی اور آخری قسط)

بعثت نبوی کے بعد یہود اور مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی تعلقات کی نوعیت

بعثت نبوی سے قبل یہودیوں کے سیاسی تمدنی اثرات کا جائزہ لینے اور ان کی اخلاقی اور دینی حالت کا تذکرہ کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد ان میں اور مسلمانوں میں باہم جو سیاسی و اجتماعی تعلقات پیدا ہوئے اور اس سے جو فوائد اور مضار منتج ہوتے اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ میں ہوئی، اور ذکر آچکا ہے کہ مکہ میں یہود نہیں تھے، اس لئے مکی زندگی میں براہ راست ان سے کوئی سیاسی و اجتماعی تعلق نہیں پیدا ہوا لیکن دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں جو ابتدائی سورتیں نازل ہوئیں ان میں حسب ضرورت اگلے انبیاء خصوصاً حضرت موسیٰ کا ذکر ملتا ہے، مثلاً سورہ مزمل میں جو بالکل ابتدائی سورتوں میں ہے، حضرت موسیٰ اور فرعون کا ذکر ملتا ہے، پھر سورہ اعلیٰ میں صحف موسیٰ کا تذکرہ بھی آتا ہے، اسی طرح اس کے بعد نازل ہونے والی سورتوں مثلاً سورہ قمر، سورہ ق اور سورہ بروج وغیرہ میں بھی حضرت موسیٰ کی کامیابی اور فرعون کے برے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غرض مکہ کے ابتدائی سالوں میں براہ راست یہود سے قرآن نے خطاب نہیں کیا، محض دعوت و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے اس نے ان مشہور واقعات کی طرف اشارہ کر دیا جس سے اہل مکہ واقف تھے تاکہ وہ عبرت حاصل کریں۔

مکّی سورتوں میں سب سے پہلے سورہ اعراف میں ذرا تفصیل سے بنی اسرائیل کے نام سے ان کا تذکرہ ملتا ہے جس میں متعدد انعامات الٰہی کو گنایا گیا ہے، اور ان کی بار بار کی ناشکری اور احسان ناشناسی کا ذکر کیا گیا ہے. اس سورہ میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی موجود ہے، ان واقعات کی تفصیل اس سورہ کے رکوع ۱۲ سے ۱۸ تک میں موجود ہے، اگر ان میں سے ان آیتوں کو نکال دیا جائے جن کو مفسرین مدنی بتاتے ہیں، تب بھی یہود کی ابتدائی تاریخ کا خلاصہ مکہ میں نازل ہو چکا تھا[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن میں بنی اسرائیل کا تذکرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کو کئی برس گذر چکے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً اہلِ مکہ نے قرآن کے بیان کردہ واقعات خصوصاً وہ جو یہود سے متعلق تھے، ان کی طرف کچھ زیادہ دھیان نہیں دیا، لیکن جب قرآن نے بار بار ان کا اعادہ کیا تو ان کو ان کی تردید کا خیال پیدا ہوا ہو گا، مدینہ اور خیبر کے یہودیوں سے ان کے قدیم تعلقات تھے اسلئے انھوں نے ان سے یا طائف اور بنو کنانہ کے یہود سے جو ان کے قریب ہی رہتے تھے، ان واقعات کی صداقت اور عدم صداقت اور آپ کی نبوت کے بارے میں سوالات کرتے رہے ہوں گے۔

جیسا کہ مفسرین اور بعض محدثین نے لکھا ہے کہ روح[2]، اصحاب کہف اور ذوالقرنین وغیرہ

---

[1] ابن جریج قتادہ وغیرہ سے مروی ہے کہ اس سورہ میں یہ آیت الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً الاٰیۃ ان یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنھوں نے اس سے پہلی والی آیت کے بارے میں جس میں تقویٰ اور زکوٰۃ کا ذکر ہے، کہا تھا کہ ہم بھی تو تقویٰ کے حامل ہیں اور زکوٰۃ نکالتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب براہِ راست بھی یہود بحث و مباحثہ کرنے لگے تھے، مگر اس کے علاوہ دوسری کوئی شہادت ہم کو نہیں ملی جس سے مکہ میں براہ راست ان سے سوال و جواب کی تائید ہوتی ہو، اس لئے حاشیہ میں اس کا ذکر کیا گیا۔

[2] روح کے سلسلہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال مدینہ میں کیا گیا تھا، مگر ترمذی میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اہل مکہ نے یہود سے کہا کہ ہم کو کچھ ایسی باتیں بتاؤ جن کے متعلق ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کریں، اس کے جواب میں یہود نے ان سے کہا کہ روح کے بارے میں ان سے سوال کرو (فتح الباری ج ۸، ص ۳۰۳۔ اصحاب کہف کے سلسلہ میں طبری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ خود یہود نے اہل مکہ سے ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے کے لئے کہا تھا، بہر نوع دونوں باتیں بیک وقت ممکن ہیں، اس میں کوئی تضاد نہیں، سیر کی کتابوں میں تذکرہ آتا ہے کہ قریش نے ایک وفد بھی یہود مدینہ کے پاس آپ کی نبوت کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے بھیجا تھا، ممکن ہے یہ اسی وقت کا واقعہ ہو۔

کے بارے میں جو آیات نازل ہوئیں، وہ درحقیقت کفار عرب کے ان سوالات کے جوابات ہیں جو انھوں نے یہود سے پوچھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے متعلق کئے تھے، اصحاب کہف کے متعلق تو حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ خود یہود مدینہ نے اہل مکہ سے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کے بارے میں سوال کرو، اگر وہ نبی ہوں گے تو جواب دیں گے[1]

لیکن اب تک یعنی سورۂ اسرائیل کے نزول تک جو کچھ ان کے بارے میں کہا گیا، یا تو اہل عرب کو براہ راست مخاطب کرکے کہا گیا، یا پھر غائب کے صیغہ سے کہا گیا، خود یہودیوں کو براہ راست خطاب نہیں کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ معراج سے پہلے تک یہود سے براہ راست تعلق نہیں پیدا ہوا تھا، سورۂ اسراء کے بعد سورہ یونس کا نزول ہوتا ہے، اس میں بھی یہود کی پچھلی تاریخ کو دہرایا گیا اور مزید یہ بتایا گیا کہ انھوں نے دین کے بارے میں علم الٰہی آجانے کے بعد بھی اختلاف کیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ان قرآنی قصوں میں شک کرنے والوں کو خطاب کرکے ارشاد ہوا :-

فسئل الذین یقرءون الکتب	تو آپ ان لوگوں سے دریافت کیجئے جو آپ سے
من قبلک (یونس)	پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو پڑھتے ہیں
	(یعنی توراۃ و انجیل)

٭ ٭ ٭

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہود میں اس وقت ایسے صالح الفطرت لوگ موجود تھے، جو اظہار حق کرسکتے تھے، اور دوسری یہ کہ اب ان میں اور مسلمانوں میں براہ راست سوال و جواب کے امکانات پیدا ہو گئے تھے، لیکن ان امکانات کے لئے قرآن کی اندرونی شہادت، تاریخ نزول قرآن اور بعض واقعات کی ترتیب کے علاوہ کوئی خارجی ثبوت نہیں ملتا، اس لئے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھا جائے گا اس میں غلطی کا امکان ہے، مگر عاجز قرآن و سیرت کے مطالعہ سے اپنی حد تک جو کچھ بھی اخذ کرسکا ہے

---

[1] طبری۔ ج ۱۵، ص ۱۱۸۔

اس پراسے وثوق ہے، اس لئے اسے پیش کرنے کی جرأت کررہا ہے، واللہ اعلم بالصواب،

صحیح روایتوں کے مطابق معراج کا واقعہ ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے پیش آیا۔ ظاہر ہے کہ سورۂ اسراء (یعنی سورہ بنی اسرائیل) اس کے بعد ہی نازل ہوئی اور سورۂ یونس جس میں اوپر والی ایک آیت مذکور ہے، سورۂ اسراء کے بعد نازل ہوئی۔

اہل مدینہ کے متعلق تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ ہجرت سے تین سال پہلے یعنی سنلہ نبوی میں ان کے چھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا، جو نزول سورۂ اسراء سے پہلے کا واقعہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد مدینہ میں جاکر خاموش نہیں بیٹھے ہوں گے اسلام کا پیغام دوسروں تک پہونچایا ہوگا، عام طور سے ان کے اسلام کا چرچا ہوا ہوگا۔ عام اہل مدینہ نے جن میں یہودی بھی تھے، اسے جانا بھی ہوگا، ہمارے نزدیک اسی کا اثر تھا کہ دوسرے سال یعنی سلاللہ نبوی میں یہ تعداد دوگنی ہوگئی، اور ۱۲ آدمیوں نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، اور خواہش ظاہر کی کہ ہمارے ساتھ کسی کو کردیا جائے جو وہاں رہ کر ہم کو اسلام کی تعلیم دے، چنانچہ آپ نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کردیا، حضرت مصعب بن عمیرؓ مدینہ پہونچے تو گھر گھر جاکر اسلام کا پیغام پہونچایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی مسلمانوں کی تعداد پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگئی۔

یہود جو مدینہ میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، جن سے انصار کا دن رات کا تعلق تھا، خود بھی ایک مذہب اور شریعت کے حامل تھے، ان کی اس حیثیت کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اہل مکہ بغرض تحقیق ان کے پاس آ بھی چکے تھے۔ انھوں نے اس نئے دین کے بارے میں اگر انصار سے سوال و جواب اور بحث و مباحثہ شروع کردیا ہو تو کوئی تعجب نہیں، اور بعض روایتوں سے یہ پتہ چلتا بھی ہے کہ وہ آپ کی نبوت کے منتظر تھے[1]۔ جیساکہ کتب سیر میں ہے کہ آپ نے اہل مدینہ کے سامنے عقبہ میں سب سے پہلے اسلام پیش کیا تو وہ یہ کہہ کر اسلام لائے کہ ایسا نہ ہو کہ یہود ہم سے اس فضل میں سبقت لے جائیں[2]

---

[1] ہماری کتاب "اہل کتاب صحابہ وتابعین" میں متعدد جگہ اس کا ثبوت ملے گا۔

[2] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۶۲ بحوالہ زرقانی اور ابن سعد۔

ان وجوہ کی بنا پر عاجز کا خیال ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے جو مومنین اہل کتاب کا نام لیا[1] وہ صحیح نہیں ہے[2] اور نہ یہ صحیح ہے کہ مکہ میں بھی یہود تھے[3] بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی انصار مدینہ اور یہود کے درمیان اسلام کے بارے میں گفتگو اور بحث و مباحثہ کا آغاز ہو چکا تھا، اور انھوں نے ان کی کچھ نہ کچھ مخالفت بھی شروع کر دی تھی، جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے بھی پتہ چلتا ہے، ان ہی تعلقات کی بنا پر آیت میں کہا جا رہا ہے کہ آپ ان لوگوں سے (مسلمانوں کے ذریعہ) تحقیق کر لیجئے جو کتاب کے عالم ہیں۔

بیانِ مذکورۂ بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ ابتداءً اسلام کے مقابلہ میں یہود کا رویّہ معاندانہ نہیں تھا، بلکہ بڑی حد تک وہ اسلام کی صداقت کے معترف بھی تھے مگر جوں جوں اسلام کی تعلیمات سے واقف ہوتے گئے، ان کی مخالفت اور دشمنی بڑھتی گئی، سورۂ یونس کے بعد ہود اور حم سجدہ وغیرہ سورتیں نازل ہوئیں، جن میں ان کے متعلق بار بار یہ بات دہرائی گئی کہ یہ جان بوجھ کر قرآن کا انکار کر رہے ہیں[4]۔ ان سورتوں کے بعد سورۂ غاشیہ کا نزول ہوا، اس میں بھی قریب قریب وہی بات دہرائی گئی، پھر سورۂ صافات نازل ہوئی جس میں ان کی کتاب توراۃ کو اماماً و رحمۃً کے الفاظ سے یاد کیا گیا، اور قرآن کو اسکا حریف نہیں بلکہ مؤید قرار دیا گیا، پھر سورۂ انبیاء اتری، اس میں اس کو "الفرقان اور ضیاءً" کہا گیا، لیکن اس ترہیب و ترغیب کے باوجود یہود کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں وہ اور زیادہ سخت ہو گئے، اور اہل مکہ کو جیسا کہ قرآن میں ہے۔ پہلے سے زیادہ اسلام کے خلاف اکسانے اور اعتراض کے لئے ابھارنے لگے، چنانچہ سورۂ انعام میں کھانے پینے سے متعلق محرّمات کے سلسلہ میں ان کے اعتراضات کا جواب

---

[1] جیسا کہ اس سلسلہ میں مفسرین نے عبد اللہ بن سلام اور تمیم داری کا نام لیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ سورت اور پھر یہ آیت مکی ہے، اس لئے اس سے ان کو مراد لینا صحیح نہیں ہو سکتا۔

[2] بعض مستشرقین کا یہی خیال ہے اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ [3] ع۱ آیت ۱۴ اور ۱۲۔

ذرا سخت انداز سے اور خاص طور سے ان کی طرف اشارہ کر کے دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ۔	اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے۔

سورۂ نحل میں مکرر ارشاد ہے:۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ	اور یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں جن کا بیان ہم اس سے قبل آپ سے کر چکے ہیں

ان دونوں آیتوں میں "اَلَّذِيْنَ هَادُوْا" کے الفاظ خاص طور سے قابل غور ہیں، اس سے پہلے ان الفاظ کے ساتھ ان کو یاد نہیں کیا گیا تھا، پھر دونوں آیتوں کے آخر میں کہا گیا:۔

ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ (انعام)	ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی تھی،
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (نحل)	ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود اپنے اوپر زیادتی کرتے تھے۔

یہود اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کا جو ارتقاء قرآن کی آیات سے دکھایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی چند حق پسند اور صالح الفطرت افراد کے علاوہ پوری قوم یہود میں رفتہ رفتہ اسلام و شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس مخالفت کا اظہار بھی کبھی اہل مکہ کے ذریعہ ہوتا تھا اور کبھی اہل مدینہ کے ذریعہ، جن سے ان کا دن رات کا سابقہ تھا، مگر ابھی تک یہ مخالفت صرف ذہنی اور زبانی تھی۔

ہجرت کے بعد یہود کا یہ حال تھا کہ آفتاب اسلام کی کرنیں افق مدینہ پر چمکیں یعنی ختم رسل صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے تشریف فرمائے مدینہ ہوئے، مدینہ کے بعض صالح اور سلیم الفطرت افراد مثلاً عبداللہ بن سلام اور میمون بن یامین وغیرہ جن کو تورات کی پیشین گوئی، علماء و احبار

لہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

کی بار بار کی یاد دہانی، اور انصار کی مکہ میں آمد و رفت کے ذریعہ آپ کی بعثت کا علم ہو چکا تھا، بڑی بے چینی سے آپ کی ہجرت اور مدینہ میں آپ کی آمد آمد کا انتظار کر رہے تھے، جوں ہی آپ جلوہ فرمائے مدینہ ہوئے، وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔[۱] ان کے ساتھ بعض اور افراد نے بھی آپ کی نبوت کی صداقت کو تسلیم کیا۔[۲] مگر ان کی تیرہ بختی نے نورِ حق کو ان کے تاریک قلوب تک پہونچنے نہیں دیا، اور وہ مسلمان نہ ہو سکے۔

عبداللہ بن سلامؓ اور ابن یامینؓ کے اسلام لانے کا یہود پر بجائے اچھا اثر پڑنے کے اور الٹا اثر پڑا، اور انھوں نے اس اقدامِ حق پر ان کو حد درجہ مطعون اور لعنت ملامت کی۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے پہلے مکہ ہی میں یہود کی مخالفت اور دشمنی کا علم ہو چکا تھا، مدینہ آنے کے بعد اس کا عینی مشاہدہ بھی ہوا، اس لئے آپ نے مسجد نبویؐ و کاشانۂ نبوت کی تعمیر کے بعد ہی پہلا جو کام کیا وہ انصار اور یہودِ مدینہ کے ایک ایک قبیلہ سے معاہدۂ امن و صلح تھا، تاکہ یہود کی مخالفت اور زیادہ آگے بڑھنے نہ پائے، اور آپ کے اور مسلمانوں کے بارے میں ان کو جو غلط فہمی ہو گئی ہے، اس کا ازالہ ہو جائے، چنانچہ آپ نے قبائلِ یہود سے صرف معاہدۂ امن و صلح ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ آپ نے اور آپ کے ساتھ

---

[۱] ابن الہیبان نے خاص طور پر ان کو جمع کر کے اس پیشین گوئی کو یاد دلایا تھا، ہماری کتاب میں حضرت اسیدؓ کے حالات میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، انصار کے سامنے آپ نے پہلی بار اسلام پیش کیا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا ایسا نہ ہو کہ اس فضل میں یہود ہم سے سبقت لے جائیں اور ہم رہ جائیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود جانتے تھے کہ خاک بطحا سے وہ نبی عنقریب مبعوث ہونے والا ہے جس کی بشارت حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو دی تھی، ابھی اوپر حضرت سلمہؓ کی روایت گذری ہے، جس میں ہے کہ ایک یہودی عالم نے یہود کے ایک پورے مجمع میں آپ کے مبعوث ہونے کا اعلان کیا تھا۔ [۲] مثلاً ابو یاسر بن اخطب نے جب قرآن کی آیتیں سنیں تو اپنے قبیلے کے پاس آیا اور کہا کہ ہم جس نبی کا انتظار کر رہے تھے وہ آ گئے ہیں، ان کی اطاعت کرو مگر اس کے بھائی حیی بن اخطب نے اس کی مخالفت کی، چونکہ قبیلہ سردار تھا، اس لئے پوری قوم اس کی ہم آہنگ ہو گئی، فتح الباری ج ۸ ص ۲۱۲۔ اس سلسلہ میں بعض واقعات کا تذکرہ آگے آئے گا۔

صحابۂ کرام نے ان کے ساتھ اپنا رویہ نہایت مصالحانہ، خیرخواہانہ اور روادارانہ رکھا۔

آپ بہ نفس نفیس ان کے مریضوں کی عیادت کرتے تھے، ان کے جنازے جاتے تھے تو آپ احتراماً کھڑے ہوجاتے تھے، آپ کی مجلس میں ان کو چھینک آتی تو آپ دعائیہ کلمات ارشاد فرماتے[۱] جب تک کسی مسئلہ میں قرآن کا صریح حکم نازل نہ ہوجاتا، آپ تورات کے حکم پر عمل کرتے، اور اس میں خود یہود سے مشورہ کرتے تھے، آپ خود اور صحابہ ان ہی کی اتباع میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے، یہود آپ سے اور مسلمانوں سے بحث و مباحثہ کرتے، مگر آپ کبھی ناگواری کا اظہار نہ فرماتے، ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ اور چند یہودیوں میں باہم اس بات پر کہ حضرت موسیٰؑ افضل ہیں یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، سخت گفتگو ہوگئی، یہود خدمت نبوی میں شکایت لے کر آتے، آپ نے صحابہ سے مخاطب ہوکر فرمایا، مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو، اسی طرح ایک مرتبہ حضرت یونسؑ کا ذکر آیا، تو اس وقت بھی آپ نے یہی فرمایا کہ مجھے ان پر فضیلت نہ دو۔

ایک طرف یہ لطف وکرم اور اخلاق ومحبت کی بارش تھی کہ بچہ بچہ اس سے سیراب تھا، دوسری طرف یہود کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کی مجلسوں میں آتے تو السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت آئے) کہتے، آپ کی توہین کے لئے راعنا[۲] کا لفظ استعمال کرتے، آپ سے اور مسلمانوں سے خواہ مخواہ بحث ومباحثہ کرتے، آپ کی شان میں گستاخیاں اور آپ کی نبوت کی تکذیب کرتے، مسلمانوں کو طرح طرح سے ستانے کی کوشش کرتے، ان سے بدکلامیاں کرتے، لیکن ان کی مسلسل ایذارسانیوں، گستاخیوں، شرارتوں، ریشہ دوانیوں، فتنہ آرائیوں اور شرانگیزیوں کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ سے صبر وتحمل کا دامن کبھی نہیں چھوٹا، اور ہمیشہ ان کے مقابلہ میں وہ حلم و بردباری اور صبر وضبط اور اسلام کے اعلیٰ اخلاق کا اظہار کرتے رہے اور انھوں نے اس کا خاص طور سے خیال رکھا کہ ان کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہو، جو صلح وامن کے لئے مضر اور

---

[۱] ترمذی شریف باب اذا عطس الیہود [۲] رعنا کے معنی ہیں میری رعایت کیجئے، مگر یہود اس کو زبان دبا کر راعینا کہتے تھے، جس کے معنیٰ عربی میں ہمارے چرواہے کے ہیں، ان کی اس روش کو دیکھ کر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی کہ تم راعنا کے بجائے "انظرنا" کا لفظ استعمال کرو تاکہ ان کو آپ کی اہانت کا موقع نہ ملے۔

اس معاہدہ کے خلاف ہو، جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہو چکا تھا، چنانچہ قرآن یہود کے اس طرز عمل کے بارے میں مسلمانوں کو ہدایت دیتا ہے:۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا	(ترجمہ)
الْكِتَابَ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا	اور تم بہت سی دل آزاری کی باتیں اہل کتاب
أَذًى كَثِيرًا وَإِن تَصْبِرُوا وَ	(یہود) اور مشرکین سے سنوگے، تو تم اگر
تَتَّقُوا فَإِنَّ ذَالِكَ مِنْ عَزْمِ	ان پر صبر کروگے اور تقویٰ کا طرز عمل
الْأُمُورِ (آل عمران)	اختیار کروگے تو یہ عزیمت کا کام ہوگا۔

شروع سے یہود کے ساتھ مسلمانوں کا جو محبّت آمیز برتاؤ تھا، اور جس رفق ولینت اور حسن سلوک کے ساتھ وہ ان سے پیش آرہے تھے، اس کا تو تقاضا یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے قریب ہوتے، ان کی دعوت قبول کرتے، ان کے معاون و مددگار بنتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کے باوجود وہ اسلام سے بیزار اور مسلمانوں سے دن بدن دور ہوتے جارہے تھے، اس کے اسباب اور موانع کیا تھے، اس کو ہم ذرا تفصیل سے یہاں لکھتے ہیں:۔

(۱) یہود میں متعدد طبقے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا بعثت نبوی کے الگ الگ نظریہ اور خیال تھا۔

(۲) ایک طبقہ تو یہ سمجھتا تھا کہ حضرت موسیٰ کی بعثت اور تورات کے نزول کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت یا کسی اور کتاب الٰہی کا نزول نہیں ہوگا[1] لیکن یہ بہت محدود تھا اس خیال کے یہود عرب میں زیادہ نہ تھے۔

(ب) دوسرے کا خیال یہ تھا کہ ایک اور نبی کی بعثت تو ہونے والی ہے مگر وہ بنی اسرائیل سے ہوگا، اور اگر بنی اسرائیل سے نہ بھی ہوا تو ہر معاملہ میں کم از کم ان کی تائید ضرور کریگا، چنانچہ انھوں نے بارہا آپ کے سامنے اس کا اظہار کیا۔

حدیث کی کتابوں میں ہے کہ ایک بار دو یہودی آپ کی خدمت میں آئے اور آپ سے

---

[1] التلمود بحوالہ تاریخ الیہود۔

چند سوالات کئے، آپ نے جواب دیا، تو کہا کہ بیشک آپ نبی ہیں، ارشاد ہوا کہ پھر میرے اتباع سے کیوں گریز کرتے ہو، کہا حضرت داؤد نے دعا کی تھی کہ نبوت ان ہی کی اولاد (بنی اسرائیل) میں رہے گی، اگر ہم آپ کا اتباع کریں گے تو یہود ہم کو قتل کر دیں گے۔ [1]

اس خیال کے یہود بکثرت تھے، اور یہی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

(ج) تیسرا گروہ وہ تھا جو نہ نبوت کو حضرت موسیٰ پر ختم سمجھتا تھا اور نہ اس کو بنی اسرائیل میں محدود، بلکہ وہ انبیاء کی اصل پیشین گوئی اور توارت کے بیان کے مطابق یہ سمجھتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے، خواہ وہ عرب میں ہو یا عجم میں، یہی یہود کا اعتدال پسند گروہ تھا، اور یہی آپ کی بعثت کا منتظر تھا۔ اور اسی کے بعض افراد نے اسلام قبول کیا، مگر بعض ذاتی مصالح کے تحت بیشتر افراد نے دوسرے گروہ کا راستہ اختیار کیا، اور ان کے ساتھ رہے، اور دولت ایمان سے محروم رہے۔

(۲) عام طور پر یہود یہ سمجھتے تھے کہ جو نبی بھی آئے گا، ان کے ہر خیال اور ان کی زندگی کے ہر معاملہ میں ان کی تائید کرے گا، لیکن جب ان کی یہ توقع پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی تو انھوں نے مخالفت شروع کر دی۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہود جو غلط اور فاسد عقیدہ رکھتے تھے، قرآن نے ابتدائے نزول ہی میں اس کا ابطال کیا اور حضرت عیسیٰؑ کو راست باز اور ان کو مجرم ٹھہرایا۔

دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق بھی ان کی دینی کتابوں میں ایسی بے سروپا باتیں۔ اور ان کے درمیان ایسے قصے عام طور پر مشہور تھے، جن سے ان کے دامن عفت پر نعوذ باللہ من ذالک داغ ہی نہیں آتا تھا بلکہ ان کے فساد عقیدہ کا بھی پتہ چلتا تھا، قرآن نے

---

[1] مسند طیالسی ص ۱۶۷ جز ۵، نسائی باب تحریم الدم [2] تفسیر و سیرت میں یہود کے بارے میں بظاہر مختلف و متضاد روایتیں ملتی ہیں اس لئے مطالعہ کرنے والوں کے لئے پریشانی اور انتشار خیال کا باعث بن جاتی ہیں لیکن اگر یہ تقسیم پیش نظر رہے تو انشاءاللہ ان روایتوں میں کوئی تضاد نظر نہ آئے گا۔

اس طرح کے قصوں اور افسانوں کی بھی تردید کی، اور انبیاء کی عصمت و عفت کی شہادتیں پیش کیں، سورۂ انعام، سورۂ مریم، سورۂ صافات میں ایک ایک کا نام لے کر کسی کو صدیقاً نبیاً، کسی کو کان من المخلصین وغیرہ کہا، اور سورۂ انعام میں تمام مشہور انبیاء کے ذکر کرکے بعد کہا، کل من الصالحین، سب کے سب صالح اور نیکو کار تھے، حضرت سلیمان علیہ السّلام کو خصوصیت کے ساتھ انھوں نے بہت زیادہ متہم کیا تھا، اور عجیب و غریب واقعات بلکہ کفر و شرک تک کو ان کی طرف منسوب کر دیا تھا، قرآن نے سورۂ نحل، پھر سورۂ بقرہ میں اس کی تردید کی، اور ان کو ان چیزوں سے منزہ قرار دیا، اسی طرح دوسرے واقعات و قصص و حکایات کا بھی قرآن نے رد کیا، ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں یہود کے توقعات کے خلاف تھیں اس لئے ان کا برافروختہ ہونا بالکل طبعی تھا، اور وہ برافروختہ ہوتے۔

(۳) یہود، جیساکہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، ہر طرح کے اخلاق ذمیمہ اور معائب سیئہ میں مبتلا تھے، مگر اس کے باوجود اہل عرب میں عزت و شرف کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس لئے وہ اپنی موجودہ اخلاقی حالت و روش پر مطمئن ہی نہیں تھے بلکہ دینی حیثیت سے اس کو اپنے لئے جائز بھی سمجھتے تھے، جیساکہ اہل کتاب کے اموال کے بارے میں انھوں نے اپنے خیال کا اظہار کیا تھا، (آل عمران)

اسلام اس کے برخلاف مکارم اخلاق، فضائل و محاسن کی تعلیم دیتا تھا، جس کے فروغ کا لازمی نتیجہ یہودیوں کی موجودہ حالت کا زوال تھا، خصوصیت سے ان کی اقتصادی زندگی کی تو قطعی موت تھی، اور چونکہ وہ اپنی روش کو بدل نہیں سکتے تھے، اس لئے انھوں نے مہر ہدایت ہی پر خاک ڈالنی شروع کر دی، چنانچہ یہود کے جس طبقہ اور قبیلہ میں جتنی ہی اخلاقی کمزوریاں زیادہ تھیں اتنا ہی وہ اسلام کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔

(۴) یہود نے شرف و نجات کا مدار ایمان و عمل کے بجائے نسل و ذات پر رکھا تھا اسلام آیا تو اس نے شرف و عزت، نجات و بخشایش کا مدار ایمان و عمل قرار دیا، اس نے یہ اصول بتایا :۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ — اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیجو گے

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَخَيْرًا وَّ أَعْظَمَ أَجْرًا (مزمل-۲)[1] — اس کو اللہ کے پاس پہونچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔

شرف وعزت کا یہ معیار قرار دیا:-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ (حجرات-۲) — تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

چونکہ قرآن کے ان اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے ان کے مزعومہ شرف وعزت کے قلعہ کی دیواریں مسمار ہو رہی تھیں، اس لئے وہ چراغ پا ہو گئے۔

(۵) اسلام سے پہلے اہل عرب عام طور سے علمی اور دینی اعتبار سے بالکل بے مایہ تھے۔ اور یہودیوں میں علم بھی تھا اور مذہب بھی، اس لئے وہ قدرتی طور پر عربوں کو اپنے سے کم تر، حقیر اور بے مایہ سمجھتے تھے، خود عربوں کو بھی ان کی برتری کا اعتراف تھا، ان میں اسلام آیا، اور انہوں نے اس کی تعلیمات کو قبول کیا، تو ان کی دینی اور علمی بے مائیگی دور ہونے لگی اور احساس برتری خود بخود بیدار ہونے لگا، قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی شرف وفضل کی حامل ہوتی ہے تو طبعاً کسی دوسری قوم کو اس کا شریک بننا پسند نہیں کرتی، چاہے اس شرف وعزت کی خصوصیات کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی اس میں باقی نہ رہ گیا ہو، اس بنا پر یہود اپنے فضل وشرف میں عربوں کو شریک اور اپنے اوصاف وخصوصیات ان کی طرف منتقل ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

(۶) ظہور اسلام سے پہلے عربوں میں آپس میں نہ کوئی وحدت تھی نہ اخوت، بلکہ ہر طرف اختلاف انتشار اور ظلم وستم کا دور دورہ تھا، وہ بے شمار قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے، جب اسلام آیا تو اس نے ان چیزوں کو مٹایا، اس نے اختلاف کو اتحاد سے، انتشار کو وحدت سے بدلا، ظلم وستم کے بجائے اخوت ومساوات کی تعلیم دی، جس کی وجہ سے عربوں میں اخوت ومساوات اور اتحاد واتفاق کی نئی روح دوڑنے لگی، پھر مدینہ پہونچ کر آپ نے اس کا

---

[1] یہ آیت سورۂ مزمل کی ہے جو ابتدائی سورتوں میں ہے۔

عملی نمونہ یہ پیش کیا کہ انصار کے ان قبائل کو جو برسوں سے آپس میں لڑتے آرہے تھے، ان کو شیر وشکر کر دیا، پھر اس سے بھی بڑھ کر مہاجرین اور انصار میں آپ نے مواخات یعنی بھائی چارہ کرا دیا، انصار کے قبائل خصوصیت سے اہل مکہ اور اہل مدینہ میں صدیوں سے اختلاف چلا آرہا تھا اور یہود اس سے برابر فائدہ اٹھاتے رہتے تھے، اس لئے ان کو متحد و متفق ہوتے اور گلے ملتے یہ کیسے دیکھ سکتے تھے۔

پھر اسی اخوت و مساوات کی فضا سے عربوں ہی کو فائدہ نہیں پہونچا، بلکہ خود یہود مدینہ میں ضعیف اور کمزور طبقہ تھا، اس کے دلوں میں بھی نئے حوصلے اور انقلابی عزائم کروٹ لینے لگے حضرت عبداللہ رضؓ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہود مدینہ دو طبقوں میں بٹ گئے تھے، ایک غالب اور مضبوط تھا، دوسرا مغلوب اور مقہور، غالب طبقہ ان غریب یہودیوں پر ہمیشہ ظلم و ستم کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ اگر غالب گروہ کا کوئی آدمی مغلوب گروہ کے ہاتھوں مارا جاتا، تو ان کو سو وسق دیت دینی پڑتی، اور اگر اس کے برعکس ہوتا تو وہ ان کو صرف پچاس وسق دیت دیتے، یہ ظلم و ستم کا بازار اسی طرح گرم تھا کہ آپ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے، آپ کی آمد کے بعد ایک بار اسی طرح کا ایک معاملہ پیش آیا تو مغلوب گروہ نے دیت دینے سے انکار کیا اور غالب گروہ کے پاس کہلا بھیجا کہ:۔

انما انما اعطیناکم ھذا ضیما	ہم ابتک زیادہ دیت صرف تمہارے ظلم اور خوف
منکم لنا وفرقا منکم فاما	کیوجہ سے دیتے رہے ہیں، اب جب کہ محمد
اذ اقدم محمد فلا نعطیکم ذالک	(صلے اللہ علیہ وسلم) کے آنیکے بعد ظلم و زیادتی
(مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۶)	کا خوف نہیں ہے) تو ہم زیادہ دیت نہیں دے سکتے۔

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں یہود کے لئے کس قدر سوہان روح ہوتی ہوں گی۔

(۷) یہود کی مخالفت کے اسباب میں ایک سبب تحویل قبلہ بھی ہے، جب تک مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، عام عربوں اور مسلمانوں میں اس کی وجہ سے ان کی ایک عظمت باقی تھی مگر جب تحویل قبلہ ہوا تو ان کی اس عظمت کو ایک اور دھکا لگا، ان کی مخالفت پہلے ہی سے کیا کچھ کم تھی، اب اس میں اور اضافہ ہوگیا، پہلے وہ یہ کہہ کر لوگوں کے سامنے اسلام کی اہمیت

کم کرتے تھے، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمارے ہی قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، اب وہ یہ کہہ کر مخالفت کرنے لگے، کہ یہ نبی عجیب دین لے کر آئے ہیں کہ جن کا قبلہ بھی بدلتا رہتا ہے، اور پھر یہ کہتے کہ جو لوگ اس سے پہلے والے قبلہ کی طرف رخ کر کے عبادت کر چکے ہیں، خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ، ان کی تمام عبادتیں اکارت گئیں، چنانچہ ان کے اس کہنے سننے کا اثر مسلمانوں پر بھی پڑا، اس لئے قرآن نے ان کے تمام اعتراضات کا جواب دیا، سورۂ بقرہ رکوع ۱۷، ۱۸ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے،

اس تحویل قبلہ کا اثر ان پر اس قدر پڑا کہ جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے، مثلاً کعب بن اشرف، رفاعہ بن قیس اور قردم بن عمر وغیرہ آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا بات ہے کہ تم نے قبلہ تبدیل کر دیا، اگر پہلے قبلہ کی طرف پھر لوٹ جاؤ تو ہم تمہاری تصدیق اور اتباع کریں گے[۱]

(۸) ان موانع کے باوجود جو نیک فطرت اور حق پسند افراد تھے وہ اسلام کی حقانیت کے قائل بلکہ اس کے قبول کرنے کی طرف بھی مائل تھے، مگر چوں کہ عام یہود آبادی اس کی مخالف تھی، اس لئے وہ ان کے خوف سے قدم آگے نہیں بڑھا سکے، اس سلسلہ میں احادیث و سیر میں متعدد واقعات ملتے ہیں۔

مسند طیالسی اور نسائی میں ہے کہ کچھ یہود آپ کے پاس آئے اور انھوں نے آپ سے تسع بینات[۲] کے متعلق سوال کیا، ارشاد ہوا کہ شرک نہ کرو، آپس میں قتل و خونریزی نہ کرو، چوری اور زنا سے پرہیز کرو، جادوگری اور سود خوری سے باز آؤ، پاکباز عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ بزدلی نہ دکھاؤ، کسی کمزور و بے قصور کو ناحق کوئی الزام رکھ کر قتل کرنے یا اس کے مال کے لینے کی کوشش نہ کرو، آپ جب یہ سب کچھ ارشاد فرما چکے تو انھوں نے آپ کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ

---

[۱] طبری میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے [۲] قرآن میں ہے کہ "وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ" اس روایت میں اسی طرف اشارہ ہے، تسع آیات کیا ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔

[۳] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ تمام عیوب ان میں موجود تھے۔

دیا، اور پکار اٹھے:۔

نشھد انک نبی — ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بیشک نبی ہیں۔

آپ نے فرمایا جب تمہیں میری نبوت تسلیم ہے تو میرا اتباع کرنے میں کیا چیز مانع ہے انھوں نے کہا۔

انا نخشی تبعناک ان یقتلنا الیھود — ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم نے آپ کا اتباع کیا تو ہمیں یہودی مار ڈالیں گے۔

(مسند طیالسی ص ۱۶۰ اجز ۵ ونسائی)

اسی طرح کعب بن اشرف جو بڑا مالدار یہودی تھا، اس کے متعلق زرقانی میں ہے کہ اسکے یہاں سے تمام یہودی علماء واحبار کو وظیفے ملتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد جب وہ ایک بار اس کے پاس اپنے وظائف لینے آئے تو اس نے کہا کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے، انھوں نے کہا کہ:۔

ھو الذی کنا ننتظر — یہ وہی ہیں جن کا ہم انتظار کر رہے تھے۔

چونکہ یہ جواب اس کی توقع کے خلاف تھا، اس لئے یہ کہہ کر کہ میرے مال میں اور بہت سے لوگوں کے حقوق ہیں، وظیفہ دینے سے انکار کر دیا، علماء و احبار اس کے یہاں سے لوٹے تو ان کو اپنے اظہار حق پر بڑا رنج ہوا، دوبارہ واپس آئے اور کعب سے عرض کیا کہ ہم نے عجلت میں جواب دیدیا تھا، بعد میں جب ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم نے جواب میں غلطی کی، یہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) وہ منتظر نبی نہیں ہیں، اس کے بعد کعب نے ان کے وظائف جاری کر دیئے اور یہ اعلان کر دیا کہ:۔

لکل من تابعھم من الاحبار شیئا من مالہ — جو علمائے یہود (آپ کی نبوت کی تکذیب میں) ان احبار کا اتباع کریں انکو بھی کچھ نہ کچھ وظیفہ ملیگا۔

(ج ۲ ص ۹، ۱۰)

اوپر جو اسباب و موانع بیان کئے گئے ہیں، ان سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہود کی مخالفت، اور اسلام دشمنی کسی حقانیت یا ٹھوس بنیاد پر نہیں تھی بلکہ اس میں صرف ان کی نفسانیت، خود غرضی اور دنیا وی مصلحتیں کام کر رہی تھیں، اور اس کو چھپانے کے لئے وہ مذہب کی آڑ لے رہے تھے۔

وفیات

آہ۔ مولانا سیّد احمد عروج قادری صاحب

سہ روزہ دعوت کے ذریعہ ایڈیٹر "زندگی نو" مولانا سیّد احمد عروج قادری صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر دو ماہ قبل مل گئی تھی، مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کی بنا پر ہم اپنے تاثرات صفحۂ قرطاس پر نہ لا سکے۔

مولانا عروج قادری صاحب ضلع اورنگ آباد صوبہ بہار کی ایک قدیم بستی اُمجھر شریف کے رہنے والے اور ایک معزز اور دیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا نے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لیا اور وہاں علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ تحصیل علم کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہو گئے اور پھر کچھ دنوں کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں بحیثیت استاذ ان کا تقرر ہو گیا اور غالباً ۴۵ء تک وہاں قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں کا درس دیتے رہے اور وہیں پہلی مرتبہ جماعتِ اسلامی سے متعارف ہوئے اور اس کی دعوت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے، اور اس کی مستقل رکنیت اختیار کر لی۔ جماعتِ اسلامی سے ان کی وابستگی اور اس کی سرگرمیوں میں انکی شرکت مدرسہ شمس الہدیٰ کے ارباب حل و عقد کو پسند نہیں آئی، اور مستقل کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا بالآخر انھیں مدرسہ سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے ایک معزز ملازمت سے علیحدگی ان کی زندگی کا بڑا حادثہ تھا، مگر

انھوں نے اس حادثہ کو نہ صرف بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا بلکہ انھوں نے دوسروں کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ پٹنہ سے رام پور مرکز جماعت اسلامی منتقل ہوگئے اور "زندگی" کے ایڈیٹر بنا دیئے گئے، اور پھر زندگی کی آخری سانس تک اس سے وابستہ رہے۔ علوم دینیہ پر ان کی محققانہ نگاہ تھی۔ جس کا اندازہ ان کی مختلف کتابوں اور زندگی میں شائع شدہ مختلف مضامین اور خاص طور پر باب الاستفسار والجواب سے ہوتا ہے۔

علم کے ساتھ مولانا اپنے عمل و کردار اور سادگی و تواضع میں علمائے سلف کا نمونہ تھے، اس دورِ قحط الرّجال میں ان کی موت سے اہل علم اور جماعتِ اسلامی کی صف میں ایک اہم خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنّت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔ آمین

محمد مُسلم صاحب ایڈیٹر "دعوت" کا سانحۂ ارتحال

۷؍ جولائی ۱۹۸۶ء کے سہ روزہ اخبار "دعوت" میں یہ غم انگیز خبر نظر سے گذری کہ سابق ایڈیٹر "دعوت" محمد مسلم صاحب کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ان کے انتقال سے ملتِ اسلامیہ ہندیہ اپنے ایک مخلص خادم، ایک جری اور نڈر صحافی، ایک سیاسی مبصّر اور ایک بے باک رہنما سے محروم ہوگی۔

ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

محمد مسلم صاحب مرحوم آزادی کے بعد مسلمانوں کی ملّی تحریکوں میں جہاں بڑے بڑے علماء اور تجربہ کار سیاست داں موجود ہوتے وہاں وہ اپنے نوجوان جذبات سے سب کو نہ صرف متاثر کرلیتے بلکہ کم عمری کے باوجود بزرگوں جیسی اہمیت حاصل کرلیتے تھے، وہ بھوپال کے ایک جاگیردار گھرانے کے لائق فرد تھے مگر اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ کر گذرنے کا جذبہ اور حوصلہ انھیں خاکسار تحریک تک لے گیا، مگر اس تحریک کی فکری لغزشوں اور جوش سے بھرے ہوئے

نعروں نے ان کو جلد ہی اس تحریک کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا اور اس سے علیحدہ ہو گئے۔ پھر وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پُر زور تحریروں اور جماعتِ اسلامی کے پروگرام سے متاثر ہوئے، اور اس تحریک میں نمایاں حیثیت سے شریک ہوئے اور پوری زندگی اپنی محنت اور ایثار و قربانی سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔

جماعتِ اسلامی کی مجلس شوریٰ ہو یا مسلم مجلس مشاورت کا اجلاس ہو یا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ ہو ہر جگہ ان کی اہمیت محسوس کی جاتی تھی۔ وہ تقریباً ۲۵ برس تک "دعوت" کے ایڈیٹر رہے اور جماعتِ اسلامی میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جماعتِ اسلامی کے اصولی اور نظریاتی رُخ کو قومی و ملّی کاموں اور کسی حد تک قومیت کی طرف پھیرا۔ گو وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے مگر ان کی زندگی سادگی اور ایثار و قربانی کا مکمل نمونہ تھی، ان کی کسی ادا سے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کے آدمی ہیں۔

ایک بار دلّی میں ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، ایک چھوٹا کمرہ ان کی رہائش گاہ تھا، جس میں نیچے اوپر چار پائیاں اور برتن وغیرہ رکھے ہوتے تھے، ایک گوشہ میں چولھا چکی رکھا ہوا تھا، اور تھوڑی سی جگہ مہمانوں کی نشست گاہ کا کام دیتی تھی۔ گو گھر کے اندر ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی مگر ہر چیز سے فقر و فاقہ کا احساس ہوتا تھا۔ ع

ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والوں میں

افسوس ہے کہ ملّتِ اسلامیہ ہند یکے بعد دیگرے اپنے ایک ایک مخلص خادموں سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے اور ان کی جگہ لینے والے کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

نسیم ظہیر اصلاحی غازی پوری

نئی کتابیں

رسولِ اکرم ﷺ اور یہودِ حجاز از برکات احمد صاحب، ترجمہ ڈاکٹر مشیر الحق صاحب تقطیع ۱۸/۲۲ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت ۲۰ روپے

پتہ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی 110025۔

عہد رسالت میں جزیرۂ عرب کے یہود کی ایک اہم تاریخی حیثیت ہے، مدینہ طیبہ کے آس پاس بسنے والے مختلف یہودی قبائل کے ساتھ مسلمانوں کے بہت سے سیاسی، معاشی اور تمدنی نوعیت کے اہم مسائل اور واقعات پیش آئے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ تحقیق اور چھان بین سے کام نہیں لیا گیا کہ صحیح وغلط اور رطب ویابس کی تمیز ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ سے مستشرقین ان واقعات کو غلط ڈھنگ سے پیش کر رہے ہیں اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر حیلہ جوئی، خوں ریزی اور دنیاداری وغیرہ کے الزامات عائد کر رہے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ محدثین عظام کے اصول جرح و تعدیل کے مطابق ان واقعات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جائے تاکہ واقعات کی صحیح شکل وصورت عیاں ہو سکے۔ اس سلسلے میں مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کی کتاب "اہل کتاب صحابہ وتابعین" میں موصوف کا مبسوط مقدمہ اس موضوع پر خاصے کی چیز ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اس حیثیت سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے جدید وقدیم دونوں ماخذوں سے استفادہ کیا ہے، مگر جدید

ماخذ اور انکے اثرات زیادہ نمایاں ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر انکا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ کر یورپین اور یہودی مصنفین کی تقلید کر بیٹھا ہے۔ مثلاً مصنف نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا غلط انھوں نے قرآن مجید کو بنایا ہے۔ مگر ان کے یہ جملے قرآن کے بیان سے مختلف ہیں۔

(۱) علاوہ ازیں وہ اپنی شرافت اور ایفائے عہد کے لئے بھی مشہور تھے ص۷۹۔

(۲) ایسی صورت میں صحیفہ کی سات دفعات میں لفظ "اثم" (عہد شکنی) کے استعمال کو دیکھ کر لامحالہ حیرت ہوتی ہے ص۸۰۔

(۳) ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں یہودیوں اور حرم مدینہ سے متعلق دفعات کا اضافہ ۵ھ کے بعد کیا گیا ص۸۱۔

اسی طرح مصنف نے اس وقت کے یہودیوں کی تعداد کا جو تخمینہ لگایا گیا ہے وہ محل نظر ہے،

کتاب کے بنیادی مضامین یہ ہیں:۔

(۱) ہجرت کے وقت عرب کے یہودیوں کی حالت۔

(۲) اصحاب صحیفہ۔

(۳) یہودیوں اور منافقین کی ساز باز۔

(۴) شکست احزاب۔

(۵) آخری مقابلہ۔

(۶) اختلاف کی نوعیت اور اس کے حدود۔

بحیثیت مجموعی کتاب محنت و تحقیق سے لکھی گئی ہے، اور لائق مطالعہ ہے۔ یہ کتاب مستشرقین کے اصول تحقیق اور مسلمانوں کے علم کلام اور اصول جرح و تعدیل کا ایک اچھا امتزاج ہے، علمی و تحقیقی کتابوں کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے، مگر ڈاکٹر مشیر الحق صاحب بڑی خوبی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

توضیح الصرف | تالیف محمود الحسن قاسمی استاذ جامعہ عربیہ قاسمیہ ادری۔ اعظم گڈھ۔ تقطیع

۱۸/۲۲ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ندارد، ملنے کے پتے مکتبہ نعیمیہ صدر بازار مئو اعظم گڈھ، مکتبہ صداقت مبارک پور اعظم گڈھ، مکتبہ حسینیہ دیوبند، مکتبۂ نعمانیہ دیوبند، مکتبۂ محمدیہ سرائے پختہ مراد آباد۔

ماہرین تعلیم کے نزدیک اصولی طور پر یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ چکی ہے کہ طلبہ کے لئے فنون کی ابتدائی رہنمائی ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیئے، نئے علم اور غیر زبان کا دوہرا بوجھ بیک وقت طلبہ پر ڈالنا اصول تعلیم کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ پھر طبیعت کی عجلت پسندی اور زمانے کی تیز رفتاری، قدیم نظام تعلیم کے مطابق عربی نحو وصرف سے پہلے فارسی قواعد اور زبان دانی کے طویل نصاب کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس تبدیلی رجحان کو ذاتی طور پر بعض علماء کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے محسوس کیا، اور وہاں سے عربی نحو وصرف کی مختلف ابتدائی کتابیں اُردو زبان میں جدید اجتہاد اور ترمیم کے ساتھ سامنے آئی ہیں، اس سلسلہ میں مولانا **حمید الدین فراہیؒ** کی کتاب "النحو والصرف" اور "تحفۃ الاعراب" بالکل اچھوتی اور نادر چیز ہے جن سے طلبہ کو سیکڑوں قواعد، تعلیل اور عوامل کو رٹنے سے نجات مل جاتی ہے، اور اصل مقصد بھی پورے طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے ہی احساس کے تحت زیر نظر کتاب کے مؤلف مولانا **محمود الحسن** صاحب قاسمی نے درس نظامی کی مشہور ابتدائی اور بنیادی کتاب "میزان" کو فارسی سے اردو میں منتقل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آسان، مؤثر اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے، فاضل مؤلف نے سوال وجواب کی صورت میں کتاب مذکور میں بیان شدہ مسائل کو من وعن علیحدہ علیحدہ اس سلیقہ سے بیان کیا ہے کہ اگر چند چیزوں کو نکال دیا جائے تو یہ کتاب ایک مستقل تصنیف محسوس ہونے لگے گی اور بلاشبہہ میزان کی تسہیل کے طور پر یہ کتاب ابتدائی طلبہ کے لئے مفید، دلچسپ اور آسان ثابت ہوگی، مگر اس حیثیت سے کہ اس وقت عربی اصول وقواعد کی جدید انداز اور ترمیم کے ساتھ از سر نو تدوین اور طرز تعلیم کی اصلاح وتجدید ہو چکی ہے، اور ہو رہی ہے، اس کتاب میں کوئی جدت وندرت نہیں ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی قدیم کتابوں کی طرح نہ یاد ہونے والے بے شمار قواعد، ابواب اور گردانوں کا مجموعہ ہے، بعض مسائل

میں تقدیم و تاخیر ضروری تھی، مگر فاضل مؤلف نے اس معمولی تصرّف کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ مثلاً صفحہ ۱۸ کے آخر میں سوال کیا گیا ہے کہ "فعل ماضی کا آخر معرب ہوتا ہے یا مبنی؟" حالانکہ طالب علم کو ابھی یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ معرب اور مبنی کسے کہتے ہیں؟۔ اسی طرح عامل کی تعریف سے پہلے عامل کا ذکر بطور اصطلاح ہوا ہے۔

اس طرح کی چیزیں طلبہ کے لئے الجھن کا سبب بنتی ہیں اور وہ سمجھے بغیر صرف رٹ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ غالباً قدیم کتابوں میں ایسی ہی بے اعتدالی کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ؎

"صرفیاں رامغز باید چوں سگاں"

جب کہ جدید طرز پر لکھی ہوئی ابتدائی کتابیں اس طرح کی بہت ساری غیر فطری چیزوں سے بالکل پاک صاف ہو گئی ہیں، کتاب کے سلسلہ میں بعض اور باتیں قابل ذکر ہیں:-

صفحہ ۲۳ پر فعل مضارع کی تعریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس میں زمانہ، حال اور استقبال دونوں پایا جاتا ہے، یہاں حاشیہ یا ملاحظہ کے تحت یہ بتانا چاہیئے تھا کہ وہ کون سے حروف ہیں جن کے آنے سے فعل مضارع، حال یا استقبال کے لئے خاص ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۳۰ پر بتایا گیا ہے کہ "ماضی مبنی الاصل ہے، اس لئے اس میں مانافیہ کچھ عمل نہیں کرتا، اس سلسلہ میں دو باتیں عرض ہیں، ایک تو یہ کہ طالب علم ابھی یہی نہیں جانتا کہ مبنی الاصل کیا چیز ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ سوال ہی بے معنی معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ مانافیہ کا عمل صرف معنوی ہوتا ہے لفظی نہیں جیسا کہ صفحہ ۲۹ پر بتایا گیا ہے، لہٰذا اب یہ کہنا کہ مائے نفی فعل ماضی کے لفظ میں اس لئے عمل نہیں کرتا کہ وہ مبنی الاصل ہے اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اگر غیر مبنی پر مائے نفی آئے تو وہاں عمل کر سکتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، چنانچہ فعل مضارع پر مائے نفی آتا ہے اور کوئی عمل نہیں کرتا جبکہ فعل مضارع معرب ہے۔

کتاب کے آخر میں افعال متصرفہ کے تمام ابواب کا ایک نقشہ بھی منسلک ہے جس سے طلبہ کے لئے "منشعب" کے ۴۳ بابوں کو علی الترتیب سمجھنے میں سہولت ہو گی، نقشہ میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "اس کا پانچ باب ہے" یا "اس کا تین باب ہے" حالانکہ "اس کے پانچ ابواب ہیں، تین ابواب ہیں" ہونا چاہیئے، اس طرح کی نقشہ میں اور بھی لفظی غلطیاں

ہیں۔

کتاب کے شروع میں مختلف علماء کی تقاریظ کے علاوہ مؤلف کے استاد اور مربی خاص اور راقم کے مشفق و محسن مولانا منظور الحسن صاحب قاسمی صدر مدرس جامعہ قاسمیہ ادری کا مختصر مگر جامع مقدمہ بھی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ فاضل مؤلف کی یہ پہلی کاوش ضرور بار آور ہوگی، اور درس نظامی والے مدرسوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اور وہاں کے ابتدائی طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

مسلم پرسنل لاء کی اہمیت

از مولانا ابوالجمال صغیر احمد صاحب قاسمی سابق ایڈیٹر ماہنامہ "المنار"۔ کوپا گنج۔ اعظم گڈھ۔

گذشتہ سال شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے غلط فیصلے نے مسلم عوام میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا اور تقریر و تحریر ہر سطح پر اس کی زبردست مخالفت کی گئی۔ علماء نے مختلف کتابیں اور پمفلٹ لکھ کر مسلم پرسنل لاء کی اہمیت سپریم کورٹ کے فیصلے کی نوعیت اور اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیوں کے اسباب کی وضاحت اور اس کے ازالہ کی کوشش کی ہے۔ مولانا صغیر احمد صاحب کا یہ رسالہ بھی اس حیثیت سے عام لوگوں کے لئے خاصے کی چیز ہے، اس میں مولانا نے مسلم پرسنل لاء کی اہمیت، سپریم کورٹ کے فیصلے کی حقیقت، غلط فہمیوں کے اسباب اور ان کی اصلیت' نان نفقہ کی شرعی حیثیت اور متاع معروف کی اصل حقیقت پر بہت ہی سلجھے ہوئے اور موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کے بعد گو اس وقت یہ مسئلہ دب گیا ہے مگر اس کے باوجود یہ رسالہ اپنی افادیت کے لحاظ سے اب بھی عام لوگوں کے لئے معلومات افزاء اور مطالعہ کے لائق ہے۔

Regd. No AzM / N. P. 42 / 84 Phone :- 24
Regd. No. R. N 38937 / 81

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ وقرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت وجلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشرواشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں ۔...... ادارے کا خرچ ...... ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپیہ کے قریب ہے ۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنے کے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں سکا معادلہ منظور کر لیا ہے ۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط وکتابت کرنا چاہئے ، مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ رجون سے شروع ہو جاتا ہے ۔

فضل نعیمی پریس مئو

اگست ستمبر
۱۹۸۶ء

ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

مجیب اللہ ندوی

زیر اہتمام [illegible] جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ



سالانہ چندہ ہندوستان سے 25/= خصوصی معاون 100/= قیمت فی پرچہ 2/50	جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ ماہنامہ جامعۃ الرشاد	سالانہ چندہ غیر ممالک سے بارہ ڈالر امریکی 12/=

جلد ۱۳ | اگست، ستمبر ۱۹۸۶ء مطابق ذی الحجہ، محرم الحرام ۱۴۰۶-۰۷ھ | شمارہ ۶۱، ۶۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی

کتابت: شوکت علی محلہ بلاقی پورہ، دارالعلوم روڈ مئو ضلع اعظم گڈھ۔ یوپی

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل نعیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رشحات

ناظرین الرشاد جانتے ہیں کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں کی خدمت میں راقم الحروف ۶، ۷ مہینے سے خطوط، رشحات اور زبانی طور پر یہ گذارش کرتا رہا ہے کہ آپ دفعہ ۱۲۵ کی ترمیم کو اپنے کام کی آخری منزل نہ سمجھیں بلکہ مسلم پرسنل لاء کے پورے ڈھانچے اور دفعہ ۴۴ کی ترمیم کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کر کے اس کے لئے عوامی جدوجہد جاری رکھیں، جس کی گونج پارلیمنٹ کے اندر اور باہر شروع ہو گئی ہے۔ پچھلے مہینے ندوہ میں دار القضاء کی میٹنگ میں بھی مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر محترم اور جنرل سکریٹری صاحب کی موجودگی میں راقم الحروف نے اپنی یہ بات دھرائی، مگر ذمہ داروں کی تقریروں سے اندازہ ہوا کہ یہ حضرات مسلم پرسنل لاء اور مسلمانوں کے دوسرے مسائل کے سلسلے میں کوئی اقدامی پوزیشن اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنا سارا زور اصلاح معاشرہ پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک اصلاح معاشرہ کے کام کی اہمیت کا تعلق ہے اس سے کسی صاحب فہم کو انکار نہیں ہو سکتا، مگر آپ یہ بتائیں کہ آپ یہ کام کن ذرائع سے کریں گے۔ اب تک مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں ہلکی سی جو کامیابی ہوتی ہے وہ عوام کے ان پر شور جذبات کے نتیجہ میں ہوتی ہے جو ان کے اندر احترام شریعت کی نسبت سے آپ حضرات اور دوسرے لوگوں کی تحریروں اور تقریروں اور مسلم جماعتوں کی جدوجہد سے

پیدا ہوتے تھے، اصلاح معاشرہ کا کام کوئی جذباتی کام نہیں ہے جو نعروں اور تقریروں سے ہو جائے، تو آپ بتائیں کہ اصلاح معاشرہ کا کام آپ کیسے کریں گے۔؟

آپ نے نہ تو کسی صوبہ میں کوئی پائیدار شاخ بنائی ہے اور نہ اضلاع میں، پھر یہ کام کس سے کرائیں گے، آپ حضرات میں سے کسی نے اس کام کو واحد مقصد نہیں بنایا ہے اور نہ اس کے لئے کوئی ٹیم آپ نے بنائی ہے، بلکہ بہت سے دینی، علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ایک یہ کام بھی آپ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، آپ کے پاس تحریری ہدایتیں بھیجنے کے علاوہ دوسرا کوئی مؤثر ذریعہ نہیں ہے، مگر کیا چند تقریریں کر دینے، چند سرکلر بھیج دینے اور پمفلٹ شائع کر دینے سے یہ کام ہو سکتا ہے؟

آپ حضرات اس بات کو ہم عامیوں سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ یہ ملّت کی موت و زیست کا مسئلہ ہے، آج تک ان مسائل میں ہماری لڑائی میں وزن اس لئے ہے کہ ۲۵ تا ۳۰ کی دفعات کی بنا پر دستوری طور پر ہماری پوزیشن کسی حد تک مضبوط ہے، لیکن مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں اگر دستوری طور پر ہم کو دفعہ ۴۴ اور دوسری دفعات کو نافذ کرکے بے دست و پا کر دیا گیا تو پھر اصلاح معاشرہ کا کام بھی پیچھے پڑ جائے گا، آج ہمارے سامنے روزانہ ایسے مسائل آتے رہتے ہیں جن میں شریعت کا حکم کچھ ہوتا ہے، مگر قانونی طور پر ایک فریق کا مفاد اسپیشل میرج ایکٹ یا ہندو سکسشن ایکٹ میں نظر آتا ہے اور وہ شریعت کے حکم کو ٹھکرا دیتا ہے اور ان دفعات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے تو اصلاح معاشرہ کی اور زیادہ شدید ضرورت ہے، مگر ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب دفعہ ۱۲۵ کی لڑائی ہم لڑ رہے تھے تو اس وقت بھی یہی صورت تھی کہ شریعت کا حکم کچھ تھا اور دفعہ ۱۲۵ کا منشا اور سپریم کورٹ کا فیصلہ کچھ اور تھا، اس وقت اصلاح معاشرہ کی تحریک چلانے کے بجائے حکومت اور عدلیہ کے خلاف اتنی زبردست مہم کیوں چلائی گئی؟ اگر وہ شریعت میں دستوری مداخلت تھی جس کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوتی تو پھر دوسری دستوری مداخلتوں کے سلسلہ میں خاموش رہنے کا کیا جواز ہے؟ دفعہ ۱۲۵ میں جو خلا تھا اسی سے تو شاہ بانو نے اپنے کیس میں فائدہ اٹھایا، گویا دستوری خلا ہماری اصلاح معاشرہ کی تحریک کو بھی کمزور کر دے گا۔

اس اباحیت پسندی کے دور میں اپنے معاشرہ سے یہ توقع رکھنا بوالعجبی ہوگی کہ وہ کبھی اسلامی احکام سے سرتابی نہیں کرے گا، اس لئے اصلاح معاشرہ کی اخلاقی کوششوں کے ساتھ مسلم پرسنل لا،

کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرانے کی جدو جہد جاری رکھنا بھی ضروری ہے، تاکہ ہماری اخلاقی کوششوں کو قانونی سہارا بھی مل سکے۔ موجودہ اسلامی معاشرہ کو دیکھتے ہوئے اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہماری ساری کوششیں بے کار ہو کر رہ جائیں گی اور حکومت کی پوری کوشش بھی یہی ہے۔ اس لئے کسی آئیڈیل معاشرہ کے وجود میں آنے کی امید میں ہم کو اپنی دستوری کوششوں کو چھوڑنا ایک سنگین غلطی ہوگی۔

اس وقت احترام شریعت کے تعلق سے مسلمانوں میں جو عوامی بیداری پیدا ہو گئی ہے اس میں آپ حضرات کی کوششوں اور شخصی حیثیت کا بڑا دخل ہے۔ اب اگر مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا گیا تو ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی اور ہم اس شعر کے مصداق ہو کر رہ جائیں گے ؎

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

ملت کے جسم سے بے عملی کے خار کو نکالنے کے ساتھ ہمیں محمل کی تیز رفتاری کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا۔

اس لئے احقر کی گذارش ہے کہ آپ لوگ ایک بار پھر مسلم پرسنل لاء یا ۱۹۳۷ء کے شریعت ایکٹ کی جو حیثیت آزادی یعنی ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی اسے جوں کا توں باقی رکھنے کا مطالبہ کریں اور جس جس گوشہ سے وہ آزادی کے بعد مجروح ہوا ہے اس کو میمورنڈم کی شکل میں آپ حکومت کو دے دیں۔ بحمد اللہ راقم الحروف نے ۸، ۹ مہینے کے درمیان ان سب کی نشاندہی کر دی ہے۔ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی "معاشرتی مسائل یا مسلم پرسنل لاء کی ترتیب کا جو کام کرا رہے ہیں بحمد اللہ راقم الحروف نے آج سے بیس برس پہلے اسے کر دیا ہے اور وہ چیز شائع بھی ہو چکی ہے، مگر اس وقت کام یہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ حکومت سے اس کی حیثیت کو منوانے کا ہے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اصل کام یہی ہے۔

ہم یہ باتیں اس احساس اعتراف کے ساتھ لکھ رہے ہیں کہ آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی جن سخت اور نامساعد حالات میں کی ہے وہ آزادی سے پہلے کی مسلمانوں کی رہنمائی سے کتنی گنا زیادہ اہمیت رکھتی ہے، مگر بہر حال ہم اپنے احساسات کو آپ کے ذریعہ ہی حکومت تک پہونچا سکتے ہیں، اس لئے یہ چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں ؎

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

تین چار مہینے کے اندر بارہ بنکی، نیوریا، الٰہ آباد، احمد آباد، بڑودہ، بھڑوچ، نڈیا اور رام نگر کرناٹک میں فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کی جان و مال سے جو ہولی کھیلی گئی ہے اور جس طرح ہندو پبلک، پولیس اور پی۔ اے۔ سی نے انسانیت کی دھجیاں بکھیری ہیں وہ پورے ملک اور حکومت کے لئے باعثِ شرم ہے، ابھی یہ فسادات کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ آسام سے پھر ایسی خبریں آنا شروع ہو گئی ہیں کہ گن پریشد کی موجودہ حکومت اپنی بے عملی کو چھپانے کے لئے پھر غیر ملکیوں کے مسئلہ کو ابھار رہی ہے اور اس کا رُخ مسلمان اقلیت کی طرف ہے، دیکھئے یہ فتنہ دوبارہ کیا قیامت ڈھاتا ہے۔

ادھر جب سے پنجاب میں دہشت پسندی میں اضافہ ہوا ہے اس وقت سے فرقہ پرست طاقتیں اور نیشنل پریس اس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لئے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی فکر میں ہے جس کا کھلا ہوا ثبوت دہلی میں دو ماہ پہلے ہونے والے فسادات اور گجرات کی ریزرویشن تحریک سے ملتے ہیں۔ دلی میں ایجی ٹیشن تو شروع ہوا پنجاب کی دہشت پسندی کے خلاف مگر اس کا رُخ جلد ہی مسلمانوں کی طرف پھیر دیا گیا، اسی طرح گجرات میں ہریجنوں کے لئے جو ریزرویشن ہے اس کے خلاف تحریک شروع ہوئی اور جلد ہی اس کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیر دیا گیا۔

بہر حال مسلمان ان حالات سے غافل نہیں ہیں۔ اب انھیں موم کی گڑیا نہ سمجھ لیا جائے کہ جس طرف چاہیں آپ مروڑ دیں۔ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ حالات کو بگڑنے نہ دے ورنہ مسلمانوں کو بھی اگر پریشان کر کے گھر سے باہر سڑک پر آنے پر مجبور کیا گیا تو یہ ملک کے لئے کوئی خوش آیند بات نہ ہوگی۔

ایک غلطی کی تصحیح

گرامی قدر! سلام مسنون

جولائی کے الرشاد میں صفحہ ۱۱ پر سورۃ اعراف کی جو آیت نقل کی گئی ہے اس کا نمبر غلط شائع ہو گیا ہے، یہ سترہویں نہیں بلکہ ایک سو تینتالیسویں آیت ہے آپ خود کلام پاک کھول کر دیکھ لیں اور آئندہ شمارہ میں اس کی تصحیح ضرور کر دیں۔

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں۔ والسلام

کبیر احمد جائسی

اَقسَامُ القُراٰن ـــــ صحیح نقطۂ نظر

از مولانا عبدُالمجید صاحب ندوی

علوم قرآن کا میدان نہایت وسیع اور گوناگوں ہے۔ علماء اسلام نے ہر دور میں اسے اپنی علمی و تصنیفی کد و کاوش اور تلاش و تحقیق کا عنوان بنایا ہے اور اس سلسلہ میں نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، برصغیر ہند و پاک کے علماء بھی اس بحر بیکراں کی غواصی و شناوری میں کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آسمان ہند کے افق پر بعض ایسی نامور ہستیاں نمودار ہوئی ہیں جن کی مثال پیش کرنے سے معاصر عالم اسلام قاصر رہا ہے، ان ہی میں علامہ مہائمی اور امام المفسرین علامہ حمیدالدین الفراہیؒ ہیں۔ علامہ فراہیؒ کا پایہ علوم القرآن میں بہت بلند ہے۔ تقریباً علوم القرآن کے تمام پہلوؤں پر علامہ کی مکمل و نامکمل تالیفات و تصنیفات مطبوعہ و غیر مطبوعہ شکل میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن مجید میں وارد قسموں کے مطالب و مفاہیم سے متعلق ایک رسالہ موسومہ "امعان فی اقسام القرآن" ایک خاص اور مکمل تصنیف ہے، علامہ کا یہ رسالہ نہایت معرکۃ الآراء ہے جو پہلی بار ہندوستان اور دوسری بار کویت سے طبع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی صاحب تفسیر "تدبر قرآن" نے اس کا اردو ترجمہ بھی نہایت سلیس و بلیغ زبان میں کر دیا ہے۔ سطور ذیل میں اسی شاہکار رسالہ کی تلخیص و تسہیل کی کوشش کی گئی ہے اس توقع کے ساتھ کہ اس کا مطالعہ قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والے اہل ذوق کے لئے مفید اور نفع بخش ہو گا۔

قسموں کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ مقسم بہ (جس کی قسم کھائی جائے) کا درجہ و مرتبہ مقسم (قسم کھانے والے) سے بڑھ کر ہوتا ہے اور ہونا چاہیے اور مقسم علیہ (جس پر قسم کھائی جائے) ایسے امور ہونے چاہئیں جنھیں تسلیم کرنے کے لئے قسم مفید و موثر ہو سکے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں وارد قسموں کے بارے میں چند اعتراضات وشبہات کئے جاتے ہیں:۔

(۱) قسم فی نفسہ اللہ تعالیٰ کی شان وعظمت کے خلاف ہے، کیونکہ قسم وہ کھاتا ہے جو اپنی بات کو حقیر اور اپنی ذات کو ضعیف سمجھتا ہے، جیساکہ قرآن مجید میں وارد ہے۔" وَ لَا تطع کل حلاف مهين"

(۲) اللہ تعالیٰ کو کیسے زیبا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی قسم کھائے اور وہ بھی تین و زیتون جیسی حقیر اشیاء کی۔

(۳) قرآن مجید کے مقسم علیہ ایسے اہم امور ہیں جن کے لئے محض قسم ناکافی ہے کیونکہ مخالف کو دلیل وحجت چاہیئے۔ اور موافق کو سب کچھ پہلے ہی سے تسلیم ہے۔

ان اعتراضات وشبہات کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے امام رازیؒ مفسرین کی جماعت میں پہلے شخص نظر آتے ہیں لیکن انہوں نے بھی دو باتوں کو بنیاد بنالیا ہے جو بجائے خود غلط ہیں اس لئے امام موصوف کے جوابات سے اعتراضات رفع تو کم ہوئے البتہ مزید شک وشبہات کا دروازہ کھل گیا۔ امام موصوف کی دونوں بنیادی باتیں یہ ہیں:۔

(۱) قسم کے ذریعہ کسی دعویٰ کے بعد اس کی تاکید مقصود ہوتی ہے۔

(۲) مقسم بہ عظیم الشان ہوتا ہے اور قسم سے مقصود مقسم بہ کی عظمتِ شان کی طرف تنبیہہ ہوتی ہے۔

امام موصوف نے پہلی اصولی و بنیادی بات سورۂ والصافات میں بیان کی ہے اور دوسری سورۂ والذاریات میں۔ اور اسی کو تین و زیتون کی تفسیر میں بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن امام موصوف کی ان دونوں باتوں میں کئی کمزوریاں اور نقائص ہیں جنہیں ذیل میں واضح کیا جا رہا ہے:۔

(الف) امام موصوف کی پہلی بنیادی اور اصولی بات میں یہ نقص ہے کہ قرآن مجید کی قسمیں ہر جگہ دعویٰ و دلیل کے بعد ہی نہیں وارد ہوتی ہیں کہ انھیں محض ذکر کے دعویٰ

کی تاکید سمجھ لیا جائے بلکہ برخلاف اس کے واقعہ یہ ہے کہ دعویٰ و دلیل کے بعد
کی قسموں سے زیادہ بلا دعویٰ و دلیل کے تذکرہ کے وارد ہوتی ہیں چنانچہ وحی
کے ابتدائی زمانہ میں قسمیں سابق دعویٰ کے بغیر ہی زیادہ وارد ہوئی ہیں۔

امام موصوف نے اس اصول کو اختیار کر لینے کے باعث بڑی زحمت محسوس کی اور پھر نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے حتی الامکان قسموں کی نفی کرنی شروع کردی۔ سورۂ قیامہ کی تفسیر میں سورہ کے پہلے ہی لفظ "لا" کی بابت فرماتے ہیں کہ "ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں "لا" قسم کی نفی کے لئے ہو"۔ حالانکہ امام موصوف کا یہ احتمال اسلوب عرب اور اسلوب قرآن کے بالکل منافی ہے۔ قسم کے پہلے "لا" کا استعمال کلام عرب میں بہت زیادہ ذائع و شائع ہے۔ یہ "لا" منقطع ہوتا ہے، یعنی کلام مابعد سے الگ ہوتا ہے مثلاً حارث بن عباد کہتا ہے:-

کلا، ورب الراقصات اليّ ۔ کلا، ورب الحل والحرم

نابغہ ذبیانی کہتا ہے:

کلا، لعمر الذی مسحت کعبة

وما هريق على الانصاب من جسد

(ب) امام موصوف کے دوسرے اصول میں یہ نقص ہے کہ مقسم بہ کے لئے عظمت شان کی تقیید و تخصیص صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی مخلوق خواہ کیسی ہی عظیم الشان ہو، اپنے خالق اور پروردگار کے لئے اس میں عظمت و تقدس کا پہلو کیا ہو سکتا ہے اور کیونکر ہو سکتا ہے؟

امام رازیؒ کو اس اصول نے یہاں تک پہونچایا کہ انھوں نے تین و زیتون کو دو مسجدیں یا مقدس مقامات مان کر ان کی تفصیل بیان فرمایا ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ تین و زیتون دو جانے پہچانے معروف و مشہور پھل اور پودے ہی ہیں۔ فخر الدین امام رازیؒ (۱۱۴۹ھ - ۱۲۰۹ھ) کے بعد قرآن کی قسموں سے متعلق، علامہ ابن قیم (۱۲۹۲ - ۱۳۵۰ھ) نے بھی کلام کیا ہے۔ علامہ موصوف کا نقطۂ نظر، امام رازیؒ سے مختلف ہے۔ علامہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) قرآن کی کل قسموں کا مقسم بہ، اللہ کی ذات، صفات اور اس کی آیات (مخلوقات) ہیں۔

(۳) قرآن کی کل قسموں کا مقسم علیہ، توحید، رسالت اور آخرت ہیں۔

علامہ ابن قیمؒ کے پورے کلام و بیان کا خلاصہ انھیں مذکورہ بالا دو اصولی باتوں میں سمٹ گیا ہے۔ ان اصولی باتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد علامہ موصوف کے نزدیک مقسم علیہ کی کھوج وکرید کی ضرورت ان مقامات پر بھی نہیں رہ جاتی جہاں وہ مذکور نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ والعصر اور سورہ والعادیات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں :-

"یہاں جواب قسم حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ معلوم ہے کہ انھیں تین باتوں (توحید، رسالت اور آخرت) پر قسم کھائی جاتی ہے۔"

علامہ ابن قیمؒ کا یہ اصولی نقطۂ نظر امام رازیؒ سے بہت بہتر اور اقرب الی الصواب ہے۔ لیکن یہ بات پھر بھی باقی رہ گئی کہ ایک مخلوق اپنے خالق کے لئے مقسم بہ ہونے سے خارج نہ ہو سکی جس کے باعث یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہا کہ مخلوق کے مقسم بہ ہونے میں کیا راز ہے ؟

قرآن کی قسموں سے متعلق مفسرین و ماہرین علوم قرآنیہ میں سے جن لوگوں نے بھی اب تک لکھا ہے ان میں یہی مذکورہ بالا دو نقطۂ نظر زیادہ متداول و مشہور رہے ہیں لیکن اصل گتھی یعنی مخلوق کی خالق کے لئے عظمتِ شان کا مسئلہ لاینحل باقی رہا۔ اس مسئلہ کا حل اور اس کی حقیقت دراصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں مخلوقات کی تمام تر قسمیں از قبیل دلائل وشواہد ہیں۔ نہ تو وہ صفاتِ الٰہی کی قسمیں ہیں اور نہ ان کا تعلق تعظیمی اقسام سے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) قسم میں جب مقسم بہ مذکورہ نہ ہو تو اس سے محض جزم کا اظہار ہوتا ہے یعنی بیانِ خبر یا اظہار عزیمت وغیرہ، جیسے قرآن مجید میں وارد ہے۔ "وقاسمھما انی لمن الناصحین۔"

(۲) جن قسموں میں مقسم بہ مذکور و موجود ہو، ان کی حقیقت یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے دعویٰ کی دلیل اور شہادت کے طور پر مقسم بہ کو ملا لیا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس قبیل کی قسموں میں بیشتر "وَ"، "بِ" اور "تَ" کا استعمال پایا جاتا ہے جو معیت وصحبت کا مفہوم ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔ وَ اور بِ تو عام طور پر معیت کے لئے مستعمل ہیں اور تَ بھی دراصل وَ ہے جو منقلب ہو کر تَ ہو گیا ہے،

اس کی مثال "تقویٰ" اور "تجاہ" ہے۔

قسموں کے بارے میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ قسمیں ہمیشہ اپنی فطرت کے لحاظ سے فریقین کی موجودگی میں ہوا کرتی تھیں۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی جب کہتا ہے "اشہد بہ" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "میں یہ بات اپنے علم، واقفیت اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہتا ہوں، صرف دوسروں سے سن کر نہیں کہتا ہوں"۔ چنانچہ اسی بنا پر حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا۔ "وماشہدنا الابما علمنا وما کنا للغیب حافظین"۔ اس بات کی مزید وضاحت ذیل کی آیت شریفہ سے ہو جاتی ہے فرمایا:۔

"لکن اللّٰہ یشہد بما انزل الیک، انزل بعلمہ، والملائکۃ یشہدون وکفا باللّٰہ شہیدا۔"

علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ "انا اشہد"، "واللہ یشہد" اور "واللّٰہ یعلم" وغیرہ، الفاظ عمومی طور پر عربی زبان میں قسم کے لئے مستعمل ہیں اور یہ بات عربی زبان ہی کے لئے مخصوص بھی نہیں ہے بلکہ ہر زبان اور ہر قوم میں جب یہ بولا جاتا ہے کہ "اللہ گواہ ہے" تو اس کا مطلب قسم کے سوا کچھ اور نہیں ہوا کرتا چنانچہ سیبویہ کے نزدیک "اقسم" اور "اشہد" بالکل یکساں ہیں اور پھر اس سارے جھگڑے کو قرآن مجید کی ذیل کی آیت چکا دیتی ہے:۔

"اذا جاءک المنافقون، قالو انشہد انک لرسول اللّٰہ، واللّٰہ یعلم انک لرسولہ، واللّٰہ یشہد ان المنافقین الکاذبون، اتخذو ایمانہم جنۃ فصدوا عن سبیل اللّٰہ۔"

اس آیت کریمہ میں صاف طور پر منافقین کی شہادت کو "یمین" کہا گیا ہے۔ جس کے معنی قسم کے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی شہادت کو بھی قسم کہا گیا ہے:۔

"ویدرءعنہا العذاب ان تشہد اربع شہادات باللّٰہ انہ لمن الکاذبین۔"

اس آیت میں "شہادات باللہ" کھلے طور پر قسم کے معنی میں ہے۔ اس طرح قرآن پاک کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ قسمیں دراصل "شہادت" کے معنی میں ہوتی ہیں۔ یعنی کسی شئے کی قسم کا مطلب دراصل

اُس شے کی شہادت پیش کرنا ہے۔ یہ چیز قرآن مجید ہی کے اس قاعدہ اور اصول کی بنیاد پر متعین ہوتی ہے کہ وہ اپنی بعض مجمل یا مبہم باتوں کو بعض دوسری مفصل اور واضح باتوں سے بیان کر دیتا ہے "القرآن یفسر بعضہ بعضا" کا یہی مفہوم ہے۔

اب رہی یہ بحث کہ قسم سے مقسوم بہ کی تعظیم و تقدیس کا تعلق ہے تو یہ قسم کے لوازم میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے جو کبھی کبھار پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

"لعمرك انهم لفی سكرتهم يعمهون"

اس سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام و عزت کا اظہار ہے کیونکہ جب مقسم بہ مخاطب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مخاطب کو یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ تو میری نظروں میں سب سے زیادہ عزیز و محترم ہے، لیکن اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیئے کہ ایسی قسم میں مخاطب معزز و محبوب ہونے کے درجہ سے آگے بڑھ کر مقدس و معبود بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب مقسم بہ کی اضافت متکلم کی طرف ہو تو اس سے خود اپنی عزت و عظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کے باعث اس طرح کی قسم بندوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد کا شاید مفہوم یہی ہے کہ:-

"اپنے سر کی قسم مت کھا، کیونکہ ایک بال بھی سفید یا سیاہ کرنے پر تو قادر نہیں ہے"۔

عرب جس طرح لڑنے جھگڑنے میں طاق تھے، اسی طرح قول کی پاس داری اور ایفائے عہد میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ خانۂ کعبہ ان کا سب سے بڑا معبد تھا، معاہدوں کے وقت خانۂ کعبہ کے پاس آنا اور پھر آہستہ آہستہ مجرد اس کا یا دیگر شعائر حج کا ذکر ایک دینی قسم کی حیثیت اختیار کرتا گیا، مذہبی و دینی قسموں کی اصل نوعیت یہی ہے۔ ان سے مقصود محض عظمت و تقدس نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانا ہے۔ پھر یہیں سے اللہ تعالیٰ کے وکیل و کفیل ہونے کا مفہوم پیدا ہوا، یعنی نقض عہد کی صورت میں قہر الٰہی کا اندیشہ۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی قسموں سے اصل مقصود استشہاد و استدلال ہوتا ہے، اس مفہوم کی طرف جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ خود قرآن مجید رہنمائی کرتا ہے۔ یعنی:-

(۱) "تفسیر الآیات بالآیات" یا "القرآن یفسر بعضہ بعضا" یا حمل النظیر علی النظیر کا مسلمہ اصول رہبری کرتا ہے کہ قسم سے مقصود شہادت ہے۔ کیونکہ بعض آیات میں دلائل و شواہد کو

سادہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے اور بعض میں قسمیہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سادہ اسلوب میں وارد ہے:۔

"ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر..... لآیات لقوم یعقلون"

اور قسمیہ اسلوب میں انھیں شواہد و دلائل کو یوں بیان کیا:۔

"والفجر ولیال عشر والشفع والوتر واللیل اذا یسر، ھل فی ذالک قسم لذی حجر"

اور اسی طرح "والسماء ذات الرجع والارض ذات الصدع" وغیرہ آیات ہیں۔

(۲) قرآن مجید نے ایک ہی لفظ کبھی بندے کے لئے استعمال کیا ہے اور کبھی خدا کے لئے، ایسی صورت میں لامحالہ لفظ کے مختلف مفاہیم میں فرق کرنا پڑے گا، تاکہ خداوند قدوس کی جانب کوئی ایسی بات نہ منسوب ہو جائے، جو اس کی عظمت و تقدیس کے منافی ہو، مثلاً "صلوٰۃ" کا لفظ جب بندے کی طرف سے ہو تو دعا کا معنی دیتا ہے اور جب خدا کی طرف سے ہو تو رحمت کے معنی دیتا ہے یہی حال الفاظ توبہ، شکر، مکر، کید، سخط، اسف اور حسرت وغیرہ کا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ہمارے لغت کا کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کو ہم اس فرق کے لحاظ کے بغیر خدائے تعالیٰ کیلئے استعمال کر سکیں، لہذا ہماری طرف سے قسم کے معنی و مفہوم اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے قسم کے معنی و مفہوم میں فرق ضروری ہے، اگر ہم قسم سے "شہادت" کے ساتھ ساتھ عظمت کا مفہوم رکھتے ہوں تو یہ خدا کے لئے مناسب اور شایانِ شان نہیں ہے۔ کوئی سلیم العقل ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو اپنے لئے معظم و مقدس بنائے گا۔ بالخصوص ایسی مخلوقات جن میں تقدیس کا ادنیٰ پہلو بھی نہیں پایا جاتا۔ جیسے تین و زیتون، دوڑنے والے گھوڑے اور غبار اڑانے والی آندھیاں وغیرہ۔

(۳) مقسم بہ اور مقسم علیہ میں نہایت واضح اور گہری مناسبت موجود ہوتی ہے۔ صاحب تظر بادنیٰ تامل ان کے درمیان رشتہ کو پکڑ لیتا ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ بھی جن کے نزدیک مقسم بہ میں تعظیم و تقدیس کا عنصر پایا جانا ایک اصول کلیہ کے طور پر ہے۔ سورۂ الذاریات میں وارد شدہ قسموں کے بارے میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "انہا کلہا دلائل اخبرھا فی سورۃ الایمان"

قرآن مجید نے جس طرح کی تعمیم عام دلائل و آیات میں رکھی ہے۔ اسی طرح کی تعمیم و وسعت بعض مقا
پر مقسم بہ میں بھی رکھی ہے، مثلاً :-

" فلا اقسم بما تبصرون ومالا تبصرون "

اس میں جملہ کھلی اور چھپی چیزوں کو سمیٹ لیا ہے، اسی تعمیم سے ملتی جلتی وہ قسمیں ہیں جو
بالعموم متقابل چیزوں کی قسمیں ہیں جیسے روز و شب، زمین و آسمان، طاق و جفت، نر و مادہ،
بیٹا و بیٹی وغیرہ۔ لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کی اس عموم کے،
ہرگز تعظیم و تقدیس نہیں فرمائی ہے۔ البتہ انھیں دلائل و شواہد کے طور پر ذکر فرمانا واضح ہے۔

(۵) بعض مواقع پر مقسم بہ ایسے صفات کے ساتھ مذکور ہے کہ ان میں شہادت و دلالت
طور پر مترشح ہے۔ مثلاً

" والنجم اذا ھوی " یا " فلا اقسم بالخنس الجواری الکنس " یا " لا اقسم بالنفس اللوامہ " ظاہر کرتا ہے کہ تاروں کا گرنا اور پیچھے ہٹنا اور نفس کی ملامت گری وغیرہ ایسی باتیں نہیں ہیں کہ ان کا تعلق بجائے استدلال و استشہاد کے تعظیم و تقدیس سے جوڑ دیا جائے۔

(۶) بعض مقامات پر مقسم بہ سے پہلے عام دلائل و شواہد کا ذکر ہوا ہے۔ پھر مقسم بہ ایسے انداز
آیا ہے کہ انگلی اٹھا کر پچھلی تمام دلیلوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جیسے سورہ الذاریات میں فرمایا ہے

" وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون، وفی السماء رزقکم وما توعدون "

" یعنی زمین و آسمان میں خدا کی پروردگاری اور جزا کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں "۔

اس ارشاد کے بعد، یعنی زمین و آسمان کے دلائل جزا کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا :-

" فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون "

اس آیت کریمہ میں " انہ " کی " ہ " سے مراد مرجع جزا ہے جن لوگوں نے اس سے قرآن مجید مر
ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔

اس قسم میں ایک خاص پہلو غور و فکر کا خصوصی طالب ہے کیونکہ اس میں اللہ سبحانہ و تعا

سے کھائی گئی ہے لہٰذا اس میں تعظیم کا پہلو موجود ہے، لیکن باوجود اس کے اس میں آسمان وزمین سے استشہاد و استدلال نمایاں ہے۔ چنانچہ مقسم بہ کا ذکر ایسی صفت و اضافت کے ساتھ کیا گیا ہے جو سبق استدلال و استشہاد کی طرف اشارہ کر رہی ہے چونکہ اس میں تعظیم و تقدیس کا پہلو ابھرا ہوا ہے جو ممکن تھا استدلال کے پہلو کو دبا دیتا، اس لئے اللہ جل شانہٗ نے استدلال و استشہاد کی تمہید پہلے استوار فرما دی۔

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قسم در اصل قسم بہ کو مقسم علیہ پر دلیل و شہادت کے طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔ باقی اور جو پہلو بھی قسموں میں پایا جاتا ہے وہ قسم کے عوارض میں سے ہے، نہ کہ اس کے لوازم میں سے۔

اس بحث کے بعد ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خلش پیدا ہو کہ جب اصل حقیقت قسموں کی یہ ہے تو پچھلے علماء پر یہ بات مخفی کیوں رہی اور جو بات آج تک علماء مفسرین نے نہیں لکھی اس پر دل کیسے مطمئن ہو۔ لہٰذا سطور ذیل میں اس کے اسباب بیان کئے جاتے ہیں:۔

(۱) پہلا سبب قسم کے صحیح مفہوم کے مخفی رہ جانے کا یہ ہے کہ بعض مواقع پر مقسم بہ فی نفسہ کوئی اعلیٰ چیز ہے، مثلاً قرآن مجید، مکہ، طور، شمس و قمر اور کواکب وغیرہ، اس سے اوّلاً ذہن میں یہی بات آئی کہ اعلیٰ و اشرف چیزوں کی قسم کھانے کا جو رواج ہے، اسی صنف میں قرآن کی قسمیں بھی داخل ہیں۔ اس خیال کے جڑ پکڑ جانے کے بعد دلیل و شہادت کے مفہوم میں ان کو لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اگر کوئی مقسم بہ ایسا سامنے آیا جس میں مختلف احتمالات نکلے تو ایسے مواقع پر انھوں نے اسی احتمال کو ترجیح دیدی جو اس کے شرف و عظمت کے پہلو کو نمایاں کرے، اس طرح صحیح سمت بڑھنے کی راہ خود بخود مسدود ہو گئی۔ پانی کا قاعدہ ہے کہ کوئی مانع نہ ہو تو نشیب کی طرف گرتا چلا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ علماء کا قاعدہ ہے کہ وہ ایسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جو ایک قاعدہ کلیہ بن سکے۔ قرآن کی قسموں میں کہیں کہیں تو دلیل و شہادت کا پہلو نمایاں ہے مگر کہیں کہیں نہایت مخفی بھی ہے، اس لئے علماء کو خیال ہوا کہ یہ قاعدہ

ہر جگہ نہیں چل سکتا، لہٰذا صحیح نہیں ہے۔

(۳) تیسرا سبب یہ ہے کہ زیادہ تر قسمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے شعائر سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے گمان ہوا کہ قسموں کی اصل یہی ہے۔ اس خیال کے جڑ پکڑ لینے کے بعد دوسری چیزوں کی قسموں کو انھوں نے مجاز پر محمول کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیاء کی قسموں کا مفہوم یعنی دلیل و شہادت ہونا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ البتہ جہاں انکار ممکن ہی نہیں ہوا وہاں اس سے بطور دلیل و شہادت تسلیم بھی کر لیا، گویا قرآن نے ہاتھ پکڑ کر رہنمائی کر دی لیکن سابق خیال اس قدر راسخ رہا کہ طبیعت کا اصل رجحان اسی طرف رہا۔

(۴) چوتھا سبب یہ ہے کہ بعض واقعات و قصص جو اپنے اندر مختلف پہلو رکھتے تھے وہ کبھی ایک ہی پہلو سے زیادہ مشہور ہو گئے اور اس شہرت نے ان کے دوسرے پہلوؤں کو مغلوب کر دیا، یہاں تک کہ سامنے سے اوجھل ہو گئے۔ مثلاً فرعون اور اس کی قوم کی تباہی میں سمندر کا پانی زیادہ مشہور ہو کر اصل بن گیا جبکہ اسکی تباہی میں ہوا کو پانی سے کم دخل نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی حال قوم نوحؑ کے عذاب کا ہے اس کے متعلق بھی پانی کا طوفان اصل عذاب بن گیا۔ جب کہ ہوا کو اس میں کم دخل نہیں ہے۔ اس طرح مقسم بہ اور مقسم علیہ کی باہمی مناسبت کے اصل پہلو پردۂ خفا میں پڑ گئے اور استدلال و شہادت کی تمام بلاغت تہ و بالا ہو گئی۔

(۵) پانچواں سبب یہ ہے کہ علماء کی توجہ وقت کے مقبول عام اور مروجہ نقلی و عقلی علوم و فنون نے تمام تر اپنی طرف جذب کر لی جس کے باعث ان کو بعض ایسے علوم کیطرف پوری توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی جو "تفسیر قرآن" میں ان مروجہ علوم و فنون سے زیادہ کارآمد تھے۔ مثلاً ان زبانوں کا علم جن میں قرآن اور دوسری دینی کتب نازل ہوئیں یا سامی قوموں اور ان کے لٹریچر وغیرہ کی تاریخ وغیرہ۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قسم کے اسلوب پر بھی مختصر کلام ہو جائے۔ قسم کے اسلوب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) اسلوب قسم میں دلیل ڈھونڈنے میں مخاطب خود بخود متکلم کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عناد کا داعیہ سرد پڑ جاتا ہے۔

(۲) قسم کے اسلوب میں قول کی پختگی اور سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے جس طرح اکثر اثبات و انکار کی تاکید کے لئے استفہام اور تعجب کا اسلوب مستعمل ہے۔

(۳) اسلوب قسم میں ایجاز ہوتا ہے اور جب الفاظ کم ہوں تو مفہوم حجابات سے مجرّد ہو کر بسہولت گرفت میں آجاتا ہے۔

(۴) اسلوب قسم میں دلیل، دعویٰ سے پہلے آجاتی ہے، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دلیل آہستہ آہستہ مخاطب کو اصل دعویٰ تک کھینچ لاتی ہے۔

(۵) اسلوب قسم بصورت "انشاء" وارد ہوتا ہے تاکہ مخاطب کو انکار و تردید کی فرصت نہ ملے یعنی چاہے وہ جوابِ قسم کا انکار کر دے جو بصورت "خبر" ہوتا ہے، لیکن نفس قسم کا انکار ممکن نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قسم کا اسلوب جو بصورت "انشاء" ہوتا ہے دراصل وہ بھی "خبر" ہوتا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ خود قسم سے انکار نہ کر سکے جس کے باعث اسلوب خبر میں جو چیز پنہاں ہے اس کا کم از کم فوری انکار ناممکن ہو جاتا ہے اور وہی بعض دفعہ مخاطب کے قلب میں بٹھانا مقصود ہوتا ہے، مثلاً "وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ"، اس میں قرآن مجید مقسم بہ ہے لیکن مقسم علیہ کے طور پر قرآن مجید کی حقانیت بھی تسلیم کرانا مقصود ہے جو منکر کے لئے بھی تھوڑی دیر تسلیم کرنا ایسا ضروری ہو گیا جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں رہی۔

(بقیہ ص ۱۵ کا) سوال کیا کہ اس ملک میں سب سے بڑی کمی کس چیز کی ہے؟ پھر میں نے خود ہی جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ اس ملک میں سب سے زیادہ کمی پُرامن اور دیانتدار شہریوں اور نوجوانوں کی ہے، مگر اس کمی کو کوئی اسکول، کوئی کالج اور کوئی یونیورسٹی پورا نہیں کر رہی ہے، بلکہ یہ سب انتہائی خراب نوجوانوں کی نسل تیار کر رہے ہیں۔ عربی مدارس کا اس ملک میں سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ اپنے یہاں سے پرامن، سنجیدہ، اور دیانتدار شہری پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بات ان کے مزاج کو سامنے رکھ کر کہی تھی، چنانچہ اس کا انتہا اثر پڑا کہ مشہور اخبار (انگریزی) "پیٹریاٹ" نے اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔
اگر خدانخواستہ ہم نے اپنی حیثیت باقی نہ رکھی تو ہمیں دینی کام کرنے کا موقع جو اس ملک میں نصیب ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

الحجر

مولانا سعید الرحمٰن علوی (پاکستان)

"راقم الحروف کی کتاب "اسلامی فقہ" میں ایک باب حجر یعنی کورٹ آف اوارڈ (Court of Award) پر بھی ہے مگر کتاب میں اسے مستقل موضوع کی بنا پر پوری تفصیل نہیں دیا سکی تھی اس مضمون میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس لئے اسے شائع کیا جاتا ہے"۔

(مرتب)

حجر کی لغوی و شرعی تحقیق

حَجَرَ یَحْجُرُ حَجْرًا و حَجَرًا و حُجْرًا و حجرانًا و حِجْرٌ و حِجرانًا۔

علیه منعه من التصرف بماله۔

یعنی "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ کسی کو اس کے مال میں مطلق تصرف سے منع کرنے پر بولا جاتا ہے،

علیه الامر کا مفہوم ہوتا ہے۔ منعه عنه۔

اسی طرح۔ حجر یحجر حجرا وحجرا علیه الامر ای حرمه علیه له

هکذا فی المنجد الابجدی وقال صاحب المنجد الحجر مصدر ــ

المنع مطلقا الحرام یقال هذا حُجْرٌ علیك ای حرام علیك له

کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہی لغوی بحث "المنجد" میں موجود ہے۔

(المنجد فی اللغة والادب والعلوم ۱۲۰)

الحجر فی اللغة: التضیق والمنع ومنه قول الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم لمن قال اللّٰهم ارحمنی وارحم محمدا ولا ترحم

معنا احداً۔

"لقد حجرت واسعًا یا اعرابی۔"

ومعناہ فی الشرع، منع الانسان من التصرف فی مالہٗ ؎

لغت میں حجر کہتے ہیں تنگی کرنا اور منع کرنا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ایک ارشاد اسی مفہوم میں ہے۔ جو آپ نے ایک دیہاتی سے کہا تھا۔ وہ اپنے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کر رہا تھا کہ "اے اللہ تو مجھ پر رحم کر اور محمد پر رحم کر اور ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ کر آپ نے اس سے فرمایا:

"اے دیہاتی! تو نے اس ذات کی رحمت کو محدود و تنگ کر دیا جو بڑی وسعت والی ہے"

اور شریعت میں اس کا معنی ہے، انسان کو اس کے مال میں تصرف سے روک دینا۔

الحجر کا لغوی معنی مطلق روکنا ہے جو بھی رکاوٹ ہو اور شرعاً یہ ہے کہ ایک خاص طریق سے تصرف سے منع کرنا۔ ؎

الحجر وھو لغۃ یقال للمنع والحرام ولمقدم الثوب حجر کو لغت میں کہتے ہیں منع کرنا۔ حرام اور کپڑے کے سامنے کا حصہ۔

وشرعًا: قال ابن عرفۃ صفۃ حکمیۃ توجب منع موصوفھا من نفوذ تصرفہ فی الزائد علی قوتہ او تبرعہ بمالہٗ قال وبہ دخل حجر المریض والزوجۃ ؎

اور شرعاً اس کا مفہوم ابن عرفہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ایک ایسی صفت حکمی جو اس کے موصوف کو اپنے زائد مال میں تصرف سے روک دے یہ روکنا قوت کے سبب ہو یا اخلاقی اقدار کا لحاظ کر کے کسی مریض کو وقتی طور پر روک دینا یا اپنی اہلیہ کا ہاتھ پکڑ لینا اور اس کو روک دینا بھی اس ضمن میں آتا ہے۔

الحجر فی اللغۃ: المنع والتضیق ومنہ سمی الحرام حجرا: قال تعالیٰ (۲۵: ۲۲) ویقولون حجرا محجورا) ای حراما محرما ویسمّی العقل حجرا قال اللہ تعالیٰ (۸۹: ۵) ھل فی ذالک قسم لذی حجر) ای عقل سمی حجرًا لانہ یمنع صاحبہ من ارتکاب ما یقبح وتضر عاقبتہ وھو فی الشریعۃ منع الانسان من التصرف فی مالہ۔ ؎

یعنی حجر لغت میں منع اور تضییق (تنگی) کا نام ہے۔ حرام کو حجر سے موسوم کیا گیا جیسا کہ قرآنِ عزیز کی سورۃ ۲۵ آیت ۲۲ کا ٹکڑا ہے "ویقولون حجرا محجورًا" اور عقل کو بھی اس سے موسوم کیا گیا جیسا کہ قرآن عزیز کی سورۃ ۸۹ کی آیت ۵ میں ہے "ھل فی ذالك قسم الذی حجر" عقل کو اس سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ یہ انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے جو قبیح اور بری ہیں اور جن کا انجام نقصان دہ ہے اور شریعت میں حجر نام ہے انسان کو اس کے مال میں تصرف سے روکنے کا۔

الحجر ھو لغۃ المنع وشرعا المنع من التصرفات المالیۃ والاصل فیہ قول تعالیٰ (وابتلوا الیتامی حتی اذا بلغوا النکاح) وقولہ تعالیٰ (فان کان الذی علیہ الحق سفیھا اوضعیفا) الخ وقد فسر الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ السفیہ بالمبذر والضعیف بالصبی والکبیر بالمختل والذی لا یستطیع ان یمل بالمغلوب علی عقلہ فاخبر اللہ تعالیٰ ان ھولاء ینوب عنھم اولیاءھم فدل علی ثبوت الحجر علیھم ۵؎

حجر لغت میں منع کو کہتے ہیں اور شریعت میں تصرفات مالیہ سے روکنے کو۔ اس میں اصل بنیاد قرآن عزیز کی سورۃ نساء کی یہ آیت ہے جس میں ارشاد ہے۔ اور سدھارتے رہو یتیموں کو جب تک پہونچیں نکاح کی عمر کو اور دوسرا یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے جس پہ قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے اس کا وکیل انصاف سے ۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "سفیہ" کی تفسیر تو "مبذر" (بے جا اڑانے والا) سے کی ہے۔ ضعیف کی بچہ کے ساتھ اور کبیر کی مختل کے ساتھ (جس کو خلل دماغ کا عارضہ لاحق ہو) اور جو طاقت نہیں رکھتا کہ لکھوا سکے اس کی تفسیر کی اس کے ساتھ جس کی عقل مغلوب ہو چکی ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان سب کی طرف سے نائب ہوں ان کے وارث و وکیل۔ اسد یہ بات ان کے حق میں حجر کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے۔

حجر کا لغوی معنی عربی میں بچاؤ ہے علاوہ ازیں رکاوٹ پابندی ممانعت، مزاحمت کے لئے ایک خاص اصطلاح ہے اور کسی حق یا شئے کے مصرف میں لانے یا ہبہ، صدقہ، عطیہ، بیع وشری نکاح و غیرہ کے اختیار پر پابندی کا عمل اور اس کا نتیجہ دونوں مراد ہیں ۱؎

حضرات احناف فرماتے ہیں:

هو عبارة عن منع مخصوص، متعلق بشخص مخصوص عن تصرف مخصوص أو عن نفاذ ذالك التصرف۔

مالکیہ کہتے ہیں:

الحجر توجب منع موصوفها عن نفوذ تصرفه فيما زاد على قوته كما يوجب منعه في نفوذ تصرفه في تبرعه بزائد على ثلث ماله۔

اور حنابلہ بعض مال کے ساتھ اسے مخصوص قرار دیتے ہیں اس لئے وہ تعریف کرتے ہیں:

هو منع مالك عن تصرفه في ماله۔

بعض ائمہ نے حجر کو بڑی وسعت دی اور کہا کہ ہر وہ عمل روکا جاسکتا ہے جس کا ضرر دوسروں تک پہونچے جیسے نیم حکیم کو طب سے جاہل مفتی کو فتویٰ سے۔ اسی طرح ہر مضرت رساں عمل پر پابندی لگائی جاسکتی ہے[۱۲]

اس مختصر سی لغوی بحث سے، جس میں شرعی بحث بھی آگئی، یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ "حجر" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا تعلق کسی فرد یا جماعت کو مختلف قسم کے تصرفات سے روکنا ہے جب کہ ان کے تصرف سے بگاڑ و فساد اور ضرر و نقصان کا اندیشہ ہو اور بالخصوص اس کا تعلق مالی تصرفات سے روکنے سے ہے، اس لئے کہ مال جو حلال ذریعہ سے حاصل ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس کی حفاظت بے حد لازم ہے، بے احتیاطی، بے تدبیری اور ایسے اسباب سے اگر وہ ضائع ہو جاتے تو جہاں متعلقہ شخص کا نقصان ہوگا وہاں اور بھی بہت سے لوگ نقصان کا شکار ہو جائیں گے، اس لئے شریعت اسلامیہ نے کچھ ضوابط و حدود تجویز فرما دیئے ہیں تاکہ فساد و بگاڑ سے بچا جاسکے۔ انھیں ضوابط و حدود میں سے ایک "الحجر" ہے جس کے متعلق یہاں گفتگو مقصود ہے۔

جس شخص کو "حجر" کے ذریعہ تصرفات سے پابند کیا جاتے اسے "محجور" کہا جاتا ہے۔

حجر کے اسباب

کون کون سے لوگ ایسے ہیں جنھیں اس قسم کی پابندیوں کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے:

(الف) نابالغ (ب) غیر عاقل (ج) غیر ذمہ دار بالخصوص فضول خرچ شخص (د) دیوالیہ
(ہ) غلام جب کہ مالک کی طرف سے اسے لین دین کی اجازت نہ ہو۔[۱۲]

فقہ ابن حزم ظاہری میں ہے:

لا یجوز الحجر علی احد فی ماله الا علی من لم یبلغ او علی مجنون فی حال جنون..... ولا اعتراض لاب ولا لزوج ولا لحاکم فی شئ من ذالک الا ما کان معصیة لله تعالیٰ فهو باطل مردود[۱۳]

اس عبارت سے نابالغ، مجنون اور اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کرنے والے کے لئے حجر ثابت ہوتا ہے۔ آخری کا یہی مفہوم ہے کہ باپ کو بیٹے پر زوج کو بیوی پر اور حاکم کو رعیت پر کسی چیز میں اعتراض کا حق نہیں، ہاں جو چیز اللہ تعالیٰ کی معصیت بنتی ہو وہ باطل اور مردود ہے۔

ابن قدامہ نے حجر کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

ایک تو کسی پر پابندی لگانا اس کے ذاتی مفاد میں۔ دوسرے پابندی لگانا دوسروں کی وجہ سے۔

دوسروں کی وجہ سے جو پابندی لگائی جاسکتی ہے اس میں یہ چیزیں شامل ہیں۔

(الف) مقروض پر پابندی قرض خواہوں کی وجہ سے (ب) مریض پر پابندی ورثا کی وجہ سے (ج) مکاتب اور غلام پر آقا کی وجہ سے (د) راہن پر مرتہن کی وجہ سے اور کسی ذاتی مفاد میں جو پابندی لگائی جاتی ہے اس میں الصبی (بچہ) مجنون اور سفیہ (بیوقوف) شامل ہیں[۱۴]

الہدایہ میں ہے:

الاسباب الموجبة للحجر ثلاثة: الصغر، والرق، والجنون۔

یعنی جو اسباب حجر کا باعث بنتے ہیں وہ تین ہیں کم سنی، غلامی اور جنون۔ جب کہ امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

یحجر علی السفیه ویمنع من التصرف فی ماله لانه مبذر ماله بصرفه لا علی الوجه الذی یقتضیه العقل فیحجر علیه نظرا له اعتبارا بالصبی بل اولیٰ لان الثابت فی حق الصبی احتمال التبذیر وفی حقه حقیقة ولهذا امنع عنه المال ثم هو لا یفید بدون الحجر لانه یتلف بلسانه

ما منعم من يد لا ثه

یعنی سفیہ (بے وقوف، کم عقل) پر پابندی لگائی جائے گی اور اسے مال میں تصرف سے روکا جائیگا کیونکہ وہ اپنے مال کو فضول طریق سے برباد کر رہا ہے اس کے خرچ کا وہ انداز نہیں جس کا عقل تقاضا کرتی ہے اور جسے عقل پسند کرتی ہے۔

اس لئے ایسے شخص پر پابندی لگائی جائے گی اس کے حال کا بچہ کے ساتھ اعتبار کرتے ہوئے، کیونکہ بچہ کے حق میں تبذیر (فضول خرچی) کا احتمال ہے اور یہ شخص فی الحقیقت اور بالفعل فضول خرچی کا مرتکب ہو رہا ہے لہٰذا اس کا مال روکا جائے گا اور یہ ممانعت حجر کے بغیر مفید نہیں کیونکہ محض زبان سے روکنا غیر مفید ہے ہاتھ سے روکنا اور پابندی لگانا ہی مفید ہوگا یعنی لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

صاحب منہاج لکھتے ہیں:

منه حجر المفلس لحق الغرماء والراهن للمرتهن المريض لورثته والعبد لسيده

والمرتد للمسلمين ولها ابواب ومقصود الباب حجر المجنون والصبي والمبذر ثه

یعنی مفلس کو روکنا قرض خواہوں کے لئے، راہن کو مرتہن کے لئے، مریض کو وارثوں کے لئے، غلاموں کو آقا کے لئے اور مرتد کو مسلمانوں کے لئے اس کے کئی ابواب ہیں اور جو ابواب مقصود ہیں، وہ ہیں مجنون، بچے اور مبذر کا حجر اور انھیں روکنا۔

صاحب قدوری نے اسباب حجر تین شمار کئے ہیں۔ نابالغ ہونا، غلام ہونا، پاگل ہونا، اور حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے حوالے سے سفیہ کو بھی اس میں شامل کیا ثه

ابن رشد مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

نابالغ بچوں پر حجر کے سلسلہ میں علماء کا اتفاق ہے جب تک کہ وہ بالغ ہو کر صاحب عقل و خرد نہ ہو جائیں رہ گئے وہ لوگ جو بالغ ہیں عاقل ہیں اور فضول خرچ ہیں (الحجر على العقلاء الكبار اذا ظهر منهم تبذير لاموالهم) تو ایسے شخص کے معاملہ میں امام مالک، امام شافعی، اہل مدینہ اور اکثر اہل عراق (احناف) کا یہی موقف ہے کہ ان پر پابندی لگائی جائے، حضرات صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے (جب کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی موقف ہے جیسا کہ آگے آتے گا انشاء اللہ تعالیٰ) اس بحث کے اختتام پر

وہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے اسباب حجر چھ گنواتے ہیں۔

الصغیر۔ السفیہ ۔ العبد۔ المفلس ۔ المریض۔ الزوجۃ۔ [۹]

العلامۃ ابو البرکات لکھتے ہیں:

سبب الحجر ای اسبابہ سبعۃ۔

خمسۃ عامۃ واثنان خاصان بما زاد علی الثلث۔

واشار للخمسۃ العامۃ بقولہ۔

فلس بالمعنی الاعم او الاخص۔

وجنون بصرع او استیلاء وسواس۔

وصبا۔

وتبذیر لمال۔

ورق واشار بقولہ۔

ومرض متصل بموت ونکاح بزوجۃ ای فالزوج یحجر علیہا فیما زاد علی الثلث [۱۰]

یعنی اس کے اسباب سات ہیں پانچ تو عام ہیں اور دو خاص ہیں۔ جن کا تعلق ایک تہائی مال سے زائد کے ساتھ ہے۔

جو پانچ عام ہیں ان میں سے ایک تو مفلس ہونا ہے دوسرا مجنون ہونا ہے اس میں عام ہے کہ کوئی شخص جن کے حادثہ کا شکار ہو یا وساوس کا شکار ہو تیسرا بچہ ہونا چوتھا تبذیر ہے، جس کا تعلق حماقت و بیوقوفی سے ہے پانچواں سبب غلامی ہے اور جو دو خاص اسباب ہیں جن کا تعلق ایک تہائی مال سے زائد کے ساتھ ہے ان میں سے ایک تو مرض الموت ہے کہ مریض کو اپنے مال کے ⅓ حصہ سے متعلق کسی قسم کی وصیّت کا حق ہے اس سے زائد چونکہ ورثاء کا نقصان ہے اس لئے اس کی اجازت نہ ہوگی اور اس پر پابندی لگائی جائے گی دوسرا زوجہ کا معاملہ ہے کہ ایک میاں اپنی آزاد، عقلمند، صحیح الدماغ اور تندرست بیوی پر ⅓ مال کی حد تک تو پابندی نہیں لگا سکتا، اس سے زائد پر پابندی کی اسے اجازت ہے۔

السید سابق نے حجر کی دو قسمیں لکھی ہیں لحق الغیر جیسے مفلس پر حجر لگانا تاکہ وہ اپنے قرض خواہوں کے حقوق کا اتلاف نہ کر سکے جیسے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پر پابندی لگا دی اور ان کا مال ان کے قرض کے بدلے بیچ ڈالا۔

فقد حجر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علی معاذ وباع مالہ فی دینہ۔

(رواہ سعید بن منصور) اور دوسرا حجر لحفظ النفس جیسے صغیر مجنون، اور سفیہ پر پابندی

فان فی الحجر علی ھولاء مصلحۃ تعود علیھم بخلاف المفلس کہ ان پر پابندی کی مصلحت کا فائدہ ان کو ہوگا بخلاف مفلس کے کہ اس کا فائدہ دوسروں کو ہوگا۔ الخ

اسباب حجر کے تحت جو گفتگو ہوئی اس سے اندازہ ہوگیا کہ بعض اسباب ایسے ہیں جن کا تعلق فی نفسہ اس شخص سے ہے جس پر حجر و پابندی عائد کی جا رہی ہے جیسے بچہ مجنون، سفیہ وغیرہ جب کہ بعض ایسے اسباب ہیں جن کا مفاد دوسروں کو پہونچتا ہے، جیسے مفلس کہ ایک شخص مالی ابتری کا شکار ہے مقروض ہے اس پر اخراجات کے سلسلہ میں رکاوٹ و پابندی اس کے قرض خواہوں کے لئے ہوگی تاکہ انھیں ان کا قرض واپس مل سکے گو کہ کسی درجہ میں فائدہ اس کو بھی ہوگا کہ یہ قرض سے اس طرح سبکدوش ہوسکے گا، یا مرض الموت کا شکار مریض کہ اس پر پابندی کا فائدہ اس کے وارثوں کو ہوگا۔ اور اگر تمام اسباب کو مجتمع کرکے ان کا خلاصہ نکالا جائے اور اس کی روح بیان کی جائے تو "دفع مضرت و رفع فتنہ وفساد" پر بحث آکر رکے گی اور کہا جائے گا کہ شریعت اس قسم کی پابندیاں اس لئے لگاتی ہے تاکہ فرد اور معاشرہ فتنہ و فساد سے محفوظ رہے۔ مال و دولت کا ضیاع نہ ہو اور انسان ہر قسم کی تہمت والزام سے بچ سکے، امام مالک، ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مقننین اور اسلامک لاء کے ماہرین ایک مسرف و مبذر پر پابندی کی بات کرتے ہیں اور ہیئت انتظامیہ کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ایسے شخص پر تصرفات مالیہ کے سلسلہ میں رکاوٹ و پابندی عائد کریں تو ظاہر ہے کہ اسی لئے ہے کہ مال و دولت کا ضیاع نہ ہو، کچھ لوگوں کے حقوق تلف نہ ہوں اور معاشرہ میں فساد و بگاڑ پیدا نہ ہو۔

ان ائمہ کے نزدیک وہ قرض دار بھی حجر کی زد میں آتا ہے جو اپنا قرض ادا کرنے کے لئے اپنی جائداد بیچنے سے انکار کرتا ہے۔ ۲۲

اس حوالہ سے حکومت ان لوگوں کے حالات پر سنجیدگی سے غور کرے جو بینکوں سے لاکھوں کروڑوں کے قرض لے کر پلازے اور صنعتی پلاٹ وغیرہ بنا کر جائداد بناتے چلے جاتے ہیں اور پھر جب بینک ان سے واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ بینکوں کو عدالتی حکم امتناعی کے چکر میں الجھا کر الٹا مزید نقصان کرتے ہیں۔

اور اس طرح سٹیٹ اور رعایا کا بے حد نقصان ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنے اللے تللے اڑاتے رہتے ہیں۔

اسی طرح یہ ائمہ اس شخص کو بھی حجر کا مستحق گردانتے ہیں جو مختلف النوع قومی ذمہ داریاں یا قرض کی ادائیگی سے بچنے کی غرض سے جائداد کے جعلی انتقال کرتا پھرے اور صرف ذمہ داریوں سے بچنے کی غرض سے انہیں ادھر سے ادھر کردے[۴۳]

یہ صورت حال بھی بڑی نازک ہے خاص طور پر ہمارے ملک میں جہاں ایک خاص طبقہ ملک کی غالب جاگیر و جائیداد پر ہی مسلط نہیں بلکہ انتظامیہ، مقننہ عدلیہ اور دوسرے ہر شعبہ پر اس کا کنٹرول ہے۔ یہی طبقہ اب جاگیر و جائیداد پر قبضہ سے آگے بڑھ کر تجارت وصنعت پر بھی چھا چکا ہے اوّل تو اس کے پاس جو جاگیر ہے وہ ہی محل نظر ہے کہ اس کے آباؤ اجداد نے قومی مفادات کا سودا کر کے غیر ملکی سامراج اور آقاؤں سے یہ جاگیر حاصل کی۔ پھر اس نے سرکاری ٹیکسز اور الٰہی ٹیکسز (عشر وغیرہ) کی ادائیگی کی کبھی فکر نہیں کی (الا ماشاء اللہ تعالیٰ) اس نے تجوریاں بھریں اور مختلف ذرائع و اسباب سے سیاست و نظم اور عدل مقننہ پر بھی قابض ہو گیا۔ اس کی ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ وہ زکوٰۃ تک جیسے لازمی حکم سے بچنے کی غرض سے سال ختم ہونے سے چند دن قبل اپنا سرمایہ اپنی بیوی وغیرہ کے نام منتقل کرا دیتا ہے اور اگلے سال وہ پھر اسی طرح مالک ہوتا ہے اور جب کبھی حکومت اس جائیداد و جاگیر کے حصے بخرے کرنے کا سوچتی ہے تو وہ جعلی انتقالات سے جائیداد کو اِدھر اُدھر کر دیتا ہے، ایسے اشخاص پر حجر و پابندی بے حد ضروری ہے۔ ہم اپنے ملک کی مختصر تاریخ میں زرعی اصلاحات کے نام پر تین مرتبہ (دولتانہ۔ ایوب۔ بھٹو کے ادوار) اس قسم کے جعل و فراڈ سے گذر چکے ہیں اس لئے ملک کے اہل علم اور بالخصوص حکومتی اداروں اسلامی نظریاتی کونسل، اسلامی تحقیقاتی ادارہ اور شریعت کورٹ پر لازم ہے کہ وہ اس کا سدباب کرلے اور سدباب کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس قسم کے لوگ حجر کے ذریعہ پابند کر دیئے جائیں۔ یہ لوگ اور اس قسم کے افراد صرف اسی جرم کے مرتکب نہیں بلکہ یہ تبذیر کی ضمن میں بھی آتے ہیں، اس لئے ان پر پابندی لازم ہے۔ اس کا ذکر ہم آئندہ چل کر کریں گے۔

(باقی آئندہ)

سباق (گھڑدوڑ)
شرعی نقطۂ نظر سے
(۳)

مولانا ریاض الحسن نوری (مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

مذکورہ بیان سے ثابت ہوگیا کہ نہ صرف امام مالک محلل کو ناپسند کرتے تھے بلکہ محلل کا ادخال ایک ایسی برائی اور گندگی تھی جس میں صحابہ کرام میں سے کوئی ملوث نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں جس گھڑدوڑ کا ہم نے حوالہ دیا اس میں سرے سے کوئی انعام یا عوض مقرر ہی نہیں تھا۔ یعنی جس میں عمر بن العاصؓ کا بیٹا پیچھے رہ گیا تھا۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ میں محلل کی تو کوئی روایت نہیں ہے لیکن مسلم کی روایت میں جو مسابقت کی روایت ہے اس کے متعلق امام نووی نے واضح کر دیا ہے کہ حدیث میں عوض کا ذکر نہیں ہے۔

امام مالک کے محلل کو ناپسند کرنے اور صحابہ کرام کے اس گندگی میں ملوث نہ ہونے کی وجہ صاف ظاہر ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ کثیر روایات میں آچکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محلل پر لعنت فرمائی۔

گھڑدوڑ دراصل گھوڑوں کے لئے تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ لیکن جہاد کے لئے بامر مجبوری اس کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا۔ عینی بھی لکھتے ہیں۔ کہ مسابقت گھوڑوں میں تعذیب نہ ہوگی۔ کیونکہ ان کو سکھانے اور جہاد کی تیاری کیلئے ایسا ضروری ہوتا ہے۔ آج کل تو گھوڑوں کو طرح طرح کے ہارمونوں کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں

اور ادویات کھلائی جاتی ہیں جو نہ صرف کھیل میں بے ایمانی ہوتی ہے بلکہ اس میں جانوروں کی تعذیب بھی ہے۔ ادخال محلل کو امام محمدؒ نے حیلہ ہی کہا ہے۔
قال محمد ادخال الثالث انما یکون حیلۃ الخ[1]۔ حیلہ بہر حال بری چیز ہے جو صرف جنگ میں ہی جائز ہوتی ہے۔
مزید غور فرمایا جائے کہ المنتقی من اخبار المصطفیٰ جو نیل الاوطار کی اصل ہے اس کی حدیث[2] نمبر ۴۴۹۸ میں حضور کے یہ الفاظ درج ہیں۔

وفرس یغالق فیہ الرجل ویراھن فثمنہ وزر وعلفہ وزر ورکوبہ وزر الخ۔

یعنی ایک گھوڑا شرطیں بدلنے کیلئے پالا جاتا ہے۔ اس کی قیمت بھی گناہ اس کا چارہ بھی گناہ اور اس پر سوار ہونا بھی گناہ ہے۔
اس سے اگلی حدیث یعنی نمبر ۴۴۹۹ میں حضورؐ کے الفاظ یوں ہیں۔
واما فرس الشیطٰن فالذی یقامر او یراھن علیہ الخ
یعنی شیطان کا گھوڑا وہ ہے جس کی مدد سے جوا کھیلا جائے یا جس پر شرطیں لگائی جائیں!؟
اس حدیث میں جوا کھیلنے کا ذکر کرنے کے بعد پھر شرط لگانے کا ذکر ہے یعنی اگر کسی گھوڑے پر جوا نہ بھی کھیلا جائے محض ایسی شرطیں لگائی جائیں جو قمار بازی کے ذیل میں نہ آتی ہوں وہ گھوڑا بھی شیطان کا گھوڑا ہوگا۔ درمیان میں "یا" کا لفظ بتاتا ہے کہ دونوں قسم کے گھوڑے شیطان کے گھوڑے ہوں گے۔
ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا احادیث میں جن گھوڑوں کیلئے "یراھن علیہ

---

[1] عمدۃ القاری: ۱۴ / ۱۶۱ [2] نیل الاوطار ۴۴۹۸

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کو جناب اقدس نے شیطان کے گھوڑے کہا ہے۔ پس "بیرا ھن" کے لفظ کی نسبت حضورؐ سے کرنا بڑی بے ادبی ہو گی۔ دراصل کسی صحیح حدیث میں ان الفاظ کی نسبت حضورؐ کی طرف آئی بھی نہیں ہے۔

پھر دیکھئے کہ یہ مسئلہ اور ہے کہ گھوڑے جہاد کے کیلئے پالے گئے ہوں اور جہاد کی تیاری کی نیت سے ان میں مسابقت کبھی کبھی کرائی جائے اور دوسری بات کہ گھوڑے سرے سے جہاد کے لئے ہی نہ ہوں نہ وہ فوج کے کسی یونٹ کا حصہ ہوں اور نہ ان کے سواروں کو جنگ کی تربیت ہو۔ بلکہ وہ گھوڑے صرف گھڑدوڑ ہی کے لئے پالے گئے ہوں۔ ان سے باربرداری کا کام بھی نہ لیا جائے۔ تو ایسے گھوڑے اگر محض کھیل تماشے کے لئے بھی ہوں تو وہ شیطان کے گھوڑے کہلائیں گے۔ کیونکہ لہو ولعب بھی شیطانی کام اور اسراف اور وقت کا ضیاع ہے۔ ریس کے گھوڑے صرف گیم آف چانس کے لئے ہیں۔ المنتقیٰ[1] من اخبار المصطفیٰ میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ کبوتر کے پیچھے لگا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ شیطان شیطان کے پیچھے لگا ہے۔

اگرچہ کبوتروں سے بھی قدیم دور میں بلکہ جنگ عظیم اول میں بھی خبر رسانی کا کام لیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے لئے زیادہ کبوتر درکار نہیں ہوتے تھے اس لئے کبوتر کے مسابقہ کی اجازت نہیں دی گئی اور اس کو شیطانی کام کہا گیا۔ گھوڑے کی عظیم اہمیت کے تحت ہی ان کی مسابقت کی اجازت دی گئی تھی۔ اور آج ان کا استعمال جہاد میں ترک ہو گیا۔ تو مسابقت کی اجازت بھی نہ رہی پھر "ساق اسلامی" کے صفحہ ۵ پر مندرجہ ذیل روایت بیان کی گئی ہے۔

---

[1] المنتقیٰ حدیث ۴۵۳۳

عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سابق بین الخیل وراہن۔ حوالہ مسند احمد کا دیا گیا ہے۔

بات یہ ہے مسند احمد میں اس حدیث کا نمبر ۵۳۴۸ ہے۔ یہ بہت مختصر ہے جیسا کہ اوپر حوالہ سے واضح ہے۔ اس کا پہلا راوی عتاب ہے۔ اس کے متعلق ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابوطالب امام احمد سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے آخر زمانے میں منکر روایت بیان کرنا شروع کر دی تھیں۔

جوزجانی کہتے ہیں امام احمد جو احادیث خصاف کی عتاب سے روایت کرتے ہیں وہ منکر ہیں۔

مزید وہ لکھتے ہیں کہ آجری ابوداؤد سے روایت کرتے ہیں کہ احمد فرماتے تھے کہ ابن مہدی نے اسے آخر میں ترک کر دیا تھا۔ اور امام ابوداؤد نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ امام احمد بھی اس کی روایت بیان کرنے سے رک گئے تھے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

وقال الآجری عن ابی داؤد سمعت احمد یقول ترکہ ابن مہدی بآخرہ ورأیت احمد کف عن حدیثہ[1]

بات یہ ہے کہ مسند احمد محض ایک مسودہ تھا جس میں امام احمد احادیث درج کرتے تھے اور ان کو اسکا موقع نہ مل سکا کہ اس پر نظر ثانی کریں۔ اس وجہ سے اس میں تھوڑی سی ناقابل اعتبار اور چند موضوع احادیث بھی رہ گئیں۔ بعد میں ان کے صاحبزادے وغیرہ نے اس میں کچھ اضافے کر کے اسے شائع کر دیا۔

ہم قارئین کی توجہ اس طرف دلانا چاہتے ہیں کہ یہی حدیث مفصل طور پر مسند احمد

---

[1] تہذیب التہذیب : ۷ : ۹۱

میں ابن عمرؓ کی روایت سے کئی جگہ اور بھی آتی ہے۔ مثلاً دیکھئے نمبر ۵۱۸۱، ۵۹۹۴، ۵۹۹۳، ۴۸۴۴ وغیرہ، لیکن باوجودیکہ دوسرے راویوں سے خود امام احمد نے زیادہ مفصل روایت کی ہیں۔ لیکن ان میں کہیں بھی لفظ "راہن" نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا لفظ ایسا ہے جس سے دو طرفہ شرط ثابت ہونا ممکن ہو۔ پس یا تو یہ ضعیف راوی کی غلطی ہے جو دانستہ کر دی گئی یا بے احتیاطی کی بنا پر یا شاید یک طرفہ شرط ہی کے لئے راہن کا لفظ استعمال کر دیا گیا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مسند احمد کی دوسری روایتوں کے راوی اس عتاب سے کہیں زیادہ بہتر ہیں انہوں نے یہ لفظ نہیں استعمال کیا۔ زیادتی صرف اس راوی کی مقبول ہو سکتی ہے جو زیادہ ثقہ ہو، نہ کہ متروک راوی کی۔ متروک راوی کی زیادتی نامقبول ہی ہوگی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابن عمرؓ سے ہی یہی روایت صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہے، لیکن صحاح کی کسی روایت میں بلکہ صحاح ستہ کی بھی کسی روایت میں "راہن" کا لفظ نہیں آیا۔ امام طحاوی نے بھی مشکل پر اسی حدیث کو ابن عمرؓ ہی سے روایت کیا ہے، اس میں بھی "راہن" کا لفظ موجود نہیں ہے بلکہ اسی پر وہ لکھتے ہیں کہ سبق یعنی دوڑ بغیر شرط کا ذکر صحاح کی کئی احادیث میں آیا ہے پھر وہ اس کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ ان میں کسی میں بھی سرے سے رہان کا لفظ ہی نہیں آیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

اب ہم اس روایت کی طرف آتے ہیں جو رئیس والوں نے مشکل الآثار جلد ۲ صفحہ ۳۲۶ سے پیش کی ہے۔ لیکن جو صحاح ستہ میں سے کسی بھی کتاب میں نہیں لی گئی کہ وہ اس قابل نہ تھی، اس میں حضرت انس کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ حضورؐ گھوڑوں پر شرط لگاتے تھے اور قول منسوب کرنے والا جو اولیس راوی ہے، یعنی ابوالولید اس پر علمائے رجال نے جرح کی ہے مشکل الآثار کی روایت حسب ذیل ہے:

"واحد لانعامه روی عنه صلی اللہ علیه وآله وسلم فی الرھان غیرہ وھو ما قد حدثنا سلیمان بن شعیب ثنا یحیی بن حسان ثنا سعید بن زید حدثنی الزبیر بن الخریت ثنا ابو الولید قال ارسلت الخیل فی زمن

لہ مشکل الآثار جلد ۲ صفحہ ۳۲۶۔

الحجاج ابن یوسف والحکم بن ایوب امیر علی البصرة فلما انصرفنا من الوھان (قلنا) وصلنا الی انس بن مالک فسألناہ ھل کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یراھن علی الخیل قال فسئل انس عن ذالک فقام نعم واللہ لقد راھن علی فرس لہ یقال لہ سبحہ فسبقت الناس فبھش (۱) لذلک واعجبہ۔

(قال ابوجعفر) وھذا من حدیث البصریین ایضاً وان کان سعید بن زید لیس بالقوی فی روایتہ عند اھل الاسناد؛ فاما السبق بغیر ذکر رھان کان"

س روایت کو نقل کرنے کے بعد خود طحاوی نے سب سے پہلی جو بات بتاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ب راوی سعید بن زید ماہرین اسناد کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ ہم اس رائے پر اضافہ کرتے یں کہ ابن المدینی فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے یحییٰ بن سعید سے سنا کہ وہ حدیث کے معاملہ میں ہت ہی زیادہ ضعیف تھا (یضعفہ جدا فی الحدیث) اس کے بعد آجری کا قول درج ہے کہ ام ابوداؤد کہا کرتے تھے یحییٰ بن سعید کہتے تھے کہ وہ کوئی چیز نہیں۔ مزید جوزجانی اس کی احادیث حجت نہیں مانتے تھے۔ ابوبکر البزاز نے کہا کہ اس کا حافظہ صحیح نہ تھا۔ دارقطنی نے اسے ضعیف ار دیا۔ [1]

اب ہم اختصار کی خاطر نیچے کے راویوں پر جرح نہیں کرتے اور صرف اوپر کے راویوں کو لیتے ہیں، ان سے اوپر کے راوی الزبیر بن خریت ہیں۔ ان کے متعلق ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ ن المدینی کہا کرتے تھے کہ مشہور امام شعبہ ان کی روایت نہ لیتے تھے اور ان کو ترک کر دیا تھا۔ ب ہم ان سے اوپر کے راوی کی طرف آتے ہیں جو بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت انسؓ سے خود سوال کیا تھا۔ ان کا نام

احمد بن عبدالرحمٰن ابوالولید البسری ہے۔ ان کے متعلق ذہبی میزان الاعتدال میں

---

[1] تہذیب التہذیب ۴: ۳۲، ۳۳۔

لکھتے ہیں:

روی عن الولید بن مسلم:

قال اسمٰعیل بن عبداللہ السکری القاضی ایضاً، لم یسمع ابوالولید عن الولید ابن مسلم شیئاً، ولو شہد عندی ما قبلتہ، وانما کان محللاً یحلل النساء، ویعطی الشئی فیطلق، وکان سئی الحال بدمشق، فاتقوا اللہ وایاکم والسماع من الکذابین، وبکار لم اجز شہادتہ قط، وھو الذی بعث الیہ الکتب، وھما جمیعا کذابین۔ لہ

وعبارۃ التھذیب اوضح وھی، وانما کان محللاً یحلل النساء للرجال ویعطی الشئی لیطلق ولو شہد عندی وانا قاص بمی سرین لم اجز شہادۃ (۱: ۵۳: ۵) ھکذا فی الاصل۔

یعنی ولید بن مسلم بھی یہی کہتے تھے کہ قاضی اسماعیل بن عبداللہ السکری نے بھی یہی بات کہی کہ ابوالولید نے ولید بن مسلم سے کچھ نہیں سنا۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ اگر وہ میری عدالت میں کوئی شہادت دے تو میں اسے قبول نہ کروں گا۔ دمشق میں اس کا حال خراب تھا۔ پس خدا سے ڈرو اور جھوٹوں کذابوں کی بات سننے سے بچتے رہو۔ ہرگز ان کی بات نہ سننا۔ اور بکار کے ہاں (جو اسی راوی کے دادا تھے) میزان الاعتدال کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں ——— کبھی ان کی بھی شہادت مقبول نہ ہوئی۔ اسی نے اس کے پاس کتاب بھیجی تھی۔ یہ دونوں دادا پوتا جھوٹے ہیں۔

اب ابن حجر کی بیان کردہ دوسری شہادت بھی اس راوی کے متعلق ملاحظہ فرمائیے:

وروی ابوبکر الباغندی عن اسمٰعیل بن عبداللہ السکری (۲)

قال لم یسمع ابوالولید البسری من الولید بن مسلم شیئاً ولم ارہ عندہ وقد قمت تسع سنین وکنت اعرفہ شبہ قاصٍ وانما کان

لہ دیکھئے میزان الاعتدال ؛ ۱۱۵ صفحہ جلد اوّل۔

محللا یحلل النساء للرجال ویعطی الشیء لیطلق ولو شهد عندی وانا قاض علی تمرتین لم اجز شهادته۔ ؎

یعنی ابو بکر الباغندی بھی اسماعیل بن عبداللہ السکری سے روایت کرتے ہیں کہ ابو الولید البسری نے ولید بن مسلم سے بھی کوئی حدیث نہیں سنی، اور نہ میں نے کبھی اس کو ان کے پاس دیکھا حالانکہ میں ۹ سال تک ابن مسلم کی خدمت میں رہا۔ اس راوی ابو الولید کو میں ایک قصہ گو کے طور پر خوب پہچانتا ہوں۔

اگر یہ میرے سامنے شہادت دے اور میں وہاں قاضی ہوں تو اس کی شہادت دو چھواروں پر بھی تسلیم کروں۔

اس راوی کا ذکر ذہبی نے اپنی کتاب جو خاص ضعیف راویوں کے متعلق لکھی ہے اس میں بھی اس کا نام درج کیا ہے۔ اس کتاب کے حاشیہ میں ڈاکٹر نورالدین عتر جنہوں نے جامعہ الازہر سے حدیث میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور جامعہ دمشق میں حدیث کے پروفیسر ہیں۔ لکھتے ہیں کہ خطیب نے جو ان کی توصیف کی ہے وہ باور کرنی مشکل ہے۔ کیونکہ جرح مفسر ہے اور جب جرح مفسر ہو تو وہ تعدیل پر مقدم ہوتی ہے۔ یعنی انھوں نے بھی اس راوی کو نا قابل اعتبار قرار دے دیا ہے۔ ان کے خاص الفاظ ملاحظہ ہوں:

انه مستشکل لان الجرح فیه مفسر وهو مقدم علی التعدیل۔ ؎

ایسی کمزور اسناد کی روایت سے جو صحاح ستہ کے کسی بھی محدث نے روایت نہ کی ہو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسے ہادی پر شرط لگانے کا الزام شرمناک ہے۔

امام مالک کی ساری عمر مدینے میں گزری اور افریقہ و اسپین وغیرہ میں ان کا مذہب رائج تھا اور وہ یکطرفہ شرط کو بھی قمار کہتے تھے حوالہ گذر چکا ہے اور عینی اور مغنی دونوں نے لکھا ہے کہ محلل کے بھی وہ مخالف تھے۔ پس منقطع روایتوں سے دو طرفہ شرط ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔

؎ دیکھئے تہذیب التہذیب: ۱: ۵۳۔

؎ المغنی فی الضعفاء: ۱: ۵۴ مطبوعہ حلب۔ ۱۹۷۱

خاکسار کو کتابچہ دسباق اسلامی چند روز قبل ہی دیکھنے کو ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انکی ہر دلیل کو کاٹا جا سکتا ہے۔ وقت کم تھا اس لئے خاکسار نے ان کی بیان کردہ سب اہم روایات جو حضورؐ کیطرف منسوب کی جاتی ہیں ان کو بھی رد کر دیا ہے اور ثابت کر دیا کہ یہ ہر گز حضورؐ کا قول نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ محلل یا دطلاق بشرط کسی صورت میں بھی قرآن و سنت سے ثابت نہیں۔

شریعت مشکوک چیزوں سے بھی پرہیز کا حکم دیتی ہے

حضرت عمرؓ کا قول مشہور ہے کہ آخر ما نزلت آیۃ الربا فدعوا الربا والریبۃ یعنی سود اور جس چیز میں سود کا شبہ بھی ہو دونوں کو چھوڑ دو۔

احتیاط کی بنا پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کا ذکر کیا کہ ان کا تبادلہ مساوی یا نہ وزن پر کرو۔ جو زیادہ لے گا یا دے گا اس نے سود لیا اور دیا یعنی (Barter) میں یہ نہیں کیا جا سکتا کہ اچھی کھجوریں ایک سیر لی جائیں اور بدلہ میں گھٹیا کھجوریں سوا سیر دی جائیں یہ سود ہو گا Barter میں جو کچھ اشیاء اس زمانہ میں استعمال ہوتی تھیں آپ نے ان کے نام بھی گنوا دیئے۔ یعنی سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور، نمک۔

یعنی ایک سیر گیہوں دے کر آدھا سیر کھجوریں تو لی جا سکتی ہیں۔ لیکن سوا سیر گھٹیا کھجوریں دے کر ایک سیر بڑھیا کھجور نہیں لی جا سکتی۔ اس پر اجماع ہے۔ پس اسی احتیاط اور سد ذرائع کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ آج ہر قسم کی گھڑ دوڑ، ریفل، اور معمّے بازی اور سیل بڑھانے کے لئے چانس پر انعامات کی تقسیم بالکل خلافِ قانون قرار دی جانی چاہیئے۔ یہی شریعت کا منشا ہے۔

قابل حجت حدیث کا معیار

ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ لکھتے ہیں۔ والمرسل والمنقطع من الاخبار لا یقوم بہا حجۃ

لان اللہ جل وعلا لم یکلف عبادہ اخذ الدین عمن لا یعرف والمرسل والمنقطع لیس یخلو ممن لا یعرف وانما یلزم العباد قبول الدین الذی هو من جنس الاخبار اذا کان من روایۃ العدول حتی یرویہ عدل عن عدل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موصولاً۔ [1]

---

[1] دیکھئے کتاب المجروحین۔ ص ۱۲۔ ج دوئم۔

یعنی کوئی خبر یا روایت جس کی سند منقطع ہو یا وہ مرسل ہو (یعنی تابعی بیان کرے اور صحابی کا نام نہ لے) تو ایسی روایت سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ دین کی بات ان لوگوں سے لیں جن کو جانتے نہ ہوں، یعنی جو صداقت اور تقویٰ میں معروف نہ ہوں اور مرسل یا منقطع روایت میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو معروف نہیں ہوتے یعنی مجہول ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لازم یہ بات کی ہے کہ وہ صرف ان احادیث کو قبول کریں، جبکہ ایک راوی تمام عادل ہوں یعنی ایک عادل راوی سے بغیر انقطاع روایت کرتا چلا جائے، حتیٰ کہ سند حضورؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچ جائے۔ [1]

پس محلل کی روایت ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اس کی سند ہی حضورؐ تک نہیں پہنچتی، اور اس پر امام مالک کا بھی عمل نہیں۔ پس اس سے دین کے معاملے میں دلیل نہیں لی جا سکتی ہمارے لئے ضروری ہے کہ جس میں قمار بازی کا شبہ بھی ہو اس سے بھی پرہیز کریں جبکہ جدید گھوڑدوڑ کو یقینی قمار بازی ہے جو بہت ہی تباہ کن ہے۔

ایسے اجتماع پر جہاں گناہ کا امکان بھی ہو سزا دی جاتی ہے۔ تعزیر ضرور دی جاتی ہے، چاہے حد نہ قائم کی جائے۔ پس ریس پر پابندی عین شرعی احکام پر عمل ہے۔

ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ خلفائے راشدین کے دور میں ایک عورت اور مرد جو منکوحہ نہ تھے۔ جب لحاف میں پائے گئے تو صرف اسی بات پر ان کو سو کوڑے لگائے گئے۔ حالانکہ زنا کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ اصل الفاظ یوں ہے:

وروی عن الخلفاء راشدین، فی رجل وامراۃ وجدا فی لحاف۔ یضربان مائۃ "وروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الذی یاتی جاریۃ امراتہ ان کانت اخلتھا لہ۔ جلد مائۃ وان لم تکن اخلتھا لہ رجم" وھذہ الاقوال فی مذھب احمد وغیرہ والعتر لان

---

[1] کتاب المجروحین: ۲: ۲۔

الاولات فی مذهب الشافی وغیرہ۔ لہ

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۴۰ پر یوں درج ہے:

وکذلک محاباۃ الولاۃ فی المعاملۃ من المبایعۃ والمؤاجرۃ والمضاربۃ، والمساقاۃ والمزارعۃ، ونحوذالک، من الھدیۃ، و لھذا شاطر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، من عمالہ من کان لہ فضل ودین لایتھم بخیانتہ، وانما شاطرھم لما کانوا خصوا بہ لاجل الولایۃ من محاباۃ وغیرھا وکان الامر یقتضی ذالک لانہ کان امام عدل یقسم بالسویۃ۔

یعنی سرکاری افسروں کو کاروبار۔ مضاربت مضاربت وغیرہ اور تحائف لینے سے منع کرنے کا معاملہ ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے بعض گورنروں سے ان کا آدھا مال لے لیا تھا۔ حالانکہ وہ نیک لوگ تھے اور ان پر خیانت کا الزام نہ تھا۔

مزید ابن تیمیہ برائیوں کو جڑ سے ختم کرنے اور برائی کے امکانات بھی ختم کرنے اور سدذریعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نامحرم مرد عورت اکیلے ہوں تو ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ مزید حضورؐ نے فرمایا کہ کسی مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ بغیر محرم کے دو دن کا سفر اکیلے کرے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اجنبی عورت سے خلوت اور ساتھ سفر کرنے سے جو منع کیا وہ سدذریعہ کی وجہ سے کیا۔ جب عبدالقیس کا وفد آیا تو ان میں ایک خوبصورت لڑکا بھی تھا، آپ نے اسے اپنی پیٹھ پیچھے بٹھایا اور فرمایا کہ حضرت داؤد کی خطا ان کی نظر ہی تھی۔

حضرت عمرؓ کو اطلاع پہونچی کہ ایک شخص ہے جس کے پاس کم عمر لڑکے بیٹھتے ہیں۔ آپ نے ان کو اس کے پاس بیٹھنے سے منع کر دیا۔ اسی طرح اگر ایسے لڑکے ہوں جو کہ مردوں یا عورتوں کے لئے فتنہ بن سکتے ہوں۔ یعنی ان کے حسن وغیرہ کی وجہ سے تو ایسے لڑکے کے ولی کو کہا جائے گا کہ وہ اسے بغیر

لہ السیاسۃ الشرعیۃ: ص ۹۸: مطبوعہ بیروت۔

ضرورت عام طور سے بازاروں نہ لے جائے، حماموں یا گانے کی مجلس میں جانے سے بھی اسے منع کر دیا جائے گا۔ اگر وہ اس روک تھام پر عمل نہ کرے گا تو اسے تعذیر دی جائے گی۔

اب ابن تیمیہ کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

وکذالک الشر و المعصیة، ینبغی حسم مادته و سد ذریعته و دفع ما یفضی الیه، اذا لم یکن فیه مصلحة راجحة، مثال ذالک، ما نهی عنه النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: لا یخلون الرجل بامرأة فان ثالثهما الشیطان ۰ وقال: "لایحل لامرأة تؤمن باللّٰه والیوم الاخر ان تسافر مسیرة یومین الا و معها زوج او ذو محرم" فنهی صلی اللّٰه علیه وسلم عن الخلوة بالاجنبیة، والسفر بها لانه ذریعة الی الشر. وروی عن الشعبی، ان وفد عبد القیس لما قدموا علی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، کان فیهم غلام ظاهر الوضاءة فاجلسه خلف ظهره وقال: انما کانت خطیئة داؤد النظر"

وروی عمر: انه بلغه ان رجلا یجلس الیه الصبیان عن مجالسة. فاذا کان عن الصبیان من تخاف فتنة علی الرجال، او علی النساء، منع ولیه من اظهار لغیر حاجة، او تحسینه، لاسیما بترییحه و تجریده فی الحمامات، واحضاره مجالس اللهو والاغانی فان هذا مما ینبغی التعزیر علیه۔

سرخسی نے المبسوط میں جو تعذیر کا باب باندھا ہے، اس میں واضح طور پر درج ہے اگر کچھ لوگوں کے پاس شراب پینے کا سامان پایا جائے تو ان کو حد نہیں لگائی جائے گی، البتہ تعذیر دی جائے گی۔ اسی وجہ سے اس بات کو اس باب میں بیان کیا ہے۔ مکمل بیان ملاحظہ ہو:

قلت والرجل یوجد فی بیته الخمر بالکوفة وهو فاسق او یوجد القوم مجتمعین علیها ولم یرهم احد یشربونها غیر انهم جلسوا

مجلس من يشربها ھل يمضرون قال نعم لان الظاهر ان الفاسق يقصد القمر للشرب وان القوم يجتمعون عليها لارادة الشرب ولكن بمجرد الظاهر لا يتقرر السبب على وجه لا شبهة فيه فلا يمكن اقامة الحد عليهم والتعزير مما يثبت مع الشبهات فلهذا يعزرون۔

اب تک کے بیانات سے اس پر اتفاق ثابت ہو چکا ہے کہ دو طرفہ شرط بغیر محلل کے کسی کے نزدیک جائز نہیں۔ لیکن جن فقہا نے محلل کے طریق پر مسابقت کی اجازت دی۔ وہ بھی کوئی آزادانہ مسابقت نہ تھی۔ اس میں صرف دو گھوڑے سوار انعام کی رقم رکھتے تھے، اور تیسرا محلل کوئی رقم نہ رکھتا تھا۔ اور بس محدود طور پر ان تین ہی میں سے کوئی انعام کا مستحق ہوتا تھا یا ہر کا آدمی اس انعام میں شریک نہ ہوتا تھا۔ محلل کی بھی خاص محدود شرائط ہوتی تھیں، جو بقول عبدالرحمن مبارکپوری اور ملّا علی قاری حسب ذیل ہیں۔ یہ شرائط بہت تنگ اور محدود ہیں۔ جن میں باہر کے تماشائی کی شرکت کا کسی طرح بھی جواز نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ نہ کبھی ایسا ہوا ہے:

فبالمحلل يخرج العقد عن ان يكون قمارا، لان القمار يكون الرجل مترددا بين الغنم والغرم فاذا دخل بينهما لم يوجد فيه هذا المعنى ثم اذا جاء المحلل اولا ثم جاء المستبقان معًا او احدهما بعد الاخر اخذ المحلل السبقين، وان جاء المستبقان معا ثم المحلل فلا شئ لاحد، وان جاء احد المستبقين اولا ثم المحلل والمستبق الثاني اما معا او احدهما بعد الاخر احرز السابق سبقه واخذ سبق المستبق الثاني، وان جاء المحلل واحد المستبقين معًا ثم جاء الثاني مصليا اخذ السابقان سبقه كذا في المرقاة۔ [1]

---

[1] تحفۃ الاحوذی: ۵ : ۱۵۱۔

یعنی محلل کے ذریعے سے معاملہ میں سے قمار کا پہلو خارج کر دیا جاتا تھا کیونکہ قمار میں آدمی نفع یا نقصان میں متردد رہتا ہے۔ جب محلل داخل ہو جاتا ہے تو یہ تردد ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں سے تردد یوں ختم ہوتا ہے کہ اگر محلل اوّل آجائے اور انعام کی رقم رکھنے والے دونوں اس کے پیچھے برابر برابر آئیں یا ان میں سے ایک آگے آئے اور ایک پیچھے آئے۔ ان دونوں صورتوں میں محلل کو دونوں کی مقرر کردہ انعامی رقوم مل جائے گی۔

اور اگر دونوں انعام کی رقم رکھنے والے اکٹھے اوّل درجہ میں آجائیں اور محلل ان کے پیچھے رہ جائے تو انعام کوئی بھی حاصل نہ کرے گا یعنی کسی کو بھی کچھ نہ ملے گا نہ کسی کو کچھ دینا پڑے گا۔

تیسری صورت یوں بھی ہو سکتی ہے کہ ایک انعامی رقم مقرر کرنے والا اوّل آجائے، اسکے بعد محلل اور دوسرا انعام مقرر کرنے والا آجائے۔ چاہے دو تم نمبر پر دونوں اکٹھے آئیں یا ایک دوسرے نمبر پر آئے اور ایک تیسرے نمبر پر آئے، دونوں حالتوں میں اوّل آنے والا شخص اپنی انعامی رقم بھی بچالے گا اور دوسرے کی انعامی رقم بھی حاصل کرے گا۔

آخری صورت یوں ہو سکتی ہے کہ محلل اور انعام رکھنے والا دونوں اکٹھے اوّل نمبر آجائیں۔ ان دونوں کے پیچھے تیسرا آجائے۔ ایسی صورت میں پیچھے رہ جانے والے کا انعام دونوں اوّل آنے والوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

مرقاۃ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ گھڑدوڑ میں صرف دو گھوڑے حصّہ لیں گے اور تیسرا گھوڑا محلل ہوگا۔ چوتھا کوئی نہ ہوگا۔ پھر معاملہ کا فیصلہ سختی کے ساتھ مذکورہ بالا طریقہ پر ہوگا۔ اور مالی منفعت اگر کسی کو ہوگی تو ان تینوں میں سے ایک کو ہوگی یا دو کو ہوگی۔ باہر کے کسی آدمی کو نہ مالی منفعت پہونچ سکتی ہے اور نہ نقصان پہونچ سکتا ہے اور نہ باہر کا کوئی چوتھا آدمی اس میں کسی طرح سے کوئی حصّہ لے سکتا ہے۔ (باقی)

خطبۂ نکاح

(ایک اہم معاشرتی ہدایت)

نکاح کے موقع پر عام طور پر جو خطبہ دیا جاتا ہے اس کے بیشتر حصے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں اس میں ضرورت اور حالات کے لحاظ سے علماء اضافہ کرتے رہے ہیں اور آیندہ بھی کرتے رہیں گے، مگر اس موقع پر آپ کی زبان مبارک سے جو الفاظ اور جملے ادا ہوئے ہیں یا جو آیات قرآنی آپ نے تلاوت فرمائی ہیں وہ خود اتنی جامع، مؤثر اور مفید ہیں کہ اگر ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو اس سے نہ صرف ہر شادی خانہ آبادی بن جائے گی بلکہ اس سے ہمارا معاشرہ جنت کا ایک نمونہ بن جائے گا۔

عام طور پر نکاح پڑھانے والے حضرات خطبہ کے ان الفاظ کو رسمی طور پر دہراتے ہیں جس سے اس کی پوری معنویت نہ تو لڑکے اور لڑکی کے ذہن نشین ہو پاتی ہے اور نہ عام لوگوں کے سامنے اس کی پوری اہمیت آپاتی ہے۔ راقم الحروف کو جب بھی نکاح پڑھانے کا موقع ملتا ہے تو خطبۂ نکاح کی مختصر تشریح بھی ضرور کر دیتا ہے، اسی مختصر تشریح کو مزید اضافے کے ساتھ افادۂ عام کے خیال سے کاغذ پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے قبول فرمائے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے اس وقت معاشرہ کے افراد کے سامنے ان باتوں کی وضاحت کی شدید ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کے لئے مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ پورا خطبہ یہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ	تمام تعریفیں خدائے قدوس کے لئے ہیں، ہم بھی اسی کی حمد اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اسی سے مدد

سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا
مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ
نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ
لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

چاہتے ہیں اور نفس اور شیطان کے دھوکہ فریب اور اپنے
اعمال کی برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں جس کو وہ
ہدایت دیتا ہے، اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو
اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیتا ہے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں
ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ اکیلا مالک اور معبود ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔

اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک
جان (حضرت آدم) سے پیدا کیا اور پھر ان کے جنس سے
ان کا جوڑا (حضرت حوّا) کو پیدا کیا اور پھر ان دونوں سے
بے شمار مردوں اور عورتوں کو پیدا کیا اور اس اللہ سے
ڈرو جس کا نام لے کر اور واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے
سوال کرتے ہو اور اپنا حق مانگتے ہو اور اسی طرح رشتوں کے
معاملے میں بھی ڈرتے رہو، اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

❊ ❊

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ
تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ ڈرنے کا حق
ہے، اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم
مسلمان رہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا
قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور زبان سے
درست بات نکالو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے
سارے اعمال درست فرما دے گا اور تمہاری مغفرت
فرما دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
کرے گا وہ بڑی کامیابی پائے گا۔

❊ ❊

۱؎ حدیث کی مختلف کتابوں میں یہ خطبہ نقل ہوا ہے۔

امام دارمی نے ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "ثم یتکلم بحاجتہ" یعنی ان آیات کی تلاوت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حاجت وضرورت کی بات بیان فرماتے تھے گویا اس موقع پر ضرورت کے لحاظ سے مزید کچھ باتیں کہنی سنت کے مطابق ہے۔ غالباً اسی سنتِ نبوی کے پیشِ نظر علماء، حالات وضرورت کے لحاظ سے خطبۂ نکاح میں مزید اضافہ وترمیم کرتے رہے ہیں، اس لئے یہاں دو تین حدیثیں خطبہ کا جز سمجھ کر نقل کیجا رہی ہیں۔

عن عائشۃؓ قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے، جو اس سے روگردانی کریگا وہ میرا امتی نہیں ہے۔

(بیہقی و ابن ماجہ)

وعن عائشۃؓ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اعظم النکاح برکۃ الیسرہ مئونتہ (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

انہی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جس میں کم سے کم تکلیف اور بوجھ ہو۔

عن ابی ھریرۃ تنکح المرأۃ لاربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدینها فاظفر بذات الدین تربت یداك۔

(بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ عورت سے نسبت یا رشتہ چار چیزوں کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ خاندان، حسن وجمال اور مال اور دین واخلاق، تو تم دیندار سے شادی کر کے کامیابی حاصل کرو، اگر ایسا نہیں کرتے تو تمہاری خرابی ہو۔

خطبۂ نکاح میں سب سے پہلی بات جو ذہن نشین کرائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک اچھا معاشرہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک اچھا خاندان وجود میں آئے اور ہر نکاح کے ذریعہ ایک نیا خاندان وجود میں آتا ہے، اس لئے اس موقع پر ان اخلاقی احکام کی یاد دہانی ضروری ہے جن کے ذریعہ ایک صالح خاندان کی تشکیل ہوتی ہے۔

---

[1] یہ دو حدیثوں کے دو جملوں سے پوری حدیث ماخوذ ہے کسی ایک حدیث میں مکمل یہ الفاظ راقم الحروف کو نہیں ملے۔

شادی بیاہ ایک خوشی اور مسرت کا موقع ہوتا ہے۔ ایک نوجوان جوڑے کو اس پُرکشش زندگی کے آغاز سے جو خوشی ہوتی ہے، وہ تو ایک فطری چیز ہے، مگر ان کے ساتھ ماں، باپ، بھائی، بہن اور خاندان کے لوگوں کو ایک ذمہ داری کا بوجھ ہلکا ہو جانے سے جو خوشی ہوتی ہے، اسے ہر باپ، ماں، بھائی، بہن ہی نہیں بلکہ خاندان کا ہر فرد محسوس کرتا ہے۔ پھر غور کیجئے تو اس خوشی اور مسرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع نظر آئے گا، ہر رشتۂ نکاح سے ایک نیا اسلامی خاندان وجود میں آتا ہے، اس لئے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس نئے خاندان کے وجود میں آنے کی مسرت میں معاشرہ کا ہر فرد شریک ہوتا ہے یا اسے شریک ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے پُرکشش اور پُر مسرت موقع پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے اس کی زبان سے خدا کی حمد و ثنا اور دل کے اندر جذبۂ شکر پیدا ہونا چاہیئے۔ حدیث میں آتا ہے جو مسلمان کوئی کام خدا کا نام لئے بغیر کرتا ہے وہ ناقص رہتا ہے۔ اس لئے اس خوشی اور مسرت کو اور زیادہ پُر مسرت و با برکت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ابتداء خدا کی حمد و ثنا اور جذبۂ شکر سے کی جائے اسی لئے خطبہ شروع ہوتا ہے، الحمدللہ نحمدہٗ سے یہ حمد و ثنا اس حیثیت سے بھی ضروری ہے کہ بیاہ شادی بظاہر تو ایک نفسانی فعل ہے، مگر اس سے ایک نئے اسلامی خاندان کی ابتداء ہوتی ہے، اور اگر ثواب کی نیت سے اس رشتہ کا پورا حق ادا کیا جائے تو یہ ایک عبادت بھی ہے، اور یہ ایک ایسا رشتۂ عبادت ہے جو انسان کے ساتھ جنت تک چلا جاتا ہے۔

شیخ ابن عابدین لکھتے ہیں:

لَیْسَ لَنَا عِبَادَةٌ شُرِعَتْ مِنْ عَہْدِ اٰدَمَ اِلَی الْاٰنَ ثُمَّ تَسْتَمِرُّ اِلَی الْجَنَّةِ اِلَّا النِّکَاحَ وَالْاِیْمَانَ [1]	حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے اب تک کوئی ایسی عبادت نہیں ہے جو جنت تک ساتھ چلی جاتی ہو سوائے نکاح اور ایمان کے۔

پھر لکھتے ہیں:

اِنَّ الْاِشْتِغَالَ بِهٖ اَفْضَلُ مِنَ التَّخَلِّیْ	نکاح کے بعد کی ذمہ داریوں میں مشغول رہنا خلوت میں

---

[1] ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۲۵۸ مطبوعہ مصر۔

لِنَوَافِلِ الْعِبَادَةِ (ردالمحتار ج ۲ ص۲۹۹)۔ نفل ادا کرنے سے زیادہ افضل ہے۔

اور اسی جذبۂ تشکر اور تصورِ عبادت کا ایک رسمی مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ نکاح سے پہلے لوگ لڑکے کو مسجد میں لے جاتے ہیں اور وہاں دو رکعت نماز پڑھواتے یا کم از کم سجدہ کرواتے ہیں۔ یہ مظاہرہ بھی بسا غنیمت ہے۔ اس موقع پر لڑکی کو بھی وضو کرا کے دو رکعت نماز پڑھوا لیا کریں تو اور مناسب ہے تاکہ دونوں کے ذہن میں یہ تصور تازہ ہو جایا کرے۔

پھر ایک مسلمان کو ہر کام کے وقت دو اور باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ محض اپنی دولت اپنی قوت اور خاندان کے بل بوتے پر کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچایا جا سکتا بلکہ کوئی کام پایۂ تکمیل کو اسی وقت پہونچ سکتا ہے، جب خدا تعالیٰ کی مدد بھی اس کے شاملِ حال ہو جاتے۔ اسی لئے خطبہ میں نحمدہٗ کے ساتھ نستعینہ ونستغفرہٗ "اے اللہ ہم تیری مدد چاہتے ہیں اور (اگر کوئی غلطی ہو جائے تو) تجھ سے مغفرت چاہتے ہیں" بھی پڑھا جاتا ہے۔ پھر ہر کام کے وقت ایک مسلمان کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہئے کہ آدمی ایک نیک اور صالح کام کی طرف قدم اٹھاتا ہے مگر شیطان اور خود انسان کا نفس کچھ ایسی صورتیں پیدا کر دیتا ہے یا گھر والوں و برادری اور خاندان کے دباؤ سے کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ صحیح کام میں بھی بہت سی ناجائز باتیں اور غلطیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر خوشی اور مسرّت کے وقت ایسی بے اعتدالیاں بہت زیادہ ہو جاتی ہیں، اس موقع پر ہم بے شمار ناجائز رسم و رواج کی پابندی جتنی ضروری سمجھتے ہیں اتنی شریعت کے کسی حکم کی بھی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہم خوشی اور مسرّت میں بے شمار شرعی احکام کی بے حرمتی کر ڈالتے ہیں۔ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ "شادی بیاہ کے وقت ہم برادری اور خاندان کے ہر فرد کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے پونی پرجا اور دھوبی و بھنگی کو بھی خوش کرتے ہیں، مگر ہم خدا اور اس کے رسول کو خوش کرنے کے بجائے ناخوش کر لیتے ہیں"۔ ہم شادی کے انتظامات میں دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر لیتے ہیں، مگر ایک وقت کی نماز پڑھنے کی توفیق ہم کو نہیں ہوتی۔ اس لئے اس موقع پر خدا کی مدد اور اپنے چھپے ہوئے دشمن یعنی نفس و شیطان سے خدا کی پناہ بھی مانگ لینی ضروری ہے تاکہ آدمی صحیح راستہ چھوڑ کر کسی غلط راستہ پر جانے سے بچ جائے، اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اسے خدا سے معافی مانگنی چاہئے

اور توبہ کرنا چاہیے، اسی لئے نستعینہ اور نستغفرہ کے بعد خطبہ میں مسلسل کئی جملے نفس اور شیطان سے پناہ کے لئے پڑھے جاتے ہیں۔

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔

ہم پناہ چاہتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا ہے اور جس کو گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

خطبہ کے یہ الفاظ ایک مومن کی اسی ضرورت اور احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس روزانہ اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور اپنے ہرکاروں کو انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے، تو جتنا زیادہ گمراہ کن کام کرکے آتا ہے اتنا ہی وہ اس کو اپنے قریب کرتا ہے اور شاباشی دیتا ہے شام کے وقت ایک ایک شیطان واپس آتا ہے اور اپنی کارستانی اسے بتاتا ہے کہ میں نے ایسا کیا، ویسا کیا، وہ ان کی رپورٹ سن کر کہتا ہے "مَا صَنَعْتَ شَیْئًا" (تم نے کچھ نہیں کیا) پھر ایک شیطان آتا ہے کہتا ہے کہ میں نے پوری کوشش کرکے ایک میاں بیوی میں اختلاف پیدا کر دیا اور ان میں علیحدگی کرا دی، وہ اس کو چمٹا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "نعم انت" (شاباش تم نے یہ کام کیا) شیطان کی خوشی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے محض دو میاں بیوی کے تعلقات خراب نہیں کئے۔ بلکہ اس کے ذریعہ اس نے کتنی خاندانوں کے تعلقات بگاڑ دیئے اور ظاہر ہے جب خاندان کے تعلقات بگڑیں گے تو معاشرہ لامحالہ اس سے متاثر ہوگا، اس طرح شیطان بہت سی شادی کو خانہ آبادی کے بجائے خانہ بربادی بنا دیتا ہے، اس اختلاف کی وجہ سے نہ جانے کتنے مقدمے، جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بسا اوقات قتل اور خونریزی کی نوبت آجاتی ہے۔ اس لئے ہر نکاح کے موقع پر مسلمان معاشرہ کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مسلمان کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس سے شیطان کا داؤں ان پر چل جائے، اور وہ پورے معاشرہ کو بگاڑ کر رکھ دے اور پھر اس کے ساتھ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی اور ان کی اطاعت و فرماں برداری کے اقرار کو بھی دہرایا جاتا ہے تاکہ ہمارے ذہن سے یہ بات اوجھل نہ ہونے پائے کہ چاہے غم کا موقع ہو یا خوشی کا ایک مسلمان کا ہر کام اسی توحید و رسالت کے گرد گھومنا چاہیے۔ یہی ایک سہارا ہے جس کے ذریعے ہم نفس اور شیطان کے فریب سے

ایک طرف اس کے سامنے پچھلی مخلصانہ محبتیں ہیں اور دوسری طرف یہ ایک نیا نفسیاتی رشتۂ محبت قائم ہو رہا ہے۔ اس موقع پر خدا کا خوف یاد دلا کر یہ بات ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ اس نئے انسانی رشتۂ محبت میں ایک نوجوان جوڑا اتنا نہ کھو جائے کہ وہ دوسرے رشتوں اور محبتوں کی حق تلفی کر بیٹھے یا ان پر خلوص محبت کرنے والے ماں باپ یا دوسرے رشتہ داروں کے دل کو اس کے کسی طرز عمل سے ٹھیس پہنچ جائے اور ان کے جذباتِ محبت مجروح ہو جائے۔

ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ شادی کے بعد لڑکیاں اور لڑکے اس "رشتۂ نفسانی" میں بسا اوقات اتنا کھو جاتے ہیں کہ نہ صرف پرانے رشتے اور ناطے کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ ماں کی بے غرض مامتا اور باپ کے پر خلوص پیار کو بھی پامال کر ڈالتے ہیں، اور ان کو بالکل بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں، اس انتہا پسندی کے نتیجہ میں خاندان کی وہ آپسی مخلصانہ محبت و الفت ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ دکھائی دینے کے بجائے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو پورے خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے، اس "جنونِ محبت" میں اگر کوئی چیز اعتدال پیدا کر سکتی ہے تو وہ صرف خدا کا ڈر اور معاشرہ کا اخلاقی دباؤ ہی ہے[1]۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے خوف کے ساتھ ساتھ رشتوں کے بارے میں بھی ڈرتے رہنے اور احتیاط برتنے کی تاکید فرمائی ہے یعنی جس طرح خدا تعالیٰ کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس سے خوف نہ کھایا جائے، اسی طرح رشتۂ قرابت کا حق آدمی اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس نئی زندگی میں خوفِ خدا کے ساتھ محتاط طرز عمل اختیار نہ کرے، خطبہ کی اس آیت "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ" (ڈرو اللہ سے جس کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتۂ قرابت کے بارے میں بھی محتاط طرز عمل اختیار کرو) کا یہی مفہوم ہے، خدا سے تقویٰ اختیار کرنے اور ڈرنے کا حکم جس طرح لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ہے، اسی طرح ماں باپ اور گھر والوں کے لئے بھی ہے، جس طرح ایک نوجوان جوڑا اپنی نفسانی انتہا پسندی کی وجہ سے خاندان کی محبت کو پامال کر ڈالتا ہے، اسی طرح بسا اوقات خود والدین ایک نوجوان جوڑے

---

[1] اسلامی فقہ میں ایسی صورتیں بھی موجود ہیں جن کی بنا پر ماں باپ کے حق کی ادائیگی پر لڑکے کو مجبور کیا جا سکتا ہے مگر یہاں بحث اخلاقی حیثیت سے ہے قانونی حیثیت سے نہیں۔

بچ سکتے ہیں، پھر خدا اور اس کے رسول کی شہادت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ خدا اور اسکے رسول کی طرف سے اس رشتۂ نکاح کے سلسلہ میں حقوق وفرائض کی جو ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں، انھیں پورا کرنا ضروری ہے، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہماری شہادت جھوٹی شہادت ہوگی۔

حمد وثنا اور تعوذ کے ان ابتدائی الفاظ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ میں قرآن کی تین آیتیں تلاوت فرماتے تھے، ان تینوں میں پہلی بات جو بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو، اور اس سے تقویٰ اختیار کرو، تقویٰ نام ہے "ڈرنے اور بچنے" کا، یعنی زندگی کے ہر معاملہ میں آدمی خدا سے ڈر کر محتاط طرزِ عمل اختیار کرے اسی کا نام ہے تقویٰ، اس کو ایک صحابی نے حضرت عمرؓ کے سوال کے جواب میں ایک مثال سے سمجھایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ آپ کسی کانٹے دار راستے یا جھاڑی سے گذر رہے ہیں؟ فرمایا ہاں، انھوں نے کہا کہ اس موقع پر کیا کرتے ہیں؟ فرمایا کہ یا راستہ ہی کاٹ دیتے ہیں یا پھر دامن سمیٹ کر نکل جاتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ بس اسی کا نام تقویٰ ہے کہ ایک مسلمان زندگی میں برائیوں کی جھاڑی سے دامن بچا کر نکل جائے اور جس کام میں شبہ بھی ہو جائے اسے ترک کر دے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اس کی مزید وضاحت فرمائی ہے:

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المتقین فقال لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالا باس بہ حذرا لما بہ باس۔	آپ سے متقیوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کوئی بندہ اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان چیزوں کو جن میں کوئی حرج اور گناہ نہیں ہے۔ اس خوف سے نہ چھوڑ دے کہ ممکن ہے کہ کوئی حرج اور گناہ ہو۔

شادی بیاہ یا رشتۂ نکاح خوشی اور مسرت کے ساتھ ایک خالص نفسانی فعل کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہ آدمی کی زندگی کا سب سے نازک مرحلہ ہوتا ہے، ایک طرف ایک نوجوان جوڑا جو آج سے پہلے ماں، باپ، بھائی، بہن، خالہ، ماموں، نانا، نانی، دادا، دادی کی محبتوں کے درمیان پلا بڑھا ہوا اور جن کی محبتوں میں بے غرض پیار و محبت اور خلوص کے علاوہ کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ رہی ہو، وہ آج ایک ایسے رشتۂ محبت میں بندھ رہا ہے جس کا سرا محبت کے ساتھ خواہش نفس کی تسکین سے بھی جڑا ہوا ہے، خواہش نفس انسان کا سب سے کمزور پہلو ہے، اس میں اعتدال باقی رکھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے، اب

کی اس نئی محبت، نئے جذبات اور اس کی ان نئی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے، جو اس پر اس رشتہ کی وجہ سے عائد ہوتی ہیں، چنانچہ جب یہ جوڑا اس نئے حق کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس نئے حق کی ادائیگی کو وہ اپنی فرضی حق تلفی تصور کرنے لگتے ہیں، یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ میاں بیوی اپنے بال بچوں کے حق کی ادائیگی براہ راست نہ کریں بلکہ ان کے واسطہ سے کریں مگر ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے پہلے آپ کا بچہ صرف ایک ہی مخلصانہ محبت سے واقف تھا، اب آپ نے خود اپنی مرضی اپنی پسند اور انتہائی قلبی خوشی کے ساتھ اسے ایک نئے "دام محبت یا نئی ذمہ داری" میں ڈالا ہے تو پھر آپ اس سے اب یکطرفہ محبت کی وہ توقع نہ رکھیں جو اس سے پہلے آپ کو تھی، اس سلسلہ میں خدا کا خوف اور محتاط رویّہ اختیار کرنا چاہیئے اگر آپ کی محبت خالص تھی تو اسے توقع سے وابستہ کر کے اپنی فطری مخلصانہ محبت کو داغدار نہ بنائیے اور آپ اس بچہ کو اپنی امیدوں اور توقعات کا سہارا نہ بنائیے بلکہ اس پروردگار پر نگاہ رکھیئے، جس نے آپ کی پرورش کا انتظام کیا اور آپ کے ذریعہ آپ کے بچہ کی کی پرورش کرائی اب بھی وہ پروردگار موجود ہے، اور آپ کا اور آپ کی ضرورتوں کا رقیب یعنی نگراں ہے، اگر اس کی طرف سے آپ کی حق تلفی ہو رہی ہے تو قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی، اور ممکن ہے کہ دنیا میں بھی کچھ سزا ملے جیساکہ عام طور پر نافرمان اولاد کا حشر دیکھا جاتا ہے، مگر بہر حال آپ کو صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ورنہ اس سے مزید بدمزگی پیدا ہوگی، اور پھر شادی کے بعد شریعت نے میاں بیوی کو جتنا حق آزادی دیا ہے آپ کو اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے، یکطرفہ حق طلبی مناسب نہیں ہے، اس نوجوان جوڑے کو اور آپ کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (اللہ تمہاری ہر حرکت اور ہر حالت کو دیکھ رہا ہے)۔

سورۃ نساء کی سب سے پہلی آیت جو اس موقع پر پڑھی جاتی ہے، اس میں خدا تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کے ساتھ دوسری بات جس کی طرف اس نئے جوڑے کی اور اس کے واسطہ سے سارے اسلامی معاشرہ کی توجہ مبذول کرائی ہے وہ یہ ہے کہ سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور ان میں ایک ہی ماں باپ کا خون جاری و ساری ہے۔ کالے ہوں یا گورے، عجمی ہوں یا عربی، امریکی ہوں یا افریقی، روسی ہوں یا چینی، ہندوستانی ہوں یا پاکستانی کسی ملک یا کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، انسانیت کے رشتہ سے سب بھائی بھائی ہیں، نکاح کے موقع پر اس بات کے کہنے کا مقصود

یہ ہے کہ یہ جو ایک نیا رشتۂ زوجیت و محبت قائم ہو رہا ہے۔ یہ محض دو آدمیوں کے درمیان نہیں قائم ہو رہا ہے بلکہ یہ دو خاندانوں کے درمیان قائم ہو رہا ہے، اس رشتہ سے نہ جانے کتنے نئے نئے رشتے ناطے اور عزیز و اقارب اور خاندان پیدا ہوں گے، اس حیثیت سے یہ نیا رشتۂ اخوت و محبت پورے انسانی خانوادہ کا ایک جز اور اس کے لئے ایک امتحان گاہ ہے، گویا اس نئے جوڑے سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اگر تم اس چھوٹے سے خانوادہ اور معاشرہ کے اس رشتۂ محبت کا حق ادا نہ کر سکے تو رشتۂ انسانیت کے اس بڑے خانوادہ اور معاشرہ کا حق بھی تم نہ ادا کر سکو گے، جس کے افراد ساری دنیائے رنگ و بو میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس چھوٹے حق کی ادائیگی کے ساتھ اس بڑے عالمگیر حق کی ادائیگی کی تاکید کے لئے یہ جملے استعمال کئے گئے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ۔

اے لوگو! اللہ سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر اس کی جنس سے ان کا جوڑا بنایا اور پھر ان کے ذریعہ بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور اس طرح رشتوں کے بارے میں بھی ڈرتے رہو۔

اس آیت کے آخری جملہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کا واسطہ دے کر تم دوسرے بندگانِ خدا سے سوال کرتے اور اپنا حق مانگتے ہو تو خدا ہی سے ڈر کر رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنا بھی اپنے اوپر ضروری سمجھو، اس لئے کہ زندگی میں آدمی کو رشتہ داروں اور دوسرے انسانوں سے نہ جانے کتنی ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں تو آدمی اگر اپنے برے وقت کی ضرورت اور بیچارگی کو ذہن میں رکھے گا تو وہ بھی ضرور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرے گا اور حق تلفی کرتے ہوئے ڈرے گا کہ نہ جانے کس وقت وہ خود دوسروں کا دست نگر ہو جائے اللہ تعالیٰ نے اپنے خوف کے ساتھ رشتوں اور تعلقات کے معاملہ میں ڈرتے رہنے کا جو ذکر کیا اس سے اس کی پوری اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اسی لئے ہر نئے رشتۂ نکاح کے موقع پر اس کو دہرایا جاتا ہے اور اس بات کے کہنے کا یہ بہترین موقع ہوتا ہے۔

اس آیت میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ ہم نے تم کو ایک جان یعنی حضرت آدمؑ سے پیدا کیا اور

حضرت آدم ہی کی جنس سے انکا جوڑا یعنی حضرت حوّاء کو پیدا کیا خدائے قدوس نے یہ بات کہکر یہ حقیقت بھی ہمارے ذہن نشین کرادی کہ جس طرح حضرت آدمؑ تمام نسل انسانی کے باپ ہیں اسی طرح حضرت حوّاء تمام نسل انسانی کی ماں ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ حضرت حوّاء کو انہی کے جنس سے پیدا کیا ہے، اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ عورت کوئی ذلیل، حقیر اور کمتر مخلوق نہیں ہے بلکہ انسانی شرف و امتیاز میں برابر کی شریک ہے اس کو کمزور اور حقیر سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ حدیث میں عورتوں کو شیشے کے برتن سے تشبیہ دی گئی ہے ایک بار ایک صحابی وہ اونٹ جس پر عورتیں سوار تھیں تیزی سے ہانک رہے تھے تو آپ نے فرمایا،

یَا اَنْجَشَۃُ رِفْقًا اَوْ سَوْقًا بِالْقَوَارِیْرِ (اے انجشہ ان شیشوں کا خیال کرو ذرا سواری دھیمے لے چلو)۔

رفقا یا سوقا بالقواریر کا مطلب یہ ہے کہ جسطرح شیشے کی دیکھ ریکھ ہوتی ہے کہ کہیں اسے ٹھیس نہ لگ جائے کیونکہ ذرا سی ٹھیس سے وہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح عورت کا دل بھی شیشے کی مانند ہوتا ہے۔ ذرا ٹھیس لگی اور ٹوٹا، میر انیس نے اپنی شاعری کی زبان میں دل کو آبگینے سے تشبیہ دی ہے ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مگر آپ نے عورت کے پورے وجود کو شیشے کے مانند قرار دیا ہے جس سے اس صنف نازک کی فطری حیثیت واضح ہوتی ہے، صحابہ کہتے ہیں کہ اگر یہ جملہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا کہتا تو ہم لوگ نہ جانے کیا کیا معنی پہناتے، قرآن پاک نے ایک جامع لفظ معروف سے عورتوں کیساتھ سلوک کی اس نازک حیثیت کو واضح کردیا ہے، فرمایا گیا ہے کہ "وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (ان کے ساتھ معروف کے ساتھ زندگی بسر کرو) معروف میں ہر وہ اچھی بات ہر وہ اچھا طرز عمل اور متوازن اخراجات زندگی شامل ہے جس سے نہ تو ناگواری پیدا ہو اور نہ جس سے ان کی حق تلفی اور دل شکنی ہو۔

شادی بیاہ کے موقع پر سارے انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں آپس میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے اور خاص طور پر ایک مسلمان کا دوسرے مسلمانوں سے دوہرا رشتہ ہے، ایک انسانی رشتہ دوسرا اسلامی اور ایمانی رشتہ۔ حدیث میں آتا ہے۔ "لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ"۔ (تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

اب اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حیثیت دی ہے کہ آپ اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی میں ۲۵،۰۰۰ ہزار یا لاکھ دو لاکھ خرچ کرسکتے ہیں تو آپکے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیئے کہ آپ کے خاندان اور پڑوس میں ایسے بھی کتنے آدمی ہونگے جو اپنی لڑکی یا لڑکے کی شادی میں دس بیس ہزار بھی خرچ کرنیکی پوزیشن میں نہ ہونگے۔ تو آپ کا فرض ہے کہ آپ سب کو ساتھ لے کر چلیں، ایسا نہ ہو کہ آپکے طرز عمل سے ان کو تکلیف پہونچے اور ان کے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی میں دقت پیدا ہو، مقصد یہ ہے کہ آپ ایسا طریقہ اختیار نہ کریں جس سے کہ معاشرہ کے عام لوگ کسی زحمت میں مبتلا ہوں۔ اور بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی کے ساتھ کسی غریب کی لڑکی کی شادی کا بھی اہتمام کردیں۔

ظفر احمد صدیقی، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی۔ بنارس

"شبلی نعمانی۔ حیات اور کارنامے"

پر

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے اعتراضات

ڈاکٹر مولوی ظفر احمد صدیقی ہندو یونیورسٹی بنارس میں لکچرر ہیں، انھوں نے "علامہ شبلی۔ حیات اور کارنامے" کے عنوان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھا تھا، جسے یونیورسٹی نے منظور کر لیا۔ اس مقالہ کو انھوں نے اشاعت کے لئے اردو اکیڈمی اترپردیش کو بھیجا، اکیڈمی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر اسے کسی اہل علم کے پاس بھیج کر اس کی تحقیق کراتی ہے کہ یہ اشاعت کے قابل ہے یا نہیں۔ علامہ شبلی کی مناسبت سے اسے دارالمصنفین بھیج دیا گیا۔ ان حضرات کو اس میں کچھ قابل اعتراض باتیں نظر آئیں۔ چاہیئے یہ تھا کہ وہ اپنی رائے اکیڈمی کو لکھ دیتے کہ یہ اشاعت کے قابل نہیں ہے مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ اس راز کے سلسلے میں اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کے خلاف انھوں نے رپورٹ بھیجنے سے پہلے اخبارات میں اس کے خلاف مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ انہیں مضامین میں ایک مضمون ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے لکھا تھا، جس کے جواب میں مقالہ نگار نے یہ مضمون لکھا ہے۔

یہ مقالہ آج سے چھ ماہ پہلے لکھا گیا تھا، مگر چونکہ ناظرین "ارشاد" اس بحث سے ناواقف ہیں، اس لئے اس کے شائع کرنے میں راقم الحروف کو تامل رہا، لیکن اس کا تعلق ایک علمی بحث سے ہے اور اس میں بڑی حد تک معروضی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اس وجہ سے بھی اور پھر اس لئے بھی اسے الارشاد کے حوالہ کیا جا رہا ہے کہ ایک

نوجوان مصنف نے علامہ شبلی کے کارناموں پر بعض نئے زاویوں سے جو تحقیقی بحث کی ہے وہ ہر طرح ستائش اور ہمت افزائی کے لائق ہے، کہیں کہیں انداز بیان اور نتائج اخذ کرنے میں ان کے قلم میں شوخی اور نو آموزی ضرور آ گئی ہے مگر اتنے ضخیم تحقیقی مقالہ کی خوبیوں پر معمولی خامیوں کی وجہ سے کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ علامہ شبلی کی ذات اور ان کے کارناموں پر اسے کوئی جارحانہ حملہ کہا جا سکتا ہے۔

بحمداللہ ہم سب علامہ شبلی کی معنوی اولاد ہیں اور ان کے کارناموں کے دلدادہ بلکہ عاشق ہیں، لیکن ان کی بعض منفرد رایوں سے اختلاف کے علاوہ اگر اس مقالہ میں کوئی بنیادی خامی ہوتی یا اس سے علامہ شبلی کی ذات یا ان کے کارنامے مجروح ہوتے تو السّنشاد کبھی اس میں تعاون نہ کرتا، چھوٹوں کا اپنے بڑوں کے بعض تسامحات کی نشاندہی کرنا ہماری علمی و دینی تاریخ کی قدیم روایت رہی ہے، اسے فسادِ نیت یا عناد پر محمول کرنا علمی تنگ نظری ہے۔

(مرتّب)

راقم کے پیش نظر اس وقت محترم مولانا ضیاء الدّین اصلاحی، رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ کا وہ مضمون ہے، جو "مولانا شبلی اور ان کی سیرۃ النبی پر تعجب خیز تنقیدیں" کے عنوان سے، ۱۰ر نومبر ۱۹۸۹ء کے ہفت روزہ "ندائے ملت" لکھنؤ میں شائع کرایا گیا ہے، اس میں میرے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے "شبلی نعمانی۔ حیات اور کارنامے" پر مختلف پہلوؤں سے تنقیدیں کی گئی ہیں مولانا ضیاء الدین صاحب کا یہ مضمون حلقہ دارالمصنفین سے اس مقالہ پر تنقید و اعتراضات کی تیسری کڑی ہے، اس سے قبل حلقہ دارالمصنفین کا لکھا ہوا ایک مضمون زبیری صاحب کے نام سے ۱۱ر اگست ۱۹۸۸ء کے ضمیمہ "قومی آواز" میں شائع ہو چکا ہے اور اسی حلقے کا مرتب کردہ ایک پمفلٹ چند وکلاء حضرات کے نام سے ماہ نومبر کے اوائل میں اعظم گڑھ میں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہے۔ لیکن مولانا اصلاحی کے اس مضمون کا ہم خیر مقدم کرتے اور مقالے پر ان کی "نگاہ قہر" کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ اس مضمون میں وہ سطحیت اور عامیانہ پن نہیں ہے، جو زبیری صاحب کے مضمون اور متذکرہ پمفلٹ میں بہ ایک نگاہ محسوس ہوتا ہے اور جسے کسی حال میں بھی دارالمصنفین کے شایان شان نہیں کہا جا سکتا۔

فاضل مضمون نگار نے اپنے گرامی قدر مضمون کے آغاز میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یوپی کی یونیورسٹیوں میں "شبلی شکنی" کی ایک باقاعدہ مہم جاری ہے، اور راقم حروف کا مقالہ بھی علامہ شبلی اور ان کی تصانیف کو فروتر ثابت کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ درحقیقت مقالے کا یہ بے بنیاد پس منظر ہی تمام تر غلط فہمیوں کی بنیاد ہے۔ اولاً تو یونیورسٹیوں میں "شبلی شکنی" کی کسی مہم کا وجود ہی نہیں اور اگر بالفرض ہو تو ہم شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ اس کے بارے میں بالکل لاعلم ہیں، لہٰذا اس مہم یا جذبے کے تحت کسی مقالے کے لکھنے یا لکھوانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

علامہ شبلی آسمانِ علم و ادب کے ماہِ درخشاں ہیں، ان کے علمی و ادبی کارنامے ہماری فکری و تہذیبی تاریخ کا ایسا روشن باب ہیں، جس کی ہر ہر سطر گویا آبِ حیات سے لکھی ہوئی ہے۔ اور اسکے نقوش بریدۂ عالم پر ثبت ہیں، وہ یقیناً ایک عہد ساز متکلم، بلند پایہ مؤرخ، بے مثل سوانح نگار، عظیم المرتبت سیرت نگار، مسلم الثبوت شاعر اور بالغ نظر نقاد تھے۔ ان کی قومی و ملی خدمات کا اعتراف ان کے دوستوں کے علاوہ دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ ان کی بہترین تحریری، تقریری اور دماغی صلاحیتیں ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف رہیں۔ موصوف کے ان گوناگوں کارناموں پر کبھی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

علامہ شبلی نے تحریری و تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک عظیم الشان کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ ذہین، باصلاحیت اور ہونہار طلبہ کی ایک جماعت کا انتخاب کر کے اپنی بے مثال تربیت کے ذریعے انھیں تحریر و تصنیف کے میدان کا شہسوار اور اپنے قومی و ملی نیز علمی و فکری نظریات و افکار کا محرم اسرار بنا دیا، جن میں سرفہرست نام فاضلِ دہر یگانۂ روزگار مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، موصوف کے ذاتی و شخصی اوصاف و کمالات اور علمی و ادبی کارناموں اور فتوحات کے پیش نظر انھیں تحریک ندوۃ العلماء کا بہترین ثمرہ، دبستانِ شبلی کا رکنِ اعظم اور ماضی قریب کے ہندوستان کا عبقری قرار دیا جا سکتا ہے۔

سید صاحب کی "حیات شبلی" علامہ موصوف کی سب سے مفصل، مستند اور بہترین سوانح عمری نیز متعلقہ عہد کی سیاسی، علمی اور تہذیبی تاریخ کا بہترین مرقع بھی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ

ایک لائق و سعادت مند شاگرد کا "وحید عصر و یکتائے زمن" استاد کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت ہے، ہماری مشرقی روایات کے مطابق اس پر عقیدت و محبت کا غلبہ ہونا چاہئیے تھا اور ہے، استاد کی زندگی کے کمزور پہلوؤں کے بیان و اظہار کی گنجائش اور ضرورت نہ تھی اور نہ ہے، البتہ علامہ موصوف کے قائم کئے ہوئے نہج اور فکری پرواز کے مطابق ان کی تمام تصانیف و کتب اور رسائل پر مختلف علمی و ادبی حیثیت اور جہت سے ایک مستقل اور علاحدہ جلد میں حضرت سید صاحب کے قلم سے مفصل ریویو اور تبصرے کی ضرورت یقیناً تھی مگر ارادہ کے باوجود سید صاحب اسے پورا نہ کر سکے۔

مارچ سنہ ۶۹ء میں شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ پر مشتمل ریسرچ کمیٹی نے میرے مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی کے لئے "شبلی نعمانی۔ حیات اور کارنامے" کا موضوع تجویز کیا، اس موضوع کے انتخاب کے پس پشت یہ حسن ظن اور جذبہ کارفرما تھا کہ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے طالب علمانہ انتساب، عربی و فارسی سے کسی قدر واقفیت اور علامہ شبلی کے علمی و فکری نظریات سے ہم آہنگی و اتفاق کی بنا پر یہ ناچیز اس کام کو عام طلبہ کی بہ نسبت بہتر طریقے پر انجام دے سکے گا، اور اس طرح علامہ موصوف کے کارناموں کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔

میں نے متعلقہ موضوع پر مطالعے کا آغاز کیا اور چند مہینوں بعد اندازہ لگایا کہ علامہ موصوف کی حیات اور قومی و ملی خدمات کے تمام پہلو مولانا سید سلیمان ندوی کی "حیات شبلی" اور شیخ محمد اکرام کی "یادگار شبلی" کے ذریعے منظر عام پر آچکے ہیں، لہٰذا ان پہلوؤں پر خواہ مخواہ کی خامہ فرسائی کے بجائے اصل ضرورت ان کے علمی و ادبی کارناموں کے تجزیہ و تحقیق کی ہے۔ مقالے کے نگراں پروفیسر نیر صاحب نے اس خیال سے اتفاق فرمایا، چنانچہ انھیں خطوط پر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچایا گیا، البتہ دفتری دشواریوں کی بنا پر مقالے کا موضوع "شبلی کے علمی و ادبی کارنامے" کے بجائے حسب سابق "شبلی نعمانی۔ حیات اور کارنامے" برقرار رکھا گیا، مقالے کے دیباچے میں مختصراً ان امور کی وضاحت کر دی گئی ہے لہٰذا مقالے پر موضوع سے عدم مطابقت کا الزام رفع ہو جانا چاہئیے۔

علامہ شبلی کے علمی و ادبی کارناموں پر قلم اٹھانے کی تین صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ از اوّل تا آخر مدح و تقریظ کا انداز اختیار کیا جائے اور موصوف کے تسامحات، لغزشوں اور فروگذاشتوں (جن سے کوئی عام انسان مبرا نہیں) کے ذکر کے مواقع پر بھی تحسین و دفاع سے کام لیا جائے، دوسری شکل یہ

تھی کہ ان کے محاسن و کمالات کے اعتراف سے مکمل صرفِ نظر کرتے ہوئے محض عیب جوئی، نکتہ چینی اور خردہ گیری سے سروکار رکھا جائے۔ تیسری اور آخری شکل یہ تھی کہ موصوف کے علمی وادبی فتوحات و خدمات کا کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف و اقرار کرتے ہوئے ان کے تسامحات کو بھی بیان کر دیا جائے۔ اوّل الذکر طریقے کو خود علامہ شبلیؒ سخت ناپسند فرماتے تھے، اور اس پر "ایشیائی شخص پرستی" "کتاب المناقب" اور "دلِ مداحی" جیسے الفاظ سے تنقید کرتے تھے، دوسرا طریقہ بھی علمی دیانت داری کے سراسر خلاف ہے، لہٰذا علامہ کے کارناموں کے تجزیے میں ہم نے افراط و تفریط کی ان دونوں راہوں سے احتراز کرتے ہوئے اعتدال و توازن کی آخری شکل اپنائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مقالے میں علامۂ موصوف کے کارناموں کے مختلف پہلوؤں پر تعریف و تحسین کے پہلو بہ پہلو تنقیدیں بھی ملتی ہیں۔ فاضل محترم مولانا اصلاحی مختلف اسباب کی بنا پر اس طرز کو پسند نہیں فرماتے۔ لہٰذا انھیں ہمارے مقالے میں ہر طرف تضاد ہی تضاد نظر آتا ہے۔ دراصل موصوف علامہ شبلیؒ کے سلسلے میں افراط اور مجھ ناچیز کے سلسلے میں تفریط مکرہ کے شکار ہو گئے ہیں۔ چونکہ یہ اختلاف نقطۂ نظر کا ہے، لہٰذا ہم انھیں معذور سمجھتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمیں معذور سمجھیں۔

ع وللناس فیما یعشقون مذاھب

"سوانح حیات" کے بعد مقالے کا پہلا باب "شبلی بحیثیت متکلم" ہے۔ علوم اسلامیہ میں علم کلام ایک ایسا فن ہے، جس سے اردو داں طبقے کے پڑھے لکھے افراد بھی بالعموم ناآشنا ہیں۔ یا اس سلسلے میں انکی واقفیت بہت محدود ہے۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ علامہ شبلیؒ کی متکلمانہ حیثیت پر قلم اٹھانے سے پہلے مختصر طور پر علم کلام کا تعارف کرتے ہوئے اجمالاً اس کی تاریخ بھی قلم بند کر دی جائے، تاکہ عام قاری اس فن کی نوعیت و حیثیت نیز اس کی تاریخ سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد "متکلم شبلیؒ" کی عظمتوں اور کارناموں کا احساس و ادراک کر سکے۔ اس سلسلے میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ یہ تعارف و تاریخ نگاری صحت، جامعیت اور اختصار کے اصولوں پر مبنی ہو اور اسے خواہ مخواہ نہ بہت زیادہ طول دیا جائے اور نہ حوالوں سے گراں بار کیا جائے۔ مولانا اصلاحی نے غلط فہمی کی بنا پر اس اختصار کو سطحیت اور سرسری پن پر محمول فرمایا اور حوالوں کی غیر موجودگی کی بنا پر یہ رائے قائم فرمائی کہ ہمارا ماخذ اردو کی معمولی کتابیں ہیں۔ حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ آئندہ سطور میں ہم سلسلۂ زیرِ بحث میں

مولانا کے اعتراضات اور ان کے جوابات پیش کریں گے، جن سے دعوے کی صحت ثابت ہو جائے گی۔

ہم نے لکھا تھا: "علم کلام اپنی ساخت اور مزاج کے لحاظ سے نقلی نہیں عقلی علم ہے اس کا شمار منقولات میں نہیں معقولات میں کیا جاتا ہے"

مولانا فرماتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ علم کلام کا ایک حصہ معقولات اور دوسرا منقولات کی فہرست میں آتا ہے"

جواباً عرض ہے کہ علم کلام کا ساخت اور مزاج کے لحاظ سے عقلی ہونا الگ چیز ہے اور اس کے دلائل کا معقولات کے ساتھ منقولات پر مشتمل ہونا دوسری چیز ہے اور دونوں میں کوئی منافات نہیں۔ چنانچہ یہ بات خود ہم نے بھی لکھی ہے کہ "یہ وہ علم ہے جس میں عقائد دینیہ کا اثبات دلائل عقلیہ ونقلیہ سے کیا جاتے"۔ رہا ہمارا یہ دعویٰ کہ یہ ساخت اور مزاج کے لحاظ سے عقلی ہے، تو سارے اہل علم یہی بات لکھتے ہیں، مثال کے لئے مولینا عبدالباری ندوی مرحوم اور علامہ ابن خلدون کی درج ذیل عبارتیں ملاحظہ ہوں:

مولانا عبدالباری ندوی: "معقولات کا وہ خاص فن، جو منقولات کی خدمت کے لئے وضع ہوا علم کلام ہے" (تجدید دین کامل، ص ۱۱۱)۔

ابن خلدون: "هو يتضمن الحجاج عن العقائد الايمانية بالأدلة العقلية." (مقدمہ ابن خلدون، احیاء التراث العربی، ص ۵۸۴)۔ (وہ ایک ایسا علم ہے جو ایمانی عقائد کی حمایت میں دلائل عقلیہ کے ذریعے مجادلات و مباحثات پر مشتمل ہو)

متکلمین کے مزاجاً عقلیت پسند ہونے کی بنا پر ہی مولانا روم نے فرمایا تھا ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود ۔۔ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مولانا فرماتے ہیں: "اس مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں میں یونانی منطق وفلسفے کے داخلے کے بعد علم کلام وجود میں آیا ہے۔ پھر موصوف نے اس کی تردید میں خاصا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقالے میں سرے سے اس بحث سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا کہ علم کلام پہلے وجود میں آیا، یا مسلمانوں میں یونانی منطق وفلسفے کا داخلہ پہلے ہوا؟ لہٰذا مذکورہ بالا اعتراض اور پھر اس کی تردید دونوں بے محل اور بے ضرورت ہیں، البتہ ہم نے اس سے بحث ضرور کی ہے کہ علم کلام کا وجود، شیوع اور رواج کن اسباب وعوامل کے تحت ہوا؟ اور اس سلسلے میں مذہب کے

دائرے میں وسعت، یہودی، عیسائی، زرتشتی اور مانوی مذاہب کے بہت سے افراد کے اسلام میں داخلے نیز یونانی علوم و فنون کے عربی تراجم وغیرہ کو علم کلام کے وجود، شیوع اور رواج کے اسباب وعوامل میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ ماخذ مسعودی کی "مروج الذہب" (ذکر خلافت قاہر باللہ)، طاش کبری زادہ کی "مفتاح السعادۃ" (علم اصول الدین ۲/ ۶۷-۱۶۶) اور سعد الدین تفتازانی کی "شرح عقائد نسفی" (مقدمہ رشیدیہ دہلی ص ۶) اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی "تاریخ دعوت وعزیمت" جلد اوّل ہیں۔ تطویل سے بچنے کی خاطر ہم یہاں صرف آخر الذکر کتاب کی عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"جب یونانی اور سریانی کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب وممالک کے علماء ومتکلمین سے اختلاط ہوا تو امت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی سے زیادہ سطحیت اور جدت تھی، اس طرز فکر اور طریقہ بحث سے متاثر ہوئے۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، ان کے باہمی تعلق، کلام الٰہی، رؤیت باری، مسئلہ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے اور نہ دنیاوی حیثیت سے مفید۔"

(تاریخ دعوت و عزیمت، طبع دوم، مجلس تحقیقات لکھنؤ ۱/ ۹۲)

ہم نے لکھا تھا: "معتزلہ اور اشاعرہ کا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ معتزلہ کے علم کلام کی بنیاد [illegible] پر ہے۔" مولانا اصلاحی اس کی تردید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "یہ بات وہی لکھ سکتا ہے جس کی نظر علم کلام کی تاریخ پر نہ ہو، کیونکہ معتزلہ اور اشاعرہ دونوں کا مقصد عقائد دینیہ کا اثبات و احقاق ہے، اس لئے بنیادی طور پر معتزلہ کا قدم عقل محض کی رہنمائی میں آگے نہیں بڑھتا، بلکہ ان کا کام کتاب و سنت سے ثابت شدہ عقائد کی عقلی و نقلی توجیہ ہے۔"

جواباً عرض ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ کہ اشاعرہ کے برخلاف معتزلہ کے علم کلام کی بنیاد عقل محض پر ہے، امام ابو منصور ماتریدی کی درج ذیل تصریحات پر مبنی ہے جنھیں علم کلام کی تاریخ سے بے خبر نہیں کہا جا سکتا۔

امام ابو منصور ماتریدی: أن الجهمية والقدرية والمعتزلة يجعلون العقل حاسة سادسة كالسمع والبصر والشم والذوق واللمس، ويثبتون الأمور على عقولهم۔ "بے شک جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ کی طرح عقل کو بھی چھٹے حاسے کا درجہ دیتے ہیں

اور مختلف امور کے اثبات کے لئے عقل کو مدار و معیار بناتے ہیں)۔

(شرح الفقہ الاکبر، لأبی منصور الماتریدی، طبع ثالث، ص ۲۱)

" فأراد القدریة والمعتزلة أن یدرکوا کنه الربوبیة بعقولهم العاجزة الکالة حتی مرضت عقولهم وسقمت نفوذ المعرفة " (قدریہ اور معتزلہ نے چاہا کہ اپنی عاجز و درماندہ عقل کے ذریعے ماہیتِ ربوبیت کا ادراک کرلیں، تا آنکہ ان کی عقل بیمار و مریض ہوگئی۔ نتیجۃً وہ معرفت سے محروم رہ گئے) ایضاً۔

رہا مولانا اصلاحی کا یہ فرمانا کہ "معتزلہ کا کام کتاب و سنت سے ثابت شدہ عقائد کی عقلی و نقلی توجیہ ہے" تو وہ امام ابوالحسن اشعری کی درج ذیل تصریح کے خلاف ہے۔

امام ابوالحسن اشعری: "اما بعد فان الزائغین عن الحق من المعتزلة واهل القدر مالت بهم اهواءهم الی تقلید رؤساءهم ومن مضی من اسلافهم، فتأولوا القرآن علی آراءهم تاویلاً، لم ینزل الله به سلطانا، ولا أوضح به برهانا، ولا نقلوه عن رسول رب العالمین، ولا عن السلف المتقدمین، وخالفوا روایات الصحابة علیهم السلام عن نبی الله صلوات الله علیه "

(کتاب الابانۃ، طبع ثالث، حیدر آباد، ص ۴)

(حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں نے جو حق سے منحرف ہیں' اپنی خواہشات کی پیروی میں اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقے کے پیش رؤں کی تقلید کی اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی ایسی تاویلات کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے اور جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور نہ سلف متقدمین سے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام کی مرویات کی مخالفت بھی کی)۔

ہم نے لکھا تھا کہ "معتزلہ عذاب قبر، وزنِ اعمال اور پل صراط وغیرہ کے منکر تھے"۔

مولانا فرماتے ہیں کہ "ان عقائد کا انتساب معتزلہ کی طرف وہ تو کر سکتا ہے جس کا مطالعہ عام سطحی کتابوں تک محدود ہو" جواباً عرض ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا ماخذ امام ابوالحسن اشعری کی کتاب "الابانۃ"

امام ابومنصور ماتریدی کی "شرح فقہ اکبر" اور سعد الدین تفتازانی کی "شرح عقائد نسفی" ہیں، لہذا مولانا کا اعتراض ہم پر نہیں بلکہ انھیں حضرات پر وارد ہوتا ہے۔ عبارتیں ملاحظہ ہوں:

امام ابوالحسن اشعری: "وجحدوا (أی المعتزلة) عذاب القبر" (کتاب الابانة، ص ۴)
(اور ان لوگوں (معتزلہ) نے عذاب قبر کا انکار کیا)۔

امام ابومنصور ماتریدی: "أن الجهمیة والقدریة والمعتزلة أنکروا عذاب القبر... وأنکروا ... المیزان والصراط"۔ (شرح الفقہ الاکبر، ص ۲۱)۔

(بے شک جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ نے عذاب قبر کا انکار کیا اور میزان وصراط کا بھی انکار کیا)

سعد الدین تفتازانی: "وأنکر عذاب القبر بعض المعتزلة"۔ (شرح عقائد نسفی، ص ۷۰)۔
(بعض معتزلہ عذاب قبر کے منکر ہیں)

"والوزن حق ... وأنکرته المعتزلة"۔ (ایضاً ص ۷۹)۔
(وزن اعمال برحق ہے ... معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے۔)

"والصراط حق ... وأنکره أکثر المعتزلة"۔ (ایضاً ص ۸۰)۔
(پل صراط برحق ہے ... اکثر معتزلہ اس کے منکر ہیں)۔

ہم نے لکھا تھا: "اشاعرہ عقلی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور معتزلہ انھیں اپنا نصب العین بناتے ہیں، اس لئے عقلیت پسندی کی بنا پر شبلی کی ہمدردیاں ثانی الذکر کے ساتھ ہیں"۔

مولانا فرماتے ہیں: "یہ بات ناقص اور بالکل ابتدائی درجے کے مطالعے کی وجہ سے کہی گئی ہے، اشاعرہ کی مخالفت کا مطلب در پردہ معتزلہ کی حمایت نہیں ہو سکتا"۔

جواباً عرض ہے کہ مولانا نے سلسلۂ زیر بحث میں مقالے میں ہمارے پیش کردہ درج ذیل دلائل کو نظر انداز کر دیا ہے۔

(۱) علامہ شبلی محدثین کو ارباب ظاہر اور معتزلہ کو اہل نظر کے لقب سے یاد کرتے ہیں (علم الکلام، مطبع معارف ۱۹۲۹ء، ص ۲۲/۱)۔

(۲) معتزلہ کو اسلام اور مسلمانوں کے خادم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں (ایضاً ۲۴/۱، ۲۵، ۲۸)۔

(۳) معتزلہ کے نظریات کی ایسی توجیہہ کرتے ہیں، جن سے ان کا برحق ہونا ظاہر ہو (ایضاً ۱/۲۹)۔
(۴) اس بات پر بار بار زور دیتے ہیں کہ فقہاء و محدثین کی جماعت میں بھی بعض معتزلی گذرے ہیں (ایضاً)۔

ہم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی کے وہ "تاریخی مقالات و تصانیف" بھی موصوف کے متکلمانہ کارناموں کے ذیل میں آتے ہیں جن میں "مستشرقین کی جانب سے اٹھائے گئے بے بنیاد اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں یا جن کا منشا اپنے ماضی کی ایسی تصویر کشی ہے، جو گذشتہ تہذیبی و تمدنی نیز علمی و ملی روایات پر قوم کے اعتماد کو بحال کر سکے۔" پھر اس ضمن میں ہم نے علامہ کے متعدد دوسرے مقالات کے ساتھ اورنگ زیب عالم گیر، اسلامی کتب خانے، اسلامی شفا خانے اور تزک جہانگیری کے نام بھی بطور مثال پیش کئے تھے۔

مولانا اصلاحی ہماری اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ بات "علم کلام کے غلط قسم کے مفروضات مرتب کر کے" لکھی گئی ہے اور یہ کہ "اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے موجودہ دور کے مورخین کو بھی متکلم قرار دیا جائے"۔

جواباً عرض ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا ماخذ مولانا سید سلیمان ندوی کا درج ذیل بیان ہے، جسے ہم اپنے مقالے میں بہ تمام و کمال نقل کر چکے ہیں۔ لہٰذا مولانا کا اعتراض ہم پر نہیں بلکہ سید صاحب پر وارد ہوتا ہے۔ موصوف "حیات شبلی" میں رقمطراز ہیں:

> "یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفے سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی، جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جز اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی تاریخ میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا گیا اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں اور اپنے مقالے میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرے پر ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے اور اہل یورپ کے کارناموں کے سامنے ان کو اپنے مذہبی و تمدنی و سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں، اور اس طرح ان مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لئے مردہ ہو جائے۔"

"ایسے پرجوش مند حریفوں کے مقابلے میں ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا، وہ مولانا شبلی ہی تھے، جنھوں نے ان ہی کے طریقے سے، ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی"

(حیات شبلی، دیباچہ، ص ۲۵، ۲۲)

سید صاحب موصوف ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ مولانا نے تاریخ ہی کی تقریب سے علم کلام کے کوچے میں قدم رکھا، مگر یہ کوچہ ان کو ایسا پسند آیا کہ پھر وہ عمر بھر اس سے نہیں نکلے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے علم کلام کی کتابیں تاریخ کے دائرے میں آجاتی ہیں، مگر اہل نظر کو معلوم ہے کہ انکی تاریخی کتابیں بھی علم کلام ہی کے دائرے میں ہیں۔" (ایضاً، ص ۳۶۵)

مقالے میں "شبلی بحیثیت سوانح نگار" اور "شبلی بحیثیت سیرت نگار" کی مناسبت سے علم کلام کیطرح اجمالاً سوانح نگاری اور سیرت نگاری کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے، اور یہاں بھی صحت، جامعیت اور اختصار کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے، ہمارے مقاصد اور طریق کار کے پیش نظر یہی مناسب اور موزوں بھی تھا کہ ان مباحث کو اطناب اور حوالوں کی غیر ضروری گراں باری سے محفوظ رکھا جائے۔

مولانا اصلاحی نے حسب سابق یہاں بھی اس صورت حال کو سطحیت اور سرسری پن پر محمول فرمایا ہے، لیکن اس کی بنیاد بھی محض غلط فہمی ہے۔

ہم نے "شبلی بحیثیت مورخ" کے باب میں لکھا تھا کہ علامہ شبلی نے سیرت نگاری کی تاریخ بیان کرتے ہوئے "تصانیف سیرت کے بارے میں بحیثیت مجموعی یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس میں صحت و صداقت کا التزام نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مصنفین سیرت نے رطب و یابس جو کچھ پایا ہے، بلا کم و کاست جمع کر دیا ہے"۔ پھر اس کی تردید کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ یہ بات غلط ہے اور صحیح صورت حال یہ ہے کہ "مصنفین سیرت نے بھی

حتی الامکان صحت و صداقت کا پورا لحاظ رکھا ہے اور اپنی دانست کے مطابق صحیح روایات کے جمع و انتخاب میں کسی قسم کی فروگذاشت روا نہیں رکھی ہے۔"

مولانا اصلاحی نے اس پر تعقب کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقالے میں سیرت کے بارے میں معلومات بہت سطحی ہیں۔ ابتداءً سیرت کے جو اوّلین مجموعے مرتب کئے گئے ہیں، ان کے بارے میں علماء متقدمین کا بھی وہی فیصلہ ہے، جو مولانا شبلی کا ہے۔ حضرت امام احمد کا نہایت مشہور قول ہے " ثلاثة کتب لیس لها أصل، المغازی والملاحم والتفسیر"

راقم عرض پرداز ہے کہ امام احمد بن حنبل (ف ۲۴۱ھ) کا متذکرہ بالا قول (جیسا کہ خود علامہ شبلی نے خطیب بغدادی کے حوالے سے اس کی تصریح نقل کی ہے۔ لیکن مولانا اصلاحی نے اسے مصلحتہً نظر انداز کر دیا ہے) اپنے عموم پر محمول نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ موسیٰ بن عقبہ (ف ۱۴۱ھ) کی "کتاب المغازی" کے بارے میں امام مالکؒ فرماتے ہیں "علیکم بمغازی موسیٰ بن عقبة فإنه ثقة" (تم لوگ مغازی موسیٰ بن عقبہ سے ہمیشہ استفادہ کیا کرو کیونکہ وہ ثقہ ہیں) (تہذیب التہذیب ۱۰/۳۶۱) اور ابو معشر السندی (ف ۱۷۰ھ) کے بارے میں خود امام احمد کا قول ہے "کان بصیراً بالمغازی" (مغازی کے سلسلے میں صاحب بصیرت تھے) (تہذیب التہذیب ۱۰/۴۱۹) اسی طرح محمد بن صالح التمار (ف ۱۶۸ھ) کے بارے میں حافظ ابن حجر نے ابو الزناد (ف ۱۳۰ھ) کا قول نقل کیا ہے "ان اردت المغازی صحیحة فعلیك بمحمد بن صالح التمار (اگر تم صحیح و معتبر مغازی کے طلب گار ہو تو ہمیشہ محمد بن صالح التمار کے ساتھ لگے رہو) (تہذیب التہذیب ۹/۲۲۶) اسی طرح جب امام زہری سے محمد بن اسحاق (ف ۱۵۱ھ) کی "کتاب المغازی" کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا "هذا اعلم الناس بها" (یہ مغازی کے سب سے بڑے واقف کار ہیں) (تاریخ بغداد ۱/۲۱۹) معمر بن راشد (ف ۱۵۳ھ) صاحب کتاب المغازی کی توثیق کے بارے میں بھی ائمۂ حدیث نے اتفاق رائے ظاہر کیا ہے (تہذیب التہذیب ۱۰/۲۴۲-۲۴۳)۔

متذکرہ بالا سیرت نگار اور ان کے مجموعہ ہائے سیرت ابتدائی عہد سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے بارے میں جو اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ بھی علماء متقدمین کے ہیں۔ لہٰذا مولانا اصلاحی کا یہ فرمانا کہ "سیرت کے اوّلین مجموعوں کے بارے میں علماء متقدمین کا وہی فیصلہ ہے جو مولانا شبلی کا ہے"۔ خلاف واقع ہے۔ سلسلۂ زیر بحث میں مولانا عبد الرؤف صاحب دانا پوری، مصنف "اصح السیر" کا درج ذیل بیان بھی

ہمارے موقف کی تائید کرتا ہے: "یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اصحاب سیر اور اصحاب حدیث واقعی دو جماعت نہیں ہیں، جتنے اصحاب سیر ہیں وہ اصحاب حدیث ہیں۔ اور جتنے اصحاب حدیث ہیں وہ اصحاب سیر بھی، مگر جب سیرت پر ان کو واقعات جمع کرنے پڑتے ہیں تو اس کے شرائط اور وجوہ میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔" (اصح السیر، رحیمیہ دیوبند، ص ۱۰)۔

ہم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی نے "واقدی کو کذاب و وضاع بتا کر ان کے اصل مرتبے سے فرو تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔"

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں "مولانا شبلی نے سیرت کے مقدمے میں واقدی کی تصویب و تضعیف پر مشتمل دونوں ہی قسم کے اقوال جمع کر دیئے ہیں ... خود مولانا شبلی کا رجحان یہی ہے کہ واقدی کذاب اور دروغ گو تھا اور اس کی تائید بعد کے سیرت نگاروں نے بھی کی ہے۔ واقدی کے وہی لوگ قائل ہیں جو مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہیں۔"

جواباً عرض ہے کہ فاضل مضمون نگار کو سہو ہوا، کیوں کہ "مقدمہ سیرت" میں علامہ شبلی نے واقدی کی تصویب و توثیق کا ایک قول بھی نقل نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس قسم کے جملے تحریر فرماتے ہیں۔ "واقدی کو محدثین اعلانیہ کذاب کہتے ہیں۔" "واقدی کی دروغ بیانی مسلمۂ عام ہے۔" وغیرہ۔ حالانکہ یہ بیانات اپنے عموم و اطلاق کے لحاظ سے خلاف واقعہ ہیں۔

ثانیاً واقدی اگرچہ حدیث میں ضعیف و غیر معتبر ہیں، لیکن سیرت کے باب میں ان کی عظمت و اہمیت مسلم اور بعض شرائط کے ساتھ ان سے اخذ و استفادہ جائز ہے، اس سلسلے میں ذیل کی تصریحات قابل ذکر ہیں:

علامہ ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" میں تحریر فرماتے ہیں: "وھو من اوعیة العلم لکنه لا یتقن الحدیث، وھو راس فی المغازی و السیر ویروی عن کل ضرب" (وسعت معلومات کے لحاظ سے) (وہ علم کا ظرف ہیں، لیکن حدیث میں ناپختہ ہیں۔ مغازی و سیر کے امام ہیں اور ہر طرح کی روایات نقل کرتے ہیں) (تذکرۃ الحفاظ ۱/۳۴۸)۔

حافظ ابن حجر "تلخیص الحبیر" میں لکھتے ہیں: "والواقدی اذا لم یخالف الاخبار الصحیحة

ولا غيره من اهل المغازی، مقبول فی المغازی عند اصحابنا" (واقدی جب احادیث صحیحہ، اور دوسرے اہل مغازی کی مخالفت نہ کریں تو مغازی کے سلسلے میں ہم محدثین کے یہاں مقبول ہیں (تخلیص الحبیر مطبع انصاری، دہلی ص ۲۴۲)۔

علامہ ابن تیمیہ "الصارم المسلول" میں رقمطراز ہیں: "مع ما فی الواقدی من الضعف.... لا یختلف اثنان ان الواقدی من اعلم الناس بتفاصیل امور المغازی واخبرهم باحوالها، وقد کان الشافعی واحمد وغیرهما یستفیدون علم ذالك فی کتبه" (واقدی کے ضعف کو تسلیم کرنے کے باوجود... کوئی دو شخص اس باب میں اختلاف نہیں کر سکتے کہ واقدی امور مغازی کے سب سے بڑے عالم اور اس کے احوال سے سب سے زیادہ باخبر ہیں، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ بھی مغازی کے سلسلے میں واقدی کی کتابوں سے استفادہ کرتے رہتے تھے) (الصارم المسلول، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ص ۰۹)۔

مولانا یوسف بنوری تحریر فرماتے ہیں: "قد ذکر الحافظ فی التلخیص فی غیر موضع علی انهم اتفقوا ان قول الواقدی حجة فی السیر والمغازی کلها" (حافظ ابن حجر نے "تلخیص الحبیر" میں متعدد موقعوں پر یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ سیر ومغازی کے سلسلے میں واقدی کا قول حجت ہے) (معارف السنن ۱/۲۲۶)۔

علامہ شوق نیموی "آثار السنن" میں لکھتے ہیں: "والواقدی وان کان مجروحا عند المحدثین فی الحدیث، لکنه راس فی المغازی والسیر" (واقدی اگرچہ محدثین کے یہاں حدیث کے باب میں مجروح ہیں، لیکن مغازی وسیر کے امام ہیں) (آثار السنن دارالاشاعت، کلکتہ ص ۷)۔

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری لکھتے ہیں: "والواقدی حکم علیه ابن حجر بانه متروك الحدیث ومع ذلك فانه لخص مغازیه لنفسه، فکان یحتفظ بها، ونقل اقوال الواقدی فی الاخبار المتعلقة باحداث السیرة فی مولفاته کالاصابة وفتح الباری، ولا شك ان اهمال کل المعلومات التی ذکرها الواقدی وابن زبالة وامثالهما خسارة کبیرة، لغزارتها و قیمتها التاریخیة الکبیرة، ولا شك ایضا انه لایمکن التعویل علیهما وعلی امثالهما فی امور العقیدة والشریعة، ولکن من التعسف الذی لامبرر له ان نرفض الاخبار التی

ردوھاجملة بحجة انہامتروکان فی الحدیث"۔ رابن حجر نے واقدی پر متروک الحدیث ہونے کا حکم لگایا ہے، اس کے باوجود انھوں نے 'مغازی واقدی' کی اپنے لئے تلخیص تیار کی اور ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے واقعاتِ سیرت سے متعلق روایات کے ضمن میں واقدی کے اقوال بھی اپنی تصنیفات مثلاً اصابۃ اور فتح الباری وغیرہ میں جا بجا نقل کئے ہیں۔ بلاشبہ واقدی، ابن زبالۃ اور ان جیسے راویوں کے یہاں مذکور تمام معلومات کو بیکار سمجھ کر نظر انداز کر دینا بہت بڑے خسارے کی بات ہے۔ کیونکہ یہ معلومات (کمیت کے لحاظ سے) بہت زیادہ اور (کیفیت کے لحاظ سے) غیر معمولی تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عقائد اور دینی امور کے سلسلے میں واقدی وابن زبالۃ اور ان جیسے راویوں پر تنہا اعتماد نہیں کیا جا سکتا، لیکن انھیں متروک الحدیث قرار دے کر ان کی تمام روایات کو یکسر رد کر دینا بھی ایک ایسا ظلم ہوگا، جس کے لئے کوئی وجہ جواز موجود نہیں)۔

(منتخب من کتاب ازواج النبی، لابن زبالۃ، طبع اوّل ص ۱۲)

کیا ان تمام ائمہ کبارؒ اور علمائے عظام کو مستشرقین سے متاثر قرار دے کر ان کی راویوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

ہمارے مقالے کا ایک مستقل باب "شبلی کی سیرۃ النبی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" بھی ہے، اس باب میں ہم نے ایک طرف علامہؒ موصوف کی اس تصنیف کے مثبت پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ کتاب اس عہد کی یادگار ہے جب کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا ذہن مستشرقین کی کتب سیرت کے مطالعے سے مسموم ہوتا جا رہا تھا اور اس کے دل میں نعوذ باللہ آنحضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں، اس وقت علامہؒ موصوف کی اس کتاب نے ایک پوری نسل کو ذہنی ارتداد سے بچا لیا۔ اسی طرح ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ حسنِ انشا، زورِ بیان، ترتیب مقدمات، اور تمہید دلائل وغیرہ مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے اپنے عہد کی دوسری کتب سیرت مثلاً "خطبات احمدیہ" "تنقید الکلام فی احوال شارع الاسلام اور رحمۃ للعالمین" وغیرہ کے مقابلے میں "سیرۃ النبی کو بدرجہا فوقیت و فضیلت حاصل ہے اور یہی نہیں بلکہ اس عہد کی تصانیف سیرت میں عربی یا فارسی زبان کی کوئی دوسری کتاب بھی متذکرہ بالا خوبیوں کے لحاظ سے اس کی حریف و مدِّمقابل قرار نہیں دی جا سکتی۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم نے دوسری طرف عبداللطیف اعظمی، اختر وقار عظیم اور شیخ محمد اکرام کے اس دعوے کی تردید بھی کی ہے کہ "سیرۃ النبی، کی نظیر عربی، فارسی بلکہ دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں" اور

یہ کہ آج تک "سیرۃ النبی" سے زیادہ محققانہ، عمدہ اور جامع المعلومات کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں لکھی گئی ہے"۔ اور یہ کہ "اس کی مثال عالم اسلامی کے ادب میں مشکل سے ملیگی"۔ پھر بتایا ہے کہ وسعت معلومات، جامعیت اور محققانہ ژرف نگاہی وغیرہ کے لحاظ سے ابن القیم کی " زادالمعاد"، زرقانی کی "شرح مواہب" اور قاضی عیاض کی "الشفاء" وغیرہ "سیرۃ النبی" سے بدرجہا فائق و برتر ہیں۔

اس کے بعد ہم نے یہ بھی لکھا ہے کہ "سیرۃ النبی" چونکہ مستشرقین کے اعتراضات و اشکالات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، لہٰذا اس کی اصل قدر و قیمت متکلمانہ اور پھرادیبانہ ہے، کیونکہ اس میں متعدد جگہ مستشرقین کے اعتراضات سے بچنے کے لئے بعض مستند واقعات سیرت حذف کر دیئے گئے ہیں یا ان کی صحت سے انکار کیا گیا ہے، یا جمہور امت کے موقف سے ہٹ کر ان کی تاویل و توجیہہ کی کوشش کی گئی ہے، پھر اس دعوے کی وضاحت کے لئے ہم نے بعض مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

مولانا اصلاحی کو مقالے کے ان مندرجات سے سخت تکدر اور ناراضی ہے، چنانچہ موصوف نے ہم پر بہت سے اعتراضات وارد اور متعدد الزامات عائد فرمائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ "سیرۃ النبی" جب مستشرقین کے بے سروپا الزامات رفع کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، اور اس میں وہ کامیاب ہے تو بعض دوسری حیثیتوں سے اس پر بحث و تنقید کی کیا ضرورت ہے؟ زادالمعاد، شرح مواہب اور الشفاء وغیرہ سے اس کا موازنہ کیوں کیا گیا؟ "سیرۃ النبی" کی بقیہ جلدیں جو علامہ سید سلیمان ندوی کے محققانہ قلم کا نتیجہ ہیں، اس بحث میں انھیں بھی پیش نظر کیوں نہیں رکھا گیا؟

جواباً عرض ہے کہ کسی بھی تصنیف کے علمی و تحقیقی جائزے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر پہلو سے اس پر گفتگو کی جائے، اسی طرح اگر کسی تصنیف کو اپنے موضوع پر علی الاطلاق سب سے بہتر جامع المعلومات اور محققانہ ثابت کیا جا رہا ہو تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس موضوع کی دوسری کتابوں کا ذکر کر کے اس کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔ آخری اشکال کا جواب یہ ہے کہ مقالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ بحیثیت سیرت نگار علامہ شبلی کا درجہ متعین کرنے کے لئے لکھا گیا ہے، سید صاحب کی تصنیف کردہ سیرت کی جلدوں کا زیر بحث لانا ہمارے مقالے کا موضوع نہیں تھا۔

سلسلۂ زیر بحث میں مولانا اصلاحی کے الزامات کی نوعیت یہ ہے "مقالے میں غلط اور بے بنیاد مقدمات کے ذریعے غلط اور بے بنیاد نتائج برآمد کئے گئے ہیں"۔ مولانا شبلی پر متعدد اور گوناگوں الزام تراشیاں

کی گئی ہیں۔ سیرۃ النبی جیسی مقبول، جامع اور محققانہ کتاب کو پایۂ اعتبار سے ساقط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ان الزامات کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں، ان کا سبب اور منشا ایک خاص ذہنیت کے تحت مقالہ اور مقالہ نگار کی نسبت غلط فہمی اور بد گمانی ہے۔ آئندہ مباحث سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔

ہم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی مستشرقین کے اشکالات سے بچنے کے لئے بعض اوقات صحیح اور مستند روایات کی صحت سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کی مثال میں صحیح بخاری کی وہ روایت پیش کی تھی جس میں غارِ حرا میں حضرت جبریلؑ کی آمد، ابتدائے وحی کی کیفیت، اضطراب وخوف کے عالم میں گھر کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی، حضرت خدیجہؓ کی تسکین وتسلی، ورقہ بن نوفل کی تصدیق و اعتراف اور فترتِ وحی کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حزن وملال کی کیفیات مذکور ہیں۔ اس روایت کے بارے میں ہم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی نے اس کو امام زہری کے "بلاغات" میں شمار کرتے ہوئے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔

مولانا اصلاحی ہمارے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے، موصوف فرماتے ہیں کہ علامہ شبلی نے "سیرۃ النبی" میں کہیں بھی اس پوری روایت کے بارے میں یہ نہیں کہا ہے کہ یہ امام زہری کے بلاغات میں سے ہے بلکہ وہ تو صرف روایت کے آخری جزو کو "بلاغاتِ زہری" میں شمار کرتے ہیں، جس کی تصریح خود شارحین بخاری نے بھی کی ہے۔

جواباً عرض ہے کہ مولانا موصوف کا یہ خیال درج ذیل وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہے:

(الف) علامہ شبلی نے جس اشکال سے بچنے کے لئے روایت کو "بلاغات زہری" میں قرار دیا ہے اس کا تعلق پوری روایت سے ہے، نہ کہ اس کے جزوِ اخیر سے، چنانچہ اشکال کی تقریر کرتے ہوئے علامہ شبلی خود تحریر فرماتے ہیں:

"حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصۂ اوّل کی شرح میں معترضین کا اعتراض نقل کیا ہے کہ ایک پیغمبر کو نبوت میں کیوں کر شک ہو سکتا ہے؟ اور ہو تو کسی عیسائی کے

تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے؟ پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ نبوت ایک امر عظیم ہے۔ اس کا تحمل دفعتاً نہیں ہو سکتا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب کے ذریعے سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعتاً فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے۔ حضرت خدیجہ نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ بن نوفل نے تصدیق کی تو آپ کو پورا یقین ہو گیا۔ محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں" فلما سمع کلامه أيقين بالحق واعترف" جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آگیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا۔ محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔"

اشکال اور جواب کی اس تقریر پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی کے پیشکردہ اشکال کا تعلق پوری روایت سے ہے، ورنہ اشکال اور اس کے جواب میں کوئی مطابقت نہ رہے گی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے "رویائے صادقہ" دفعتاً فرشتے کا نظر آنا، بہ تقاضائے بشریت آپ کا خوف زدہ ہو جانا، حضرت خدیجہ کی تسکین اور ورقہ کی تصدیق ان تمام امور کا روایت کے جزو اخیر میں کوئی ذکر نہیں۔ وہاں تو صرف فترتِ وحی کے دوران آپ کے غایت حزن و ملال اور فرشتے کی جانب سے تسکین و تسلی کا بیان ہے۔

اب اگر محدثِ مذکور کے اس جواب کو تسلیم نہ کرتے ہوئے علامہ شبلی کے نظریے کے مطابق اشکال کا دفعیہ اس طرح کیا جائے کہ "یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے"۔ تو لازمی طور پر اس سے پوری روایت مراد ہو گی نہ کہ اس کا جزو اخیر۔ کیونکہ اشکال جس مضمون پر قائم ہے، اس کا تعلق پوری روایت سے ہے۔

(ب) خود علامہ شبلی کی عبارات میں متعدد ایسے اشارے موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے پوری روایت کو ذہن میں رکھ کر اس پر کلام کیا ہے، نہ اس کے جزو اخیر کو۔ عبارتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) "حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصہ اوّل کی شرح میں معترضین کا اعتراض نقل کیا ہے۔"

(۲) "کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں بھی کبھی شک ہوا تھا۔"

(۳) "ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ خود اصل روایت بہ سندِ مرفوع متصل ہے یا نہیں۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ کے ذہن میں "حدیث کا حصہ اوّل"

اور "ابتدائے وحی کا واقعہ ہے لہذا وہ "اصل روایت" پر کلام کرتے ہوئے اسے "بلاغات زہری" میں سے قرار دے رہے ہیں۔

(ج) مولانا اصلاحی لکھتے ہیں: "مولانا شبلی نے ابتدائے وحی کے متعلق صحیح بخاری کی روایت کا انکار نہیں کیا ہے۔ اس کے "باب التعبیر" میں مذکور روایت کے ایک خاص جزو کو امام زہری کے بلاغات میں قرار دیا ہے جس کی تصریح حافظ ابن حجر وغیرہ شارحین بخاری نے بھی کی ہے۔"

سوال یہ ہے کہ اگر علامہ شبلی وہی بات کہنا چاہتے ہیں جو حافظ ابن حجر اور دیگر شارحین بخاری پہلے ہی کہہ چکے ہیں تو علامہ موصوف کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں ۱؍۲۹" معلوم ہوا کہ علامہ موصوف حافظ ابن حجر وغیرہ سے ہٹ کر کوئی بات کہنا چاہ رہے ہیں اور وہ ہے "اصل روایت" کے رفع واتصال سے انکار، نہ کہ اس کے جزو اخیر سے۔

سلسلۂ زیر بحث میں مولانا اصلاحی نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ کسی روایت کو زہری کے بلاغات میں سے قرار دیتے ہوئے علامہ شبلی کا یہ فرمانا کہ "ایسے عظیم الشان واقعے کے لئے سند مقطوع کافی نہیں" اس روایت سے انکار کو مستلزم نہیں۔

جواباً عرض ہے کہ مولانا کا یہ خیال نہایت معصومانہ ہے، کیونکہ جب یہ کہہ دیا گیا کہ ایسے عظیم الشان واقعے کے لئے سندِ مقطوع کافی نہیں، تو لامحالہ اس کا مطلب یہی ہوا کہ واقعے کے ثبوت اور اس کی صحت سے انکار کیا جا رہا ہے۔

ہم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی حدیث مذکور پر وارد کئے گئے اعتراض کے سلسلے میں "حافظ ابن حجر کے جواب سے مطمئن نہیں، ان کے نزدیک اشکال بہ دستور قائم ہے۔"

مولانا اصلاحی تحریر فرماتے ہیں: "مولانا شبلی حافظ ابن حجر کے جواب سے چاہے مطمئن ہوں یا نہ ہوں لیکن کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیر بحث حدیث سے جو نتیجہ مولانا شبلی نے نکالا ہے وہی نتیجہ خود حافظ ابن حجر نے بھی نکالا تھا، یعنی نبوت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شک و تردد ظاہر کرنا۔"

جواباً عرض ہے کہ اول تو زیر بحث اشکال خود حافظ ابن حجر کا نہیں، بلکہ وہ اسماعیلی کے حوالے سے محض اس کے ناقل ہیں۔ ثانیاً خود اسماعیلی نے اسے "بعض طعنہ زنوں کی ملمع سازی" قرار دیتے ہوئے نقل فرمایا ہے اور پھر اس کا جواب دیا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر "فتح الباری" کی عبارت یہ ہے: "قال الاسماعیلی موہ بعض الطاعنین علی المحدثین فقال، کیف یجوز للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یرتاب فی نبوتہ" اھ۔ (اسماعیلی کہتے ہیں محدثین کے خلاف بعض طعنہ زنوں نے ملمع سازی کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ کس طرح جائز ہے کہ آپ اپنی نبوت میں شک فرمائیں۔ اھ)۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حافظ ابن حجر کے نقل کردہ جواب سے علامہ شبلی کے عدم اطمینان کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں اسماعیلی کے جواب کی عبارت کے ترجمے میں ایک مقام پر سہو ہوا، جس کی بنا پر علامہ موصوف نے اس جواب کو غیر تشفی بخش قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں"۔ وہ عبارت یہ ہے: "فلما سمع کلامہ أیقن بالحق واعترف" مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اس سہو کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

"سمع یقین اور اعتراف کی تمام ضمائر ورقہ کی طرف راجع ہیں، علامہ شبلی نے تمام ضمائر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع سمجھ کر اس کا ترجمہ اس طرح کیا، جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آگیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا حالانکہ اسکا صحیح ترجمہ یوں ہے، جب ورقہ نے آپ کا کلام سنا تو ورقہ کو حق کا یقین آگیا اور انھوں نے اس کا اعتراف کیا، علامہ شبلی نے یہ سمجھا کہ حضور پر نور کو اپنی نبوت و رسالت میں شک تھا، ورقہ کے کہنے سے آپ کو اپنی نبوت کا یقین آیا، علامہ شبلی کا یہ خیال بالکل غلط ہے، حضور پر نور کو اپنی نبوت و رسالت کا اول ہی میں علم اور یقین حاصل ہو گیا تھا"

(سیرۃ المصطفیٰ ۱/۱۴۰)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ کہ بعض اشکالات سے بچنے کے لئے علامہ شبلی نے صحیح بخاری کی زیر بحث روایت کو "بلاغاتِ زہری" میں سے قرار دیتے ہوئے اس کے رفع و اتصال اور صحت سے انکار کیا ہے، غلط اور بے بنیاد نہیں۔ (بقیہ آئندہ)

نئی کتابیں

علم رجال الحدیث (عربی) از ڈاکٹر مولانا تقی الدین صاحب ندوی، صفحات ۲۱۲، طباعت عمدہ ٹائپ، ناشر مکتبۃ الفردوس مکارم نگر، لکھنؤ۔

مولانا تقی الدین صاحب ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء اور ہندوستان کی دوسری مشہور درسگاہوں میں حدیث کے اونچے استاد رہ چکے ہیں اور اس وقت العین یونیورسٹی ابوظبی میں حدیث کے استاد ہیں۔ یہ عربی و اردو میں نصف درجن سے زیادہ علمی و تحقیقی کتابیں لکھ چکے ہیں اور بذل المجہود شرح ابی داؤد جیسی اہم کتاب ان ہی کی نظر ثانی اور حواشی کے ساتھ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

ان کی علمی اور تحقیقی کتابوں میں ایک اہم کتاب "علم رجال الحدیث" بھی ہے۔ یہ فن مسلمانوں کا ایسا امتیاز ہے، جس سے دنیا کی مذہبی تاریخ خالی ہے۔ فن حدیث پر دو حیثیتوں سے بحث ہوتی ہے۔ ایک متن کی حیثیت سے دوسرے سند کی حیثیت سے۔ مگر متن کی صحت اور عدم صحت کا دارومدار اسی سلسلۂ سند پر ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقریرات کو جن لوگوں نے بیان کیا ہے خود ان کا اخلاق کیسا تھا اور ان کا علم، ذہنی صلاحیت اور قوت حفظ کیسی تھی، اس طرح علمائے امت نے نہ صرف آپ کے ارشادات اور اسوہائے حسنہ کو محفوظ کیا بلکہ ان روایت کرنے والوں کے حالات بھی قلمبند کر دیئے۔

ان روایت کرنے والوں کے مختلف طبقات ہیں۔ سب سے پہلا طبقہ صحابہ کا ہے، صحابہ کے بارے میں علمائے امت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" یعنی صحابہ کوئی ایسی بات از خود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کر سکتے جو آپ نے نہ فرمائی یا نہ کی ہو یا کسی چیز کو پسند نہ فرمایا ہو، اسی طرح صحابہ سے بہ تقاضائے بشریت جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ اس پر قائم نہیں رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اپنی رضا کا اظہار کر دیا ہے "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" اس لئے ان پر کوئی جرح نہیں ہو سکتی لیکن صحابہ میں بھی سارے صحابہ ایک درجے کے نہیں تھے اس لئے ائمہ حدیث نے ان کے درمیان بھی درجات قائم کئے۔

صحابہ کے بعد تابعین اور ان کے بعد کے عہد میں روایت کرنے میں وہ احتیاط اور وہ معیار باقی نہیں رہا جو صحابہ کے زمانہ میں تھا اور درجہ بدرجہ یہ انحطاط بڑھتا رہا، اس لئے ائمہ حدیث نے اس کے اصول مقرر کئے اور اس کے لئے ایک مستقل فن اصول حدیث کے نام سے وجود میں آیا جس پر بے شمار کتابیں ائمہ حدیث نے لکھیں۔ اسی طرح حدیث نبوی کے ہزاروں راویوں کے حالات اور اخلاق و کردار کو جانچنے اور ان کا درجہ مقرر کرنے کے لئے فن رجال و طبقات وجود میں آیا جس پر درجنوں ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔

غرض یہ کہ حدیث نبوی کی سند و متن کی صحت اور عدم صحت کو جانچنے کے لئے ائمہ حدیث نے جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے نام سے جو عظیم الشان فن کی تدوین کی اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی اور نہ کسی نبی یا مصلح کے اقوال و افعال کی ان کی طرف نسبت کی صحت و عدم صحت معلوم کرنے کا یہ اہتمام تاریخ انسانی میں کہیں نظر آتا ہے۔

مولانا تقی الدین صاحب ندوی نے اس کتاب میں اس فن کے ہر پہلو پر جامع طور پر بڑی تحقیق سے گفتگو کی ہے، اس کتاب کے پڑھنے کے بعد نہ صرف اس فن کے ہر پہلو پر نظر ہو جاتی ہے بلکہ اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ ذخیرہ ائمہ حدیث نے مختصر طور پر فراہم کیا ہے ان سب کا پورا تعارف بلکہ خلاصہ اس کے ذریعہ قاری کو ہو جاتا ہے گویا اس کتاب میں اس فن کی پوری تاریخ آگئی ہے۔

اس فن پر جو کتابیں اس سے پہلے لکھی گئی ہیں وہ سب عربی میں ہیں اس لئے مولانا نے وہ عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر اس سلسلہ میں دار المصنفین نے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے حالات اور ان کے اسوۂ حسنہ پر اردو زبان میں جو قیمتی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اس کا ذکر بھی آجاتا تو بہتر تھا۔

خدا کرے ان کی یہ کتاب عند الناس اور عند اللہ دونوں جگہ مقبول ہو۔

جدید میڈیکل مسائل فقہ اسلامی کی روشنی میں

از مولانا برہان الدین سنبھلی
ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ

ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ صفحات ۷۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مجلس تحقیقات اسلامی، مسجد اجالے شاہ سعید آباد، حیدرآباد، ۵.... ۵۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے فقہائے کرام رحمہم اللہ کو کہ انھوں نے اپنی خداداد بصیرت سے فقہ اسلامی کا ایسا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو جدید سے جدید دور میں بھی انشاء اللہ قیامت تک امت کی راہنمائی کرتا رہیگا یہ ذخیرہ ایجاد بندہ نہیں بلکہ انھوں نے اسے قرآن وسنت اور تعامل امت کی روشنی میں فراہم کیا ہے۔

جدید تہذیب نے اسوقت انسانی زندگی کیلئے سیکڑوں حرام وحلال کے ایسے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جنکا وجود نہ تو اس سے پہلے تھا اور نہ انسانی زندگی میں انکی کوئی اہمیت تھی مگر اب اس تہذیب نے انھیں ایک ضرورت بنا دیا ہے اور جو لوگ حرام وحلال کی حدود سے باہر نہیں جانا چاہتے ان کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

اب یہ موجودہ دور کے علماء کا کام ہے کہ وہ نئے مسائل کے سلسلہ میں کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کے حلال وحرام ہونے کا دوٹوک جواب دیں۔

مولانا برہان الدین صاحب نے اس کتابچہ میں ایسے ہی بہت سے مسائل کے سلسلہ میں فقہ اسلامی کی روشنی میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ مثلاً اعضاء کی پیوندکاری، ٹسٹ ٹیوب سے تولید، جانوروں کے جسم پر میڈیکل تجربات، ضبط ولادت اور اس کی مختلف صورتیں، مایوس العلاج مریضوں کے لئے مہلک ادویہ، الکوحل کی مخلوط ادویہ، پلاسٹک سرجری اور انسانی دودھ کی خرید وفروخت وغیرہ۔

بحمد اللہ ان میں سے بہت سے مسائل کے سلسلہ میں راقم الحروف اپنی کتاب اسلامی فقہ میں آج سے بیس برس پہلے فقہ اسلامی کی روشنی میں اپنی رائے دے چکا ہے مگر مولانا برہان الدین صاحب نے ان مسائل پر جس تحقیق سے گفتگو کی ہے اس تفصیل تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ گویا مولانا برہان الدین صاحب نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف عوام کی رہنمائی کی ہے بلکہ اس سے عوام سے زیادہ علماء اور خواص فائدہ اٹھائیں گے ان کی بعض روایوں سے یا اخذ نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن بہر حال اس موضوع پر کام کرنیوالوں کے لئے یہ کتاب راہنمائی کا کام کرے گی۔

مظاہر العلوم سہارنپور کا موجودہ قضیہ

اس سے پہلے راقم الحروف کو مظاہر العلوم کے موجودہ قضیہ کے سلسلہ میں جو تحریری اور زبانی اطلاعات موصول ہوئیں۔ ادارہ کی بہی خواہی کے پیش نظر اپنی رائے "الرشاد" ماہ مارچ ۱۹۸۸ء میں ظاہر کردی تھی، مگر ادھر مولانا سید شاہد صاحب کے ذریعہ ایک پمفلٹ "قیامتیں اور وضاحتیں" اور مولانا عبد الحفیظ صاحب کا مضمون پیام سنت میں "مظاہر العلوم کے سلسلہ میں مصالحتی کوشش کا انجام" کے عنوان سے نظر سے گذرا، پمفلٹ میں تو گفتنی و ناگفتنی ساری باتیں آگئی ہیں۔ مگر مولانا عبد الحفیظ صاحب کا مضمون پڑھ کر راقم الحروف پر افسوس اور ندامت دونوں کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ کیفیت دو ہفتہ گذرنے کے بعد بھی باقی ہے۔

ندامت تو اس بات کی کہ میں نے طرفین کے خیالات اور نظریات کی پوری تحقیق کئے بغیر ایک تحریر لکھ دی۔ گو یہ غلطی بحمد اللہ ادارہ کی محبت اور خلوص پر مبنی تھی مگر محض خلوص و محبت کی بنیاد پر اختلافات کے سلسلہ میں فیصلہ مناسب نہیں ہوتا جس کی ندامت ہے۔

اور افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے دینی طبقہ سے للّٰہیت اور بے نفسی کی جو توقع کی جاسکتی ہے وہ نظر نہیں آتی۔ مولانا عبد الحفیظ صاحب کے ایک ایک جملہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ واقعی اس قضیہ کو ختم کردینے کے لئے انتہائی بے چین تھے مگر اسی سبب سے ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔

ان کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مفتی مظفر صاحب کی ہر بات کو ماننے کے لئے تیار ہیں اور انھوں نے مدرسہ کے سرپرستوں کو بھی تیار کرلیا تھا مگر مدرسہ کی سابق تاریخ اور مدرسہ کو نااہلوں کی گرفت سے بچانے کے لئے دو باتوں کے مان لینے پر مفتی صاحب کو آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک مدرسہ کا رجسٹریشن دوسرے مجلس شوریٰ یا مجلس سرپرستان کی حیثیت۔ مگر مفتی صاحب نے دونوں چیزوں کو ماننے سے انکار کردیا۔

جہاں تک سرپرستوں اور مجلس شوریٰ کی حیثیت کی بات ہے اسے تسلیم کرنا نفسانیت اور انفراد بالمجد کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا، اس سلسلہ میں ایک مضمون "غیر شرعی دستور" کے نام سے ندائے دار العلوم میں مولانا مسیح اللہ صاحب مدظلہٗ کا نظر سے گذرا جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اصل حیثیت مجلس شوریٰ کی نہیں بلکہ مہتمم یا ناظم کی ہوتی ہے۔ یہ مضمون مدارس میں ملوکیت کو جنم دیگا اس لئے اس کی تردید کی ضرورت ہے، کیونکہ عہد نبوی اور عہد صحابہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی تفصیل کا موقع نہیں ہے

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سواد عراق کی زمینوں کے بارے میں جس بڑے پیمانہ پر صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا تھا وہ اس کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ باوجودیکہ ان کے پاس قرآن و سنت کے دلائل تھے مگر انھوں نے مشورہ ضروری سمجھا۔

اس لئے مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ انفراد بالمجد کی تاریخ نہ دہرائیں اور مجلس شوریٰ کو تسلیم کرلیں، امت میں سارے فتنے شورائیت کو نظر انداز کرنے ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسری چیز رجسٹریشن ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا کوئی مدرسہ اس وقت باقی نہیں ہے، جس نے اپنے کو رجسٹرڈ نہ کرالیا ہو۔ رجسٹرڈ کرائے بغیر ایسے معاملات میں جن کا تعلق حکومت سے ہو ان سے نمٹنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر رجسٹریشن کے بعد نا اہلوں کو مدرسہ میں دخل اندازی کا موقع نہیں ملتا۔ ادارہ کے اکاؤنٹ کے لئے بھی ضروری ہے کہ رجسٹریشن کرالیا جائے۔ شخصی ناموں سے اکاؤنٹ مناسب نہیں ہوتا۔

غرض یہ کہ راقم الحروف اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ مفتی صاحب اور ان کے رفقاء ان دونوں باتوں کو تسلیم کرلیتے تو شاید یہ قضیہ آسانی سے ختم ہو جاتا۔ اگر مفتی صاحب اور ان کے رفقاء کو یہ خطرہ ہو کہ اس کے بعد ان کی بالادستی باقی نہیں رہے گی تو ہم یہی کہیں گے کہ شخصی بالادستی کے مقابلہ میں اجتماعی بالادستی زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ شخصی بالادستی کے بطن سے نفسانیت اور انانیت پیدا ہوتی ہے جو اجتماعیت کو مجروح کرتی ہے، لیکن ان حضرات کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر صورت میں مفتی صاحب کی حیثیت کو باقی رکھنا چاہتے، بشرطیکہ مفتی صاحب بھی اپنے موجودہ موقف سے ہٹنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر آپ نہیں ہٹیں گے تو آپ کو ایسے عناصر سے مدد لینی پڑے گی بلکہ پڑ رہی ہوگی جو آپ کی دینی حیثیت کو مجروح کردیں گے۔

میں مفتی صاحب مدظلہٗ سے عرض کروں گا کہ وہ مظاہر العلوم کی سابق شاندار تاریخ کے روشن صفحات کو داغدار ہونے سے ضرور بچانے کی کوشش کریں۔ ورنہ اس سے اہل دین کے پورے طبقہ کی جگ ہنسائی ہوگی بلکہ ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے غیر مسلموں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو ہندوستان میں عربی مدارس کے قیام کو ملک کے اوپر بوجھ اور بے ضرورت سمجھتی ہے۔ ایک بار ایک بڑے ذمہ دار آدمی اور بڑے انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے سوال کیا کہ عربی مدارس کی اس ملک میں کیا ضرورت ہے اور اس سے ملک کو کیا فائدہ پہونچ رہا ہے؟ میں نے ان سے

(بقیہ ص۱۱ پر)

دارالتالیف والترجمہ کی چند تصنیفات

عبادت و خدمت | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر بھی اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادت پر ملتا ہے۔ (صفحات ۵۶، قیمت ۵۰/)

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں | یہ مولانا محترم کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے، جو طلبہ، اساتذہ اور عربی مدرسوں کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ قیمت ۵۰/

اسلامی فقہ | از مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ: اُردو زبان میں اسلامی مسائل پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر جتنی تحقیق اور تفصیل، خاص طور پر معاملات اور معاشرتی مسائل میں اس کتاب میں ملے گی، شاید وہ کسی دوسری کتاب میں نہ ملے، ہر مسئلہ کا اصل کتاب سے حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔

تبع تابعین (حصہ اول) | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو یہودی یا عیسائی تھے اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، ابتدا میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اس پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا دیباچہ بھی ہے، اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

اہل دل کی باتیں | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی مدظلہٗ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پُراثر اور پُرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ قیمت ۸/

فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل | یہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو "معارف" اعظم گڈھ میں شائع ہوچکے ہیں یا مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے ہیں، ان میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

مسئلہ کفائت | شادی بیاہ میں کن چیزوں کی برابری ہونی چاہیئے اور مسلمانوں میں برادریوں کی مصنوعی تقسیم، ان دونوں مسائل پر شرعی حیثیت سے مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی) قیمت ۱۵/

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڈھ۔ (یوپی)

Regd. No AZM / N. P. 42 / 84
Regd No R. N 38937 / 81
Phone — 2461
AGaust - September1986

Monthly Jameatur Rashad
Azamgarh (U.P.)



نومبر
۱۹۸۶

ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

مرتبہ

مجیب اللہ ندوی

ادارہ دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

دارالتالیف والترجمہ کی چند تصنیفات

عبادت وخدمت | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر بھی اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ (صفحات ۵۶، قیمت ۵/)

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں | یہ مولانا محترم کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے، جو طلبہ، اساتذہ اور عربی مدرسوں کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ قیمت ۵۰/ للعہ

اسلامی فقہ | از مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ: اُردو زبان میں اسلامی مسائل پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر جتنی تحقیق اور تفصیل، خاص طور پر معاملات اور معاشرتی مسائل میں اس کتاب میں ملے گی، شاید وہ کسی دوسری کتاب میں نہ ملے، ہر مسئلہ کا اصل کتاب سے حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔

تبع تابعین (حصہ اول) | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

اہل کتاب صحابہ وتابعین | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو یہودی یا عیسائی تھے اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، ابتدا میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اس پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا دیباچہ بھی ہے، اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

اہل دل کی باتیں | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پُراثر اور پُرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ قیمت ۱۵/

فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل | یہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو "معارف" اعظم گڈھ میں شائع ہوچکے ہیں یا مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے ہیں، ان میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

مسئلہ کفائت | شادی بیاہ میں کن چیزوں کی برابری ہونی چاہیئے اور مسلمانوں میں برادریوں کی مصنوعی تقسیم، ان دونوں مسائل پر شرعی حیثیت سے مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی) قیمت ۱۰/

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڈھ۔ (یوپی)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 25/=
خصوصی معاون 100/=
قیمت فی پرچہ 2/50

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
12/= $

جلد ۱۳ | نومبر سنہ ۱۹۸۶ء۔ مطابق ربیع الاوّل سنہ ۱۴۰۷ھ | شمارہ ۶۴

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

منیجر توسیع و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی

کاتب: شوکت علی دھوبیا املی روڈ۔ مئو۔
طباعت: افضل نعیمی پریس سعید روڈ۔ مئو۔

رشحات

راقم ایک سال سے مسلسل مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر مختلف پہلو سے لکھتا رہا ہے۔ خاص طور پر دستور بننے کے وقت یعنی سنہ ۱۹۵۰ء سے اب تک مسلم پرسنل لاء میں جو مداخلتیں ہوئی ہیں یا جس طرح اسے مجروح کیا گیا ہے ان سب کی تفصیل الرشاد میں آچکی ہے۔ اسپیشل میرج ایکٹ اور ہندو سکسشن ایکٹ سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء میں بنا تا تھا اور دفعہ ۱۲۵ سنہ ۱۹۷۳ء میں بنی مگر ان کے خلاف کوئی خاص ردِ عمل نہ تو عوام میں دکھائی دیا اور نہ خواص میں۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ بنا۔ اس کے بعد جلسوں میں مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر کچھ تقریریں ہوئیں اور کچھ تجویزیں پاس ہوئیں مگر سنہ ۱۹۸۵ء میں جب سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں فیصلہ دیتے ہوئے عدت کے بعد نان و نفقہ کا جو فیصلہ کیا اور پھر یہ سفارش کی کہ دفعہ ۴۴ کا پورے طور پر نفاذ کر دیا جائے۔ اس کے بعد مسلم پرسنل بورڈ کے ذمہ داروں کو پورا احساس ہوا کہ ان واقعات کے اثرات ہماری معاشرتی زندگی پر کیا پڑیں گے اور مسلم پرسنل لا پر وہ کتنے اثر انداز ہو رہے ہیں، چنانچہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے راہنماؤں اور دوسرے لوگوں نے اس سلسلہ میں زبردست تحریک چلائی، جس کے نتیجہ میں دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم ہوئی۔ اور اس کے اثرات کو ختم کرنے کیلئے ایک نئی دفعہ بنائی گئی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس سلسلہ میں دفعہ ۴۴ کو بھی اپنی جد و جہد میں شامل رکھا جاتا۔ اس لئے کہ شاہ بانو کیس کے فیصلہ میں جسٹس چوڑ صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ دفعہ ۴۴ کو پورے طور پر نافذ کر دیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارا سارا زور دفعہ ۱۲۵ کے اوپر رہا۔ اور ہم دفعہ ۴۴ جو سارے فتنے کی جڑ ہے اس سے صرف نظر کرتے رہے۔ بحمد اللہ راقم الحروف شروع سے اس پہلو پر ذمہ داروں کو توجہ زبانی اور تحریری طور پر دلاتا رہا ہے۔ اور اب دفعہ ۴۴ کے نفاذ کی گونج ایوان بالا میں شروع ہو گئی ہے اور سرمائی اجلاس میں اختیاری یکساں سول کوڈ کے نام سے یہ بل آنے والا ہے۔ ء حالانکہ مرکزی حکومت کے

ایک ذمہ دار وزیر مسٹر چدمبرم نے اپنے بیان میں یہ کہدیا ہے کہ "یکساں سول کوڈ" کی اصطلاح ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے اس لئے کہ ہندوستان میں مختلف اکائیاں مختلف تہذیب رکھنے والی بستی ہیں مگر حکومت دفعہ ۱۲۵ کی ترمیم کی تلافی کیلئے فرقہ پرستوں کی منہ بھرائی کرنا چاہتی ہے چاہے اس کے معنی کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر مسلمانوں کیلئے بہرحال یہ پریشانی پیدا کرے گی۔

اس سے پہلے ہم دفعہ ۴۴ کی وضاحت کر چکے ہیں۔ کہ دستور میں کچھ دفعات بنیادی حقوق (Fundamental rights) کے نام سے شامل ہیں اور کچھ راہنما اصول (Directive principles) کے نام سے۔ دفعہ ۴۴ راہنما اصولوں میں سے ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ آئندہ ہندوستان میں یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش کی جائے گی یکساں سول کوڈ کا مطلب یہ ہے کہ شادی بیاہ، نکاح وطلاق اور وصیت ووراثت سب میں یکساں قانون ہوگا، یعنی مسلم پرسنل لاء کی الگ کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ اصل اہمیت بنیادی حقوق کی ہوتی ہے اور راہنما اصول کا تعلق حکومت کے مزاج اور اس کے جذبات سے ہوتا ہے۔ یعنی اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ یکساں سول کوڈ سے کچھ طبقات کی حق تلفی ہوگی یا ان کے مذہبی قانون یا جذبات کو ٹھیس پہونچے گی تو وہ اسے روک سکتی ہے۔ اور اگر وہ چاہتی ہے کہ اس سے عارضی طور پر چاہے کچھ لوگوں کے جذبات مجروح ہوں مگر ملک کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اسے نافذ کرے تو وہ کر سکتی ہے۔

دفعہ ۴۴ کے نفاذ سے مسلمانوں کو گھبراہٹ اس لئے ہے یا نہیں ہونی چاہئیے کہ اس کیلئے پہلے سے اسپیشل میرج ایکٹ اور ہندو سکسیشن ایکٹ جسے ہندو کوڈ بل کہتے ہیں موجود ہے۔ جس نے اس کیلئے پہلے سے زمین ہموار کر رکھی ہے۔

ان وجوہ سے راقم الحروف کے نزدیک دفعہ ۴۴ کے نفاذ کے خلاف ہمیں اس سے زیادہ بلند آواز اٹھانی چاہئیے جتنی کہ ہم نے دفعہ ۱۲۵ کے ترمیم کیلئے اٹھائی تھی۔ مگر اس کے خلاف نہ تو مسلم پرسنل لا بورڈ میں کوئی حرکت دکھائی دے رہی ہے اور نہ مسلم پرسنل لاء کانفرنس کے اندر، مسلم پرسنل لاء کانفرنس سے متعلق بعض افراد نے دفعہ ۱۲۵ کے تحت سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف بڑی جذباتی تقریریں کیں۔ اور گرفتاری وغیرہ کے نعرے لگائے مگر اب وہ لوگ نہ جانے کس کوہ قاف میں چلے گئے ہیں کہ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے حضرات اصلاح معاشرہ پر تقریریں کر رہے

ہیں اور طلاق کے صحیح طریقہ پر پمفلٹ شائع کر رہے ہیں۔ مسلم پرسنل لاء کانفرنس کے ذمہ دار حضرات ہمیشہ منفی کام میں پیش پیش رہے ہیں مثبت کام کے سلسلہ میں ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے

یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

البتہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں کی خاموشی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔

راقم الحروف نے اگست وستمبر کے مشترکہ شمارہ میں لکھا تھا کہ اس وقت احترام شریعت کے تعلق سے مسلمانوں کے اندر جو عوامی بیداری پیدا ہو گئی ہے اس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ دار حضرات اور ان کی شخصی حیثیتوں کو بڑا دخل ہے۔ اب اگر مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا گیا تو ملت اسلامیہ ہندیہ کیلئے یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔ اور ہم اس شعر کے مصداق ہو کر رہ جائیں گے ؎

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر

یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

اس لئے ملت کے جسم سے بے عملی کے خار کو نکالنے کے ساتھ محمل کی تیز رفتاری کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے احقر کی گذارش ہے کہ آپ لوگ ایک بار پھر مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں یہ مطالبہ میمورنڈم کی شکل میں حکومت کو دے دیں کہ مسلم پرسنل لاء آزادی کے بعد اس گوشے سے مجروح ہوا ہے۔ اس لئے اسے کم از کم آزادی سے پہلے کی حیثیت میں باقی رکھا جائے، اس کیلئے لڑائی چاہے آپ کچھ دن بعد شروع کریں مگر عوام کو معلوم ہو جانا ضروری ہے کہ ہمارے رہنما اس طرف سے غافل نہیں ہیں۔

آزادی کے بعد فرقہ پرست طاقتوں نے جس میں حکومت کے افراد بھی کسی نہ کسی درجہ میں شامل ہیں مسلمانوں کی زبان وتہذیب، مسلم پرسنل لاء اور عبادت گاہوں کو ختم کرنے اور فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کے جانی ومالی نقصان کے ساتھ ان کی معاشی حیثیت کو برباد کرنے کی جو منظم کوشش کی ہے وہ ایک تاریخی حقیقت بن چکی ہے۔ مگر بہت سی خرابیوں کے باوجود بحمداللہ مسلمان ان روح فرسا صورت حال سے گھبرائے نہیں اور نہ انہوں نے منفی کاموں میں اپنا وقت برباد کیا۔

بلکہ انہوں نے زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی کوشش کی۔ اپنے مدارس اور مکاتب کے ذریعہ اردو زبان کو زندہ رکھا۔ اور اپنی تہذیبی خصوصیات کو اپنی دعوت اور تبلیغ کے ذریعہ باقی رکھنے کی جدوجہد وہ کر رہے ہیں۔ فسادات کے سلسلہ میں وہ اب موم کی گڑیا نہیں رہ گئے ہیں کہ جس طرح چاہیں فرقہ پرست طاقتیں انہوں مروڑ دیں بلکہ اب وہ ظالموں کا ہاتھ پکڑ لینے کی پوزیشن میں ہوتے جا رہے ہیں۔

ابھی راقم الحروف نے مہاراشٹر کا تین ہفتہ کا دورہ کیا تھا جس میں مجھے ہر جگہ مسلمان دینی و اخلاقی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مادی ترقی کیلئے وہ کوشاں نظر آئے، دوسرے صوبوں میں بھی بحمد اللہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی ان پھیلی ہوئی کوششوں کو یکجا کیا جائے۔ اور ان انفرادی کوششوں کو اجتماعی جدوجہد میں تبدیل کر دیا جائے ۔ تاکہ پوری ملت کو اس سے فائدہ پہونچ سکے۔

(بقیہ ص۲۲ کا)

شادی وغم کی تقریبات یا دعوت ولیمہ میں اگر کسی منکرہ شرعیہ کا احتمال ہوتا ہے تو شرکت نہیں کرتا اور اگر شریک ہونے پر اس کا علم ہوتا ہے تو خود اپنے کو اس سے بچنے کا اہتمام کر لیتا ہوں، صاحب خانہ کی دلشکنی یا توہین کے خیال سے اس وقت کچھ نہیں کہتا۔ اور ایسے موقع پر تبلیغ جائز بھی نہیں۔ بعد میں کسی موقع پر یا مجلس عام میں ضرور ایسے امور پر متنبہ کر دیا کرتا ہوں۔

پرتکلف اور قیمتی لباس مجھے کبھی پسند نہیں رہا ہمیشہ سادہ لباس پہنا۔ مگر صاف ستھرا رہنے کا ہمیشہ طبعًا اہتمام رہا۔

اسی طرح بستر اور دوسری استعمال کی چیزوں میں مجھے سادگی اور اختصار ہی بہت پسند ہے۔

(مآثر حکیم الامت)

الرشاد کے بارے میں

ناظرین الرشاد سے گذارش

بحمداللہ اب پرچہ بارہ سو کی تعداد میں شائع ہونے لگا ہے مگر اب بھی ہر ماہ تین چار سو روپے کا کتابت وطباعت کے سلسلہ میں خسارہ ہوتا ہے۔ ایک استاذ جو اس کی کتابت و طباعت کا اہتمام کرتے ہیں ان کو ہم اب تک کوئی الاؤنس نہیں دے رہے ہیں۔ مگر اب ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ناظرین الرشاد سے گذارش ہے کہ آپ اپنا بقایا چندہ روانہ فرماویں۔

اور دوسری گذارش یہ ہے کہ آپ میں سے چار پانچ سو آدمی اگر ایک ایک خریدار بنادیں تو ہمیں امید ہے کہ نہ صرف یہ کہ خسارہ پورا ہو جائے گا بلکہ ہم کارکنوں کو کچھ الاؤنس بھی دے سکیں گے۔

اگر رسالہ کو آپ مفید پا رہے ہیں تو ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس سلسلہ میں ہمارا تعاون ضرور کریں گے۔

شکیل احمد منیجر دارالتالیف وترجمہ۔ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

دوسری اور آخری قسط

مجیب اللہ ندوی

خطبۂ نکاح

ایک[1] اہم معاشرتی ہدایت

خدا نے تقویٰ اختیار کرنے اور اس سے ڈرنے کی بار بار جو تاکید کی ہے وہ ایک دن کے لئے نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کا سودا ہے، زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی اس سے ہم بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ اور پھر یہ تقویٰ زبان کا دو بول نہیں ہے بلکہ یہ قلب کی آواز اور دل و دماغ کی کسک کا نام ہے یہ کسک جب پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی ایک چھوٹی سی غلطی بھی کرتا ہے تو اس کی ٹیس اس کے دل کو محسوس ہو جاتی ہے اور کبھی صحیح کام کرنے میں بھی اسے خیال لگا ہوتا ہے کہ یہ کہیں غلط تو نہیں ہے، دوسری آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا و انتم مسلمون۔	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے۔ مگر اس حال میں کہ تم مسلمان رہو

جب کسی کے دل کے اندر اللہ کا خوف بیٹھ جاتا ہے تو اس کی زبان بھی اس کا ساتھ دیتی ہے، وہ زبان سے جو کچھ کہتا ہے وہی اس کے دل میں ہوتا ہے، جو اس کے دل میں ہوتا ہے اس کی زبان وہی بولتی ہے اگر اس کے قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہیں ہے تو اسی کا نام نفاق ہے جس طرح اللہ قلب و زبان کی ہم آہنگی کو پسند کرتا ہے، اسی طرح اس کی دورنگی کو ناپسند کرتا ہے اس خطبہ کی

---

[1] تسلسل کے لئے اگست ستمبر کا شمارہ دیکھیں۔

تیسری آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولو قولاً سدیداً۔ — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور زبان سے درست بات کہو۔

گویا ایک نوجوان جوڑا جب زبانی ایجاب و قبول کے ذریعہ عقد نکاح میں بندھتا ہے تو یہ ایجاب و قبول اس کی زبان کے صرف دو بول نہیں ہوتے، بلکہ یہ ایک عہد و پیمان ہوتا ہے۔ اس بڑی ذمہ داری اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کے اس عہد و پیمان میں دونوں اگر درست نہ رہیں گے، اور ان میں ہر ایک اپنے فرائض کا اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال نہیں رکھے گا تو اس سے زندگی میں ناخوشگواری اور بدمزگی ہوگی، اور اگر یہ دونوں اس عہد و پیمان پر یکساں طور پر استوار رہیں گے تو یہی نہیں کہ زندگی خوشگوار ہوگی بلکہ خدا تعالیٰ ان کے دوسرے معاملات کو بھی درست فرما دے گا اور ان میں آسانیاں پیدا کر دے گا اور اس کی ادائیگی میں اتفاق سے اگر کوئی کوتاہی ہو جائے گی تو وہ معاف فرما دے گا، گویا زبان و قلب کی ہم آہنگی معاملات کی درستگی کی بھی ضامن ہے اور اس تعلق کی خوشگواری اور ناخوشگواری براہ راست اللہ کی خوشی و ناخوشی اور آخرت میں کامیابی و ناکامی سے بھی وابستہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں "یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولو قولاً سدیداً" کے بعد کہا گیا ہے کہ:

یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم۔ — اللہ تعالیٰ تمہارے معاملات درست فرما دے گا اور تمہاری غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔

یہی زبان و قلب کی ہم آہنگی خود اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں بھی مطلوب ہے اور اسے قرآن نے "فوزاً عظیماً" کہا ہے یعنی یہ بہت بڑی کامیابی ہے، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت جس طرح عبادت میں مطلوب ہے اسی طرح زندگی کے ہر موڑ اور سارے معاملات میں مطلوب ہے، اس مطالبہ سے نہ غم کی حالت آزاد ہے اور نہ خوشی کا موقعہ باہر ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ خطبۂ نکاح میں جو آیتیں پڑھی جاتی ہیں، ان میں کتنی معنویت ہے اور ان میں کتنی اہم ہدایتیں دی گئی ہیں، اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ خطبہ کے ابتدائی جملوں اور قرآن کی آیات سے متعلق تھا اس سلسلہ میں چند احادیث نبوی بھی پڑھی

جاتی ہیں یا پڑھی جانی چاہئیں، جن سے نکاح کے مقاصد اور اس کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

حدیث میں ہے:

النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی [1]

آپ نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے جو اس سے روگردانی کرے گا وہ میرا امتی نہیں ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

ان اعظم النکاح برکۃ الیسرہ مؤنۃ۔

آپ نے فرمایا کہ سب سے اچھا اور بابرکت نکاح وہ ہے جس میں بوجھ اور تکلیف کم سے کم ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے:

تنکح المراۃ لاربع لمالہا ولحسبہا [2] ولجمالہا ولدینہا فاظفر بذات الدین تربت یداک۔

آپ نے فرمایا کہ عورت سے نکاح چار چیزوں کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ مال، حسن و جمال، خاندان دین و اخلاق، تو تم دیندار سے شادی کرکے کامیابی حاصل کرو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا برا ہو۔

پہلی حدیث "نکاح میری سنت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نکاح محض خواہش نفس کی تکمیل کا راستہ ہی نہیں ہے بلکہ میری سنت اور میرا طریقہ ہے، اگر کوئی آدمی شادی نہیں کرتا ہے تو گویا وہ زندگی کے صحیح شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے اور اپنی عفت وعصمت پاکیزگی و پاکدامنی اور دین واخلاق ہر چیز کو خطرہ میں ڈالتا ہے، زندگی کی گاڑی کو صحیح راستہ پر لے چلنے کے لئے شریعت کے دائرہ میں اس نفسانی فعل کا ارتکاب بھی ضروری ہے، یہی راستہ ہے جس سے آدمی اپنی خواہش نفسانی کو اعتدال پر رکھ سکتا ہے اور اپنے دامن عفت وعصمت اور دین واخلاق کو محفوظ کرسکتا ہے۔ بعض صحابہ نے جب اس کی خواہش کی کہ وہ قوت شہوت ختم کرلیں تو آپ نے ان کو اس سے منع فرمایا اس لئے کہ یہ

---

[1] بعینہ یہی الفاظ ایک روایت میں نہیں آتے ہیں بلکہ دو روایتوں کو ملا کر یہ حدیث پوری ہوئی۔

[2] حسب میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جسے اعزاز کا سبب سمجھا جاتا ہے، مثلاً خاندان تعلیم عہدہ منصب وغیرہ۔

زندگی سے فرار کی راہ ہے اور زندگی سے فرار کی راہ کو اسلام پسند نہیں کرتا. پھر یہ ارشادگرامی ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیتا ہے کہ اس پر مسرت موقع پر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مواقع پر جو طرز عمل اختیار فرمایا ہے اور خوشی و مسرت کے اظہار کے جو طریقے اور عملی نمونے پیش فرماتے ہیں وہی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، ان سے ہمیں تجاوز نہ کرنا چاہئے جس طرح ایک مسلمان نکاح نہ کر کے سنتِ نبوی سے ہٹتا ہے اسی طرح وہ شادی بیاہ کے موقع پر برادری خاندان یا رسم ورواج کی پابندی تو کرتا ہے مگر سنتِ نبوی کا خیال نہیں کرتا وہ بھی اس سخت وعید کا مصداق بنتا ہے کہ،

فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ — جو شادی بیاہ کے موقع پر میری سنت سے روگردانی کرتا ہے، وہ میرا امتی نہیں.

نکاح کے موقع پر آپ کی سنت کیسے ادا ہو اس کو اگلی دونوں حدیثوں میں آپ نے واضح فرمادیا ہے آپ نے فرمایا ہے کہ

ان اعظم النکاح برکۃ ألیسرہ مئونۃ۔ — یعنی سب سے اچھی شادی وہ ہے جس میں کم سے کم بوجھ اور تکلیف ہو۔

اس ارشادگرامی کا مطلب یہ ہے کہ شادی بیاہ نہایت سادہ طریقہ سے کیا جائے نہ اس میں زیادہ نمود و نمائش ہو نہ مہر زیادہ باندھا جائے اور نہ لڑکے والے لڑکی والوں سے اور نہ لڑکی والے لڑکے والوں سے اتنا مطالبہ کریں کہ وہ بوجھ اور تکلیف کا سبب بن جائے۔ آج ہمارے ماحول میں بڑے سے بڑے جہیز کا مطالبہ کرنا ایک عام رواج ہو گیا ہے. بارات میں استنے آدمی کا جانا یا ہونا ضروری ہے، آتش بازی اور باجے اور گانے کے بغیر گھر شادی کا گھر معلوم نہیں ہوتا، اس لئے یہ بھی ہونا ضروری ہے اور نہ جانے کتنے غلط بلکہ مشرکانہ رسم و رواج کی پابندی کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ آگے ذکر آئے گا کہ آج سادہ طریقہ پر شادی کرنے کی سنت کو ترک کر دینے کی وجہ سے بیاہ شادی مسلمان معاشرہ کے لئے ایک مصیبت بن گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو صاحب حیثیت بنایا ہے وہ تو کسی طرح اسے برداشت کر لیتے ہیں مگر بے شمار غریب بچیوں کے لئے اچھے شوہر نہیں ملتے اور اگر ملتے ہیں تو ان کا مطالبہ لڑکی والوں کے لئے ناقابل برداشت

ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتنی لڑکیاں اپنے گھروں میں سسکتی روتی رہ جاتی ہیں اور باپ بے چارہ دردر کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور بسا اوقات عزت آبرو بچانے کیلئے وہ قرض لے کر لڑکے والوں کا مطالبہ پورا کرتا ہے مگر یہ قرض اس کے لئے زندگی بھر کا عذاب بنجاتا ہے۔

آپ نے تو ارشاد فرمایا تھا کہ میری سنت کے مطابق شادی بیاہ سادہ طریقہ پر کرو مگر ہم نے آپ کی سنت کے بجائے ملک کے دوسرے باشندوں کے طریقہ اور رسم ورواج کو اپنا لیا ہے آج غیر مسلموں کی لڑکیوں کی شادی جس طرح مصیبت بن گئی ہے اسی طرح ہم نے بھی اپنی لڑکیوں کی شادی کو مصیبت بنا لیا ہے اگر ہمارا معاشرہ سادہ طریقہ پر شادی بیاہ کرنے لگتا تو اس سے غیر مسلم باشندگانِ ملک کو بھی شاید کچھ سبق ملتا۔ ؏

از خویشتن گم است کرا رہبری کند

کاش مسلمان قوم کے کھاتے پیتے لوگ اس پر عمل شروع کر دیتے تو اس سے خود ان کو اور ان کے ساتھ پورے ماحول وسوسائٹی کو بے شمار فائدہ پہونچتا اور بہت سے غریبوں کا بوجھ ہلکا ہوجاتا، آپ اپنی لڑکی یا داماد کے ساتھ خفیہ طور پر جو سلوک چاہیں کریں اور زندگی بھر کرتے رہیں مگر شادی کے موقع پر نمائش اور دکھاوے کے لئے جو کچھ کیا جاتا ہے یا اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ آپ ختم کردیں اس سے تھوڑی دیر کے لئے ممکن ہے کہ آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو عزت وبڑائی حاصل ہوجاتی ہو مگر اس کی وجہ سے پورے معاشرہ کا مزاج بگڑ جاتا ہے،

آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسی بہت سی لڑکیوں کی شادی ناکام ہوجاتی ہے جو لاکھوں کا سامان لے کر سسرال آتی ہیں اور بہت سی غریب لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی اتنی خوشگوار ہوتی ہے کہ دولت والوں کو بھی ان پر رشک آتا ہے، اس لئے سامانوں کی کثرت اور دولت کی نمائش کو شادی کی کامیابی کا ذریعہ نہ سمجھیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سادہ طریقہ پر شادی بیاہ کرنے میں زیادہ برکت ہے، برکت کی تعریف یہ ہے کہ چیز تھوڑی ہو مگر اس کا فائدہ بہت ہو ( ) اس سنت کے ترک کرنے کی وجہ سے ہماری کمائی اور ہمارے گھروں سے برکت اٹھ گئی ہے اور حلال روزی کے بجائے ہم پر حرام روزی کا عذاب مسلط کر دیا گیا ہے آج ہمارا حال یہ ہے کہ حرام

وحلال کی پرواہ کئے بغیر اپنی آمدنی بڑھا رہے ہیں مگر زیادہ سے زیادہ آمدنی کے باوجود ہم کو آسودگی اور اطمینان نصیب نہیں ہے۔ آپس کی محبت و ہمدردی ختم ہوتی جا رہی ہے اور ہم پہلے سے زیادہ پریشان ہیں یہ بے برکتی اسی وجہ سے ہے کہ زندگی کے سارے معاملات ہی میں ہمارا طرز عمل سنت نبوی سے ہٹ گیا ہے پہلے گھر کا ایک آدمی کماتا تھا اور گھر کے سارے لوگ آسودگی اور محبت کے ساتھ گزر اوقات کر لیتے تھے اور آج ہر فرد کماتا ہے مگر وہ کمائی یا تو غلط طریقوں میں خرچ ہو جاتی ہے یا کم از کم آسودگی نصیب نہیں ہوتی یا پھر یہ دولت دین واخلاق اور انسانی ہمدردی اور محبت سے دور کر دیتی ہے۔ بہر حال بے برکتی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور آپ کو ملے گی۔

شادی بیاہ کے سلسلہ میں دوسری چیز جو ضروری ہے وہ لڑکے اور لڑکی کا انتخاب ہے عام طور پر ہم لوگ لڑکے اور لڑکی کے انتخاب میں ہر چیز کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ہم ان کی تعلیم ان کی مالی حیثیت۔ خاندان اور شکل وصورت کو دیکھتے ہیں۔ یا ان کے بارے میں پوری معلومات فراہم کرتے ہیں مگر ان کے دین واخلاق کے بارے میں ہم کبھی معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان کا ایمان وعقیدہ درست ہے یا نہیں، وہ دین کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہیں یا نہیں ان کے اخلاق و کردار میں دینی احساس کی کوئی جھلک موجود ہے یا نہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد اوپر نقل ہوا ہے اس میں آپ نے اسی ذہنیت پر چوٹ لگائی ہے کہ عام طور پر چار چیزوں کو لڑکی سے رشتہ کرنے میں دیکھا جاتا ہے، مال، جمال، خاندان اور دین مگر آپ نے فرمایا کہ ان میں سے سوائے دین واخلاق کے کسی دوسری چیز کو رشتہ کے انتخاب میں فیصلہ کن چیز نہ بنانا چاہیئے چنانچہ آخری جملہ میں آپ نے حکم دے کر فرمایا کہ:

فاظفر بذات الدین[1] (تم دیندار کا انتخاب کر کے کامیابی حاصل کرو) آپ نے دین واخلاق

---

[1] آپ کے ارشاد گرامی کا اثر صرف اس عہد سعادت ہی تک نہیں تھا جب بلال حبشی اور صہیب رومی اور زید بن حارثہ کے رشتے قریش وانصار کے معزز گھرانوں میں ہو جایا کرتے تھے بلکہ اس کا اثر ہمارے معاشرہ میں ایک مدت تک رہا۔ آپ کو اسلامی تاریخ میں بے شمار واقعات ملیں گے بڑے بڑے دیندار رئیسوں نے اپنی بچی کا

بقیہ ص۱۳ پر

کو کامیابی کا ذریعہ بتایا ہے مگر عام طور پر معاشرہ میں دینداری کو عملاً ایک عیب تصور کیا جاتا ہے اگر کوئی نیک بخت لڑکا شادی سے پہلے دینی جذبہ سے داڑھی رکھ لے تو اس کے سسرال والوں ہی کی نہیں بلکہ خود اس کے والدین کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ داڑھی منڈوا دے اسی طرح اگر کوئی لڑکی شادی سے پہلے دینداری اختیار کرے تو وہ ملّانی کہہ کر پکاری جاتی ہے۔

پھر یہ بھی بات قابل غور ہے کہ شریعت میں لڑکی کو جہیز دینے کی جو اجازت ہے اس میں وہ چیزیں شامل ہیں جو آئندہ زندگی میں لڑکی کے کام آئیں[1] ظاہر ہے کہ ہر لڑکی والا اپنی لڑکی کے لئے خود زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر لڑکے والوں کیطرف سے اس وقت جہیز کا جو مطالبہ ہوتا ہے وہ لڑکی کے کام آنے والی چیزوں کا نہیں بلکہ زیادہ تر

---

[1] سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدۂ عالم حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز میں جو سامان دیا تھا وہ سب انکے کام آنے والی چیزیں تھیں یا پھر مشترکہ ضرورت کی چیز جیسے چارپائی، بستر، مگر کوئی ایسی چیز نہیں دی جو صرف لڑکے کے کام کی ہو۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

رشتہ ایک غریب طالب علم سے اس بنا پر کر دیا کہ وہ صالح تھا اور قرآن اچھا پڑھتا تھا۔ سعید بن مسیب مشہور تابعی کی صاحبزادی سے خلیفۂ وقت عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکے کا پیغام بھیجا مگر آپ نے ٹھکرا دیا اور ایک صالح غریب نوجوان طالب علم ابو وداعہ سے رشتہ کر دیا۔ اس وقت بھی بہت سے علماء کے خاندانوں میں دین کی بنیاد پر رشتے کئے جاتے ہیں تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں بھی یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا ہے مگر عام طور پر مسلم معاشرہ کا خیال بدل گیا ہے اور وہ رشتہ طے کرنے میں دین کے بجائے مال، جمال، اور خاندان ہی کو وجہ ترجیح بناتے ہیں۔ اس سنت کو چھوڑ کر مسلمانوں نے شادی بیاہ کو اتنے غیر ضروری لوازمات اور رسم و رواج سے باندھ دیا ہے کہ یہ خوشی کا موقع بے شمار لوگوں کیلئے غم سے بدل جاتا ہے۔ ہندوستان میں برادریوں کی جو ایک مستقل تقسیم قائم ہو گئی ہے کہ ایک برادری کا آدمی دوسری برادری میں شادی کرنا ایسا سمجھتا ہے گویا وہ کسی حرام یا ناجائز کام کا ارتکاب کر رہا ہے یہ بھی حدیث نبوی کے خلاف ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب "اسلامی فقہ" حصہ دوم میں مسئلہ کفاءت"۔

لڑکے کے کام آنے والی چیزوں کا مطالبہ ہوتا ہے یا ساس سسر اور خاندان والوں کے لئے ہوتا ہے ریڈیو، سائکل، موٹرسائکل، کار، صوفہ سیٹ، ڈنر سیٹ وغیرہ سے لڑکی بیچاری تو ایک دن بھی آسائش نہیں اٹھاتی بلکہ صاحبزادے اور ان کے گھر والے ہی اٹھاتے ہیں غور کیجئے کہ ان چیزوں کا طلب کرنا بے شرمی اور بے حیائی کے ساتھ لڑکی کے والدین پر کھلا ہوا ظلم نہیں ہے، رشتہ داروں سے توصلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے اور ایک نیا رشتہ جو ابھی قائم ہونے جارہا ہے ہم اس رشتہ کی بنیاد ہی ظلم پر رکھ رہے ہیں، بسا اوقات لڑکی والے خود سامانوں کی پیش کش کرتے ہیں اس کی وجہ انکی خوشی نہیں بلکہ رسم ورواج کی مجبوری ہے یا پھر اپنے تفوق کا اظہار ہوتا ہے، بہرحال جہیز کے لئے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر اس میں نہ تو نمود ونمائش اور اپنی دولت کا بیجا مظاہرہ جائز ہے اور نہ بے شرمی کے ساتھ سامانوں کا مطالبہ کرنا صحیح ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اکتفا نہیں فرمایا آگے دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ اگر تم دین کو نظر انداز کرکے شادی بیاہ کے رشتے کروگے تو خاندان اور سوسائٹی خراب ہوگی اور معاشرہ میں فساد پھوٹ پڑے گا۔ آپ کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

اِذَا خَطِبَ اَحَدُکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَہٗ وَخُلُقَہٗ فَزَوِّجُوْہُ وَاِنْ لَّا تَفْعَلُوْا تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ عَرِیْضٌ۔ (مشکوٰۃ)	اگر کوئی لڑکے والا تمہاری لڑکی سے رشتہ کا پیغام دے تو دیکھو کہ اس کا دین و اخلاق اچھا ہے کہ نہیں اگر اس طرف سے اطمینان ہے تو رشتہ کرلو، اگر ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ فساد ہوگا۔

یعنی جس طرح لڑکی کے انتخاب میں دین و اخلاق کو سب سے مقدم رکھنا چاہیئے اسی طرح لڑکے کے انتخاب میں جو چیز دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا اخلاق و کردار اچھا ہے یا نہیں اگر اس طرف سے اطمینان ہوجائے تو پھر اس رشتہ کے کرلینے میں تامل نہ ہونا چاہیئے اگر اس کے اندر کوئی دوسری کمی ہے تو انشاء اللہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے اس کی تلافی کردے گا۔

اس وقت ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ دین کو معیار انتخاب نہ بنا کر مال و جمال تعلیم و خاندان کو معیار بنانے کے نتیجہ میں ہماری سوسائٹی میں کتنے فتنے پیدا ہورہے ہیں اور فساد و بگاڑ کی کیسی کیسی صورتیں پیدا ہورہی ہیں۔ جہیز کے لینے دینے اور اس کی کمی بیشی کی بناپر

خودکشی اور اغوا کے کتنے واقعات ہوتے ہیں کتنے لڑکے اور لڑکیاں اسی وجہ سے عمر رسیدہ ہو جاتی ہیں اور ان کی شادی نہیں ہو پاتی اور وہ بد اخلاقی کا شکار ہو رہی ہیں، اس معیار کے بدل جانے کی وجہ سے جن مسلمان گھروں میں صبح کے وقت قرآن پاک کی آواز سنائی دیتی تھی آج وہاں سینما کے گندے گانوں کی آواز سنائی دیتی ہے، اولاد بے راہ رو، نافرمان، بے دین اور بد اخلاق و بد تہذیب ہوتی جا رہی ہے، اپنے کو زیادہ سے زیادہ ماڈرن ثابت کرنے کیلئے لڑکے ہپی کٹ اور رنگین بوشرٹ اور بیل باٹم پہنکر لڑکیوں کی صورت بنا رہے ہیں اور لڑکیاں پتلون بوشرٹ پہنکر اپنی فطری حیا کو بالائے طاق رکھ کر لڑکا بننے کی کوشش کر رہی ہیں سینما اور تفریح گاہوں میں ان کے پرے کے پرے نظر آئیں گے اور اب اس سے آگے بڑھ کر وہ دفتروں اور ہوٹلوں کی زینت بن رہی ہیں حدیث نبوی میں ایسے مردوں پر جو عورتوں کی صورت بنائیں اور ایسی عورتوں پر جو مردوں کا لباس اختیار کریں لعنت کی گئی ہے، جب صورت بنانے پر لعنت کی گئی ہے تو جس کی سیرتیں بھی بگڑ چکی ہیں ان پر آپ کی لعنت کا اندازہ کیجئے، یاد رکھئے مسلمانوں کے جس طبقہ پر خدا کے رسول کی لعنت ہو وہ کبھی فلاح پا نہیں سکتا۔ مگر بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم ایڈوانس بننے کی شوق میں ساری اسلامی اور تہذیبی قدروں کو پامال کر رہے ہیں، غرضیکہ آپ کے اس ارشاد گرامی کی خلاف ورزی کرنے کے دنیا میں جو بڑے نتائج ہمارے سامنے آ رہے ہیں اس کا مشاہدہ آپ جس خاندان جس برادری جس محلہ اور جس بستی میں چاہیں کر سکتے ہیں، یہ تو دنیا کا عذاب ہے جس سے ہم دوچار ہیں آخرت میں اس غلطی کا اللہ تعالیٰ جو عذاب دیں گے وہ اس کے علاوہ ہے۔ دیندار عورت سے شادی کرنے کا جو حکم آپ نے فرمایا ہے اس میں بہت سی مصلحتوں کے ساتھ ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر عورت دیندار اور خوش اخلاق ہوگی تو بچوں پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا اگر وہ دین و اخلاق سے محروم ہوگی تو بچے بھی بے دین اور بد اخلاق اور اسلامی تہذیب سے بے بہرہ ہوں گے جیسا کہ دین و اخلاق سے محروم عورتوں کے بچوں کا حال عام طور پر آپ دیکھ رہے ہیں، یہ تاریخی واقعہ بھی ہمارے لئے کم عبرت خیز نہیں ہے کہ ہندو قوم ایک ہزار برس تک مسلمانوں اور انگریزوں کے ماتحت رہی مگر وہ مجموعی طور پر اپنی زبان و تہذیب سے دور نہیں ہوئی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی عورتوں نے کسی دوسری تہذیب کو گھر کے اندر گھسنے نہیں دیا بلکہ انہوں نے اپنی تہذیب

کی ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی محفوظ رکھا اور آج تک محفوظ رکھے ہوئے ہیں، اسی طرح سکھ قوم اپنی بہت سی مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ باقی ہے وہ اپنے صافے اور داڑھی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ، امریکہ اور دنیا کے ہر ملک میں اپنی دنیاوی ترقی کے ساتھ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اس نے ہر جگہ اسے حکومت سے منوا بھی لیا ہے، کیا ہمارے لئے یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی مشرکانہ زبان اور تہذیب کو باقی رکھنے میں اتنی پامردی دکھائیں اور ہم اپنی موحدانہ زبان و تہذیب کو بچانے میں نہیں بلکہ اختیار کرنے میں اتنی کمزوری دکھائیں کہ آج اگر ایک نوجوان لڑکا داڑھی رکھ لیتا ہے اور دیندارانہ لباس اختیار کر لیتا ہے تو ہماری سوسائٹی میں نکو بنایا جاتا ہے اور عورتیں اس کا مذاق اڑاتی ہیں اور اس کی داڑھی منڈوانے اور اس کا سادہ لباس بدلوانے کی کوشش کرتی ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ یہ چیز اس کی اچھی شادی اور بنیادی ترقی میں حارج ہوگی، آج ہم اپنی لڑکیوں کو بے تحاشا اسکول و کالج کی تعلیم میں ڈالتے چلے جا رہے ہیں مگر ہم کو اس کی ذرا فکر نہیں ہے کہ یہ معصوم بچیاں اسلامی تہذیب اردو زبان دین و اخلاق کی بنیادی باتوں اور حیا شرم سے بھی محروم ہوتی جا رہی ہیں لیکن ہم ہیں کہ ان کو بوشرٹ اور پتلون پہنا کر اور دین و اخلاق سے بیگانہ کر کے خوش ہو رہے ہیں اور یہ وبا عوام ہی میں نہیں بلکہ دیندار گھرانوں میں بھی پیدا ہونے لگی ہے، آج ہمارے گھروں کی لڑکیاں اردو زبان میں خط و کتابت کرتے ہوئے گھبراتی ہیں جب اردو زبان سے ان کی گھبراہٹ کا یہ حال ہے کہ پھر قرآن پاک سے ان کو کیا انس پیدا ہو سکتا ہے؟ اور اسلامی تہذیب سے ان کو کیسی دلچسپی ہو سکتی ہے، اگر اسلامی خصوصیات کے ساتھ اعلیٰ تعلیم دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ کاش ہم اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرتے اور حسن و جمال، خاندان تعلیم اور دولت کے بجائے رشتہ کرنے میں دین و اخلاق کو مقدم رکھتے تو اس سے ایک معاشرتی انقلاب پیدا ہو جاتا اگر دین و اخلاق کے ساتھ دوسری چیزیں بھی جمع ہو جائیں تو بہت ہی اچھا ہے مگر کسی صورت میں ہمیں دین و اخلاق کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے دین و اخلاق اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ یہی لڑکیاں ہیں اگر یہ بگڑ گئیں تو اسلامی معاشرہ کی حفاظت بڑے سے بڑے دینی مدرسے بھی نہیں کر سکیں گے اس ارشاد نبوی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کا دین و اخلاق اگر درست ہے تو پھر لڑکی والوں پر کسی طرح کا دوسرا بوجھ لڑکے والے نہ ڈالیں

اس کے انتخاب کیلئے بس یہی خوبی کافی ہے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ شادی کا سارا بوجھ لڑکی والے نہیں بلکہ لڑکے والے اٹھائیں، لڑکے سے مہر اسی لئے دلایا جاتا ہے، دعوت ولیمہ کرنے کا حکم لڑکے والوں کو ہی دیا گیا ہے، ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں کے مسلمانوں میں یہ رواج ہے کہ شادی کا سارا خرچ لڑکے والے ادا کرتے ہیں، ہمارا حال یہ ہے کہ عورت کا مہر ادا کرنے کے بجائے ہم شروع ہی سے اس کے معاف کرانے کی نیت کرتے ہیں، یہ حق مارنے کی نیت معمولی گناہ نہیں بلکہ گناہ کبیرہ ہے لحاظ پاس میں عورتیں بعض وقت مہر لینے سے انکار کرتی ہیں یا اسے بے تعلقی کی علامت سمجھتی ہیں مگر بہر صورت مردوں کا فرض ہے کہ وہ بیوی کا یہ حق ضرور ادا کریں، مہر تو نکاح کے وقت ہی ادا کر دینا چاہیئے۔ لیکن آسانی کیلئے بعد میں ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

لڑکے کا انتخاب

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے انتخاب میں سب سے زیادہ اہمیت دین واخلاق کو دینی چاہیئے دوسری چیزیں مثلاً تعلیم، مالی حالت، خاندان دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر مقدم دین واخلاق کو رکھنا ضروری ہے اگر ایک غریب لڑکا یا لڑکی جس کا دین واخلاق درست ہو اس تعلیم یافتہ لڑکی یا لڑکے سے بہتر ہے جس کے اندر دین ہو اور نہ اخلاق اس سلسلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکیمانہ ہدایتوں کو آپ پیش نظر رکھیں آپ نے لڑکے کے بارے میں فرمایا کہ۔

اِذَا خَطَبَ اَحَدُکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَہٗ وَخُلُقَہٗ فَزَوِّجُوْہٗ	جب تمہارے پاس لڑکے والا رشتہ کا تمہاری لڑکی کا پیغام بھیجے تو اگر لڑکے کے دین واخلاق سے تم مطمئن ہو تو اس سے اپنی لڑکی کا رشتہ کر دو۔

آپ کے اس ارشاد پر صحابہ نے سوال کیا کہ۔

وَاِنْ کَانَ فِیْہِ	اگر اس میں کوئی جسمانی یا مالی کمی ہو جب بھی

آپ نے تاکیداً تین بار فرمایا

اِذَا جَاءَکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَہٗ وَ خُلُقَہٗ فَانْکِحُوْہُ (المنتقی بحوالہ الترمذی)	جب بھی ایسا رشتہ آئے جس کے دین واخلاق سے تم مطمئن ہو تو اس کا نکاح اپنی لڑکی سے کر دو۔

لڑکی کا انتخاب

لڑکی کے انتخاب کے سلسلہ میں اوپر ایک حدیث گزر چکی ہے کہ مال، جمال اور حسب و نسب کے بجائے دین و اخلاق کو مقدم رکھنا چاہیئے ایک حدیث میں آپ نے اس کی مزید وضاحت ہی نہیں فرمائی ہے بلکہ اس کے خلاف کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لَا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ فَعَسٰى يُرْدِيهِنَّ وَلَا تَزَوَّجُوهُنَّ لِاَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰى اَمْوَالُهُنَّ اَنْ يُطْغِيَهُنَّ وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ وَلَاَمَةٌ خَرْمَاءُ سَوْدَاءُ ذَاتُ دِيْنٍ اَفْضَلُ

(ابن ماجہ کتاب النکاح)

عورت کا نکاح ان کے حسن کی بنا پر نہ کرو اسلئے کہ حسن اکثر ان کو غرور کی وجہ سے خراب کر دیتا ہے اور ان کی مال کی بنا پر بھی ان سے نکاح نہ کرو اسلئے کہ ان کا مال ان میں نافرمانی اور سرکشی پیدا کر دیتا ہے لیکن تم دین اور اخلاق والی عورت سے نکاح کرو بدصورت، دیندار اور کالی لونڈی ان خوبصورت اور مال والی عورت سے زیادہ بہتر ہے جن میں دین و اخلاق نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی حکیمانہ وضاحت فرمائی ہے اور دیندار سے نکاح کرنے والے کو دعا دی ہے۔

مَنْ تَزَوَّجَ امْرَاَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ اِلَّا ذُلًّا وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِحُسْنِهَا لَمْ يَزِدْهُ اِلَّا دَمَامَةً وَمَنْ تَزَوَّجَ امْرَاَةً لَمْ يُرِدْ بِهَا اِلَّا اَنْ يَغُضَّ بَصَرَهٗ وَيُحْصِنَ فَرْجَهٗ وَيَصِلَ رَحِمَهٗ بَارَكَ اللّٰهُ لَهٗ فِيْهَا وَبَارَكَ لَهَا فِيْهِ۔

(طبرانی اوسط بحوالہ مرقاۃ کتاب النکاح)

جو کسی عورت سے اسکے معزز گھرانے کا ہونے کی وجہ سے شادی کرتا ہے تو اسے نتیجہ میں ذلت ملتی ہے اور جو اسکے حسن وجمال کی وجہ سے شادی کرتا ہے تو اسے حسن ڈھل جانے کے بعد بدصورتی ملتی ہے اور جو اسلئے کسی عورت سے شادی کرتا ہے کہ اسکی نگاہ غیر محرم سے محفوظ ہو جائے گی اور وہ اپنی شرمگاہ کو حرامکاری سے بچا سکیگا اور صلہ رحمی کرے گا تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ لڑکی کے سلسلہ میں برکت عطاء کریگا اور لڑکی کو لڑکے کی طرف سے برکت و سکون عطاء کرے گا۔

اس حدیث کی روشنی میں ابن ہمام نے لکھا ہے کہ

إذا لم يتزوج المرأة إلا لعزها أو مالها أو حسبها فهو ممنوع شرعًا

اگر کوئی شخص عورت کی عزت یا مال یا حسب و نسب کی بنا پر شادی کرتا ہے تو یہ شرعاً ممنوع ہے۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۳۰۴)

تبع تابعین

حصہ اوّل

حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کی کتاب تبع تابعین تقریباً پندرہ برس سے نہیں چھپ سکی تھی، بحمد اللہ دار المصنفین نے اسے دوبارہ شائع کر دیا ہے۔ اس میں ۱۹ اکابر تابعین جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، امام اوزاعی اور عبد اللہ بن مبارک جیسے ممتاز ائمہ کے حالات اور ان کے کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی ایک قیمتی مقدمہ بھی مصنف کے قلم سے شروع میں شامل ہے، جس میں دو صدی کی پوری دینی و علمی تاریخ کی تفصیل کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے۔ کتاب ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ضخیم ہے مگر قیمت صرف ۲۸ روپیہ ہے۔ کتاب کے نسخے بہت کم چھپے ہیں۔ اس لئے جو حضرات بہت دنوں سے اس کے مطالعہ کے خواہشمند تھے وہ کتاب جلد سے جلد منگالیں۔

کتاب ان پتوں پر مل سکتی ہے۔

۱ ـــــ منیجر دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۲ ـــــ منیجر دار التالیف والترجمہ۔ جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱۔ یو۔ پی

حضرت تھانویؒ کے معمولات

مجھے ابتداء عمر ہی سے پاک وصاف رہنے کا اور ہر کام وقت پر اور کسی سلیقہ کے ساتھ کرنے کا اہتمام رہا اور ہمیشہ اس کا خیال رہا کہ میری وجہ سے کسی کو کوئی ناگواری یا میری بات بار خاطر نہ ہو اکثر وبیشتر شروع ہی سے اپنے حالات واعمال کا جائزہ لیتے رہنے کی عادت ہے۔

مجھے دین کی باتوں کا بچپن ہی سے بہت شوق تھا۔ یہاں تک کہ بہت چھوٹی عمر میں بھی جبکہ عربی کی ابتدائی مختصر کتابیں پڑھتا تھا اور صرف ۱۲۔۱۳ برس کی عمر تھی پچھلی رات تہجد کو اٹھتا اور نوافل وظیفہ پڑھتا تھا میری تائی صاحبہ کو میری یہ مشقت گوارا نہ ہوتی اور فرماتیں ابھی تیری عمر ہی کیا ہے کیوں تکلیف اٹھاتا ہے خصوصاً سردی کے زمانہ میں ان کا جی بہت کڑھتا تھا۔

مجھے دین کا شوق جس کی ایک فرع تہجد بھی ہے میرے ابتدائی استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ کے فیض سے پیدا ہوا تھا۔ وہ بڑے ہی بابرکت بزرگ تھے۔ مجھے بچپن ہی سے وعظ کہنے کا بہت شوق تھا چنانچہ اگر کبھی بازار سودا وغیرہ لانے کیلئے جاتا اور راستہ میں کوئی مسجد پڑتی اور اس وقت نماز کا وقت نہ ہوتا تو سیدھا منبر پر پہونچتا اور کھڑے ہو کر کچھ خطبہ کی طرح پڑھ پڑھا کر وہاں سے چلا آتا۔

مجھے انضباط اوقات کا بچپن ہی سے بہت اہتمام ہے جو اس وقت سے لے کر اب تک بدستور موجود ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قدر دینی کام مجھ سے لے لیا۔ میں کبھی ایک لمحہ بھی بیکار رہنا برداشت نہیں کرتا۔ میرے استاد حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحب دیوبندیؒ ایک بار تھانہ بھون تشریف لائے میں نے ان کے قیام اور راحت رسانی کے تمام ضروری انتظامات کئے۔ جب تصنیف کا وقت آیا تو بہ ادب عرض کیا کہ حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں۔ اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر پھر حاضر ہو جاؤں۔ فرمایا ضرور لکھو۔ میری وجہ سے اپنا حرج

ہرگز نہ کرتا، گو میرا دل اس روز کچھ لکھنے میں لگا نہیں لیکن ناغہ نہ ہونے دیا کہ بے برکتی نہ ہو۔ تھوڑا سا لکھ کر پھر جلد ہی حاضر خدمت ہو گیا۔ حضرت کو تعجب ہوا کہ اس قدر جلد آ گئے۔ عرض کیا حضرت صرف چند سطریں لکھ لی ہیں، معمول پورا ہو گیا۔

بچپن ہی سے میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہو مگر ترتیب کے ساتھ نہ ہو تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں اور نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ فطرتاً میرا دماغ کچھ ایسا ہی ہے۔

میں عذر کی حالت میں عزیمت کے بجائے رخصت پر عمل کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں اس میں اپنے عجز کا احساس ہوتا ہے اور ایسا نہ کرنے سے عجب پیدا ہونے کا اندیشہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ناقدری معلوم ہوتی ہے۔

میں اپنے نجی معاملات میں کبھی شریعت کے فتوے کے مقابلہ میں اپنے تقوے کی ادنیٰ حیثیت نہیں سمجھتا۔ جب کوئی معاملہ ہوتا ہے اہل علم سے مشورہ کر لیتا ہوں اور ان سے فقہی مسئلہ معلوم کر کے عمل کرتا ہوں۔ بطور خود کبھی عمل نہیں کرتا۔ میں الحمد للہ کبھی طبیعت کو عقل پر غالب آنے نہیں دیتا اور کبھی عقل کو شریعت پر غالب آنے نہیں دیتا۔

مجھے اعتدال اور حفظ مراتب کا بڑا اہتمام ہے ہر شخص سے اس کے درجے کے موافق معاملہ اور برتاؤ کرتا ہوں، بلکہ طبیعت میں یہاں تک احتیاط ہے کہ اگر کسی وقت مختلف قسم کی چند کتابیں جمع ہو جائیں تو ان کے رکھنے میں سب سے اوپر حدیث پھر اس کے نیچے فقہ۔ پھر تصوف اور کوئی کتاب۔ اسی طرح پہلے عربی پھر فارسی پھر اردو کی کتابیں رکھتا ہوں۔

اگر کہیں دینی کتاب رکھی ہو تو اس کے اوپر کوئی استعمال چیز کا رکھنا بھی خلاف ادب سمجھتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کی بھی میرے دل میں بڑی قدر رہتی ہے، کاغذ کے ٹکڑے فیتہ، تاگا۔ اور کوئی ایسی حقیر چیز جو کسی کام میں آ سکتی ہوں۔ اس کو بھی اٹھا کر محفوظ کر لیتا ہوں وقت پر ان کا کام میں آ جانا بڑی راحت کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جس نعمت کے اجزائے کثیرہ سے اپنی ضرورت اور لذت پوری ہوتی ہو اس کے اجزائے قلیلہ کو تلف کرتے ہوئے میرا دل

رہتا ہے۔

جب کوئی شخص معاملہ دینی یا دنیاوی غرض سے میرے پاس آتا ہے تو بفضلہ تعالیٰ میں جلد از جلد اس کو فارغ و مطمئن کردیتا ہوں ، خود کسی امر میں زحمت انتظار برداشت نہیں کرسکتا اور نہ دوسرے کو اپنی طرف سے منتظر رکھنا گوارا کرتا ہوں۔

اگر کسی وقت کوئی ضروری کام یا خاص بات یاد آجاتی ہے تو فوراً کاغذ پر اس کی یادداشت لکھ کر رکھ لیتا ہوں تاکہ دماغ اس میں الجھا نہ رہے۔ پھر وقت پر فراغت کے ساتھ وہ کام کرلیتا ہوں میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہتا ہوں مگر قلب کو اس کے لئے فارغ ضرور رکھنا چاہتا ہوں۔

میں کبھی فرمائشی مضمون پر وعظ نہیں کہتا بلکہ جیسا موقع ہو یا دینی ضرورت ہو اس کے رعایت سے وعظ کہتا ہوں اور جب تک دل میں تقاضا نہ ہو وعظ نہیں کہتا بعض وقت جب اپنے نفس کے مکاید پر نظر جاتی ہے تو ان کی اصلاح کے لئے بھی وعظ کہہ دیتا ہوں ۔ اس میں اپنی بھی اصلاح ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی نفع ہوتا ہے۔

بعض وقت کسی کی تعزیت یا تقریب نکاح میں شرکت کا موقع ملتا ہے تو تعزیت کے وقت اہل تعلق کی دلدہی کرنے اور مصائب و رنج و غم پر صبر و تحمل اور اس کے اجر و ثواب کا بیان کرنے کیلئے اگر موقع ہوا تو کچھ نصیحت و وعظ کہہ دیتا ہوں اسی طرح تقریب نکاح میں موقع پر اگر انشراح ہوا تو نکاح کے برکات اور اس میں رسومات و بدعات کے منکرات پر نصائح کے طور پر وعظ کہہ دیتا ہوں جس سے بہت نفع ہوتا ہے۔

مریضوں کے عیادت کے وقت ان کی تسلی اور شفاء کیلئے کچھ آیات قرآنیہ پڑھ کر دم کردیتا ہوں اور دعائے صحت کردیتا ہوں۔

خطوط کے جواب اکثر اسی روز تحریر کردیتا ہوں تاکہ مکتوب الیہ کو زحمت انتظار نہ ہو اگر کوئی دینی یا دنیوی معاملہ میں مشورہ لیتا ہے اور اس کو اس معاملہ میں تذبذب ہوتا ہے تو بقدر اپنے علم و تجربہ کے جو صحیح بات سمجھ میں آتی ہے عرض کردیتا ہوں ، اگر اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے تو مجھے ناگوار نہیں ہوتا۔ (باقی صفحہ پر)

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہٗ

اخلاق سلف

وہ جب قیامت کی تکالیف کا ذکر سنتے تو نہایت خوف کھاتے اور جب قرآن مجید سنتے تو مارے خوف کے غشی طاری ہو جاتی۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْکَالًا وَّجَحِیْمًا وَّطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًا،

(ہمارے پاس عذاب اور دوزخ اور گلا پکڑنے والے کھانے اور دیگر قسم کے عذاب موجود ہیں) تلاوت فرمائی تو آپ کے پیچھے حمران بن اعین تھے وہ مردہ ہو کر گر پڑے۔

حسن بن صالح رحمہ اللہ تعالیٰ ایک دن اذان دے رہے تھے جب اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللہُ پر پہونچے تو غش کھا کر گر پڑے۔ لوگ ان کو منارہ سے اٹھا کر لائے اور آپ کے بھائی نے اذان کہی اور نماز پڑھی گئی، اس وقت تک وہ بیہوش ہی رہے ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میں نے حسن مذکور سے بڑھ کر خاشع کوئی نہیں دیکھا۔ ایک رات صبح تک سورہ عَمَّ بار بار پڑھتے رہے اور فجر تک غشی ہوتی رہی اور سورت ختم نہ ہوئی۔ آپ جب ہوش میں آتے تو نیا وضو کرتے۔

حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ،

ترجمہ:- جب آفتاب لپیٹا جاوے گا اور جس وقت تارے بے نور ہو جاویں گے اور جس وقت پہاڑ چلائے جاویں گے اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنی معطل چھوڑی جائے گی اور جس وقت وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے اور جس وقت دریا دہکا دیئے جاویں گے اور جب نفوس ملا دیئے جائیں گے اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ کے سبب قتل کی گئی اور جب اعمال نامے

چھپائے جاویں گے) تک پڑھی تو غشی کھا کر گر پڑے اور دیر تک تڑپتے رہے۔

ربیع بن خیثمؒ نے ایک قاری کو یہ آیت پڑھتے سنا۔ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيرًا۔ ترجمہ: جب اس کو جہنم دور سے دیکھے گی تو اس کی بھڑک کی آواز اور شور سنیں گے) تو غشی کھا کر گر پڑے۔ پھر اٹھا کر گھر پہونچائے گئے اور غشی کی وجہ سے ان کی ظہر، عصر مغرب اور عشاء چار نمازیں قضا ہوئیں۔ مروی ہے کہ آپ اپنے محلہ میں امام تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ قاری عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنی خطایاد آتی تو غشی طاری ہو جاتی اور ان کے دل کی آواز ایک میل کے فاصلہ سے سنائی دیتی تھی۔ کسی نے آپ سے کہا، آپ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں پھر اس قدر غم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا جب میں اپنی خطا کو یاد کرتا ہوں تو دوستی بھول جاتا ہوں۔ راوی کہتا ہے، فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک دن فجر کی نماز میں سورہ یٰسٓ پڑھی اور جب إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (ترجمہ) وہ ایک کڑک ہوگی کہ تمام ہمارے پاس حاضر ہوں گے) تک پہونچے تو ان کے صاحبزادے علی بیہوش ہو گئے اور صبح تک ہوش میں نہ آئے علی مذکور جب کسی سورت کے پڑھنے کا قصد کرتے تو تمام نہ کر سکتے۔ اور سورۂ اذا زلزلت الارض اور سورۂ القارعۃ کو پوری سن بھی نہ سکتے۔ راوی کہتا ہے، جب علی مذکور کا انتقال ہوا تو ان کے والد فضیل رحمہ اللہ تعالیٰ مسکرائے، حالانکہ آپ نہایت غمگین رہا کرتے تھے۔ لوگوں نے اس کا باعث دریافت کیا، آپ نے فرمایا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اس کی موت مرغوب ہے اس لئے مجھے اللہ کی پسند مرغوب ہے۔ علی مذکور اپنے والد سے درخواست فرمایا کرتے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا فرما دیں تاکہ میں ایک سورت سن سکوں، اور پورا قرآن مجید ختم کر لوں۔ اگرچہ عمر میں ایک ہی بار ہو۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہمارے سلف کا حال یہ تھا کہ جو رات میں تلاوت قرآن مجید کرے اس کے چہرے سے لوگ پہچان لیتے تھے اس کے تغیر رنگ اور زردی چہرہ اور لاغری کی وجہ سے، آج کل لوگ ایسے ہو گئے ہیں کہ ایک رات میں سارا قرآن مجید ختم کرتے ہیں، لیکن ان کے چہروں سے معلوم نہیں ہوتا۔ گویا انہوں نے صرف اپنی چادر کا بوجھ ہی اٹھایا تھا۔

میمون بن مہران رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، سلیمان فارسی نے ایک قاری سے یہ آیت سنی

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

عارفانہ غزل

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ

غافل تو ایک دن نہ کہیں شرمسار ہو
گل تو سمجھ رہا ہے جسے، وہ نہ خار ہو

مشغول ہو کے غیر میں، کیوں کر رہا ہے دیر
دربارِ حسن میں نہ ترا انتظار ہو

ناداں سمجھ سے کام لے کھاتا ہے کیوں فریب
سمجھا جسے خزاں، نہ کہیں وہ بہار ہو

میخوار بس وہی ہے، وہی رند باصفا
آنکھوں میں جامِ عشق کا جس کی خمار ہو

جنت کا لطف کیوں نہ تڑپنے میں پھر ملے
ان کی نظر کا تیر اگر دل کے پار ہو

ممکن نہیں ہے ان کا کبھی شکر ہو ادا
احسان جن کا ہم پہ ہو اور بے شمار ہو

دنیا اسے جو چاہے کہے، اس کو فکر کیا
اپنی نظر میں دوستو! جو خود ہی خار ہو

جس کو ملی ہے عشق کی دولت زہے نصیب
صحرا بھی اس کے حق میں، نہ کیوں لالہ زار ہو

مرضی پہ ان کی شوق سے سب کچھ نثار کر
میدانِ عشق میں نہ کہیں تیری ہار ہو

دونوں جہاں میں پاتا ہے بیشک وہی فلاح
روتا جو اپنے جرم پہ زار و قطار ہو

مستی سے کیوں نہ رقص کرے یہ بتائیے
جس پر بھی ان کی تیغِ محبت کا وار ہو

بڑھ کر تو کردے دیدہ و دل اپنا فرشِ راہ
احمدؔ وہ آ رہے ہیں ذرا ہوشیار ہو

مجیب اللہ ندوی

تین ہفتے مہاراشٹر میں

ایک مدت سے بعض دوستوں کا تقاضا تھا کہ جامعۃ الرشاد کے تعارف کیلئے راقم الحروف حیدرآباد بنگلور اور مہاراشٹر کے مرکزی مقامات کا دورہ کرے، خاص طور پر مہاراشٹر میں مالیگاؤں، بھیونڈی اور بمبئی میں تعارف کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ سارے ہندوستان کے مدارس کو سب سے زیادہ مالی اعانت یہیں سے ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مدارس کیلئے یہ مقامات خوانِ یغما ہیں۔

مگر مدرسہ کی انتظامی اور لکھنے پڑھنے کی مشغولیت اور حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے پیش نظر کہ "اس دور کا فتنہ یہ ہے کہ پروپگنڈہ آگے ہوتا ہے اور کام پیچھے، ضرورت ہے کہ کام کو آگے رکھا جائے اور پروپگنڈہ کو پیچھے"۔ اس سفر کیلئے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی، حالانکہ مدرسہ کو شدید ضرورت تھی کہ اس کے ہمدردوں کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

مولانا احمد کمال صاحب رشادی ندوی مبعوث رابطۂ عالم اسلامی استاذ جامعۃ الرشاد لائق تشکر ہیں کہ انہوں نے مجھے اس سفر پر آمادہ کیا اور بارہ برس کے بعد تین ہفتے اعظم گڈھ سے باہر رہنے پر آمادہ کیا اگر ان کی رفاقت نہ ہوتی تو شاید یہ سفر نہ ہو پاتا۔

دل میں یہ داعیہ تھا کہ یہ سفر الٰہ آباد سے شروع کروں تاکہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ العالی کی دعائیں بھی ساتھ رہیں، مولوی نعیم اللہ صاحب ریزرویشن کیلئے گئے تھے ان سے حضرت نے خود بھی تاکید کردی کہ وہ مجھ سے مل کر جائیں۔ چنانچہ ۳۰ ر ستمبر کو ہم لوگ بذریعہ بس الٰہ آباد روانہ ہوگئے اور تین بجے الٰہ آباد پہونچ گئے۔ الٰہ آباد پہونچ کر سیدھے مولانا قمر الزماں صاحب خلیفۂ مجاز حضرت مولانا اور سرپرست بیت المعارف کے دولت کدہ پر

پہونچے، مگر سوء اتفاق کہ حضرت مولانا کے ایک پرانے مخلص وکیل عبدالوحید صاحب سخت بیمار ہوگئے اور حضرت مولانا ابرارالحق صاحب کا پیغام بھی پہونچا کہ میں پرتاپ گڈھ حضرت سے ملاقات کیلئے آرہا ہوں، اس لئے حضرت میرے پہونچنے سے چند گھنٹے پہلے پرتاپ گڈھ تشریف لے گئے اور مولانا قمرالزماں صاحب سے دعائیہ معذرت کا پیغام دے گئے۔ اتنا موقع نہیں تھا کہ میں پرتاپ گڈھ جاکر اسی دن واپس ہوسکوں۔ اس لئے کہ دوسرے دن دس بجے ٹرین تھی۔ اسلئے حضرت کی غائبانہ دعاؤں کے ساتھ یکم اکتوبر کو روانہ ہوا اور ۲؍اکتوبر کی صبح کو ۴ بجے منماڑ پہونچا اور نماز فجر پڑھ کر ہم لوگ مالیگاؤں کیلئے روانہ ہوئے ۶ بجے مالیگاؤں پہونچے، مالیگاؤں پہونچکر مسجد سے

ایک ہفتہ پہلے میں نے مولانا محمد حنیف صاحب ملی شیخ الحدیث معہد ملت کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی، مگر جب وہاں پہونچا تو مدرسہ کے کسی ذمہ دار سے ملاقات نہیں ہوئی۔ طلبہ نے بتایا کہ مولانا موصوف چار مہینے کے تبلیغی سفر پر چین گئے ہوئے ہیں، آپ لوگ بیٹھیں ابھی مولانا عبدالاحد صاحب نائب ناظم ادارہ آرہے ہیں۔ ابھی چند منٹ گذرے تھے کہ مولانا تشریف لے آئے۔ ان سے میری بالمشافہ پہلی ملاقات تھی مگر ایسا محسوس ہوا کہ برسوں سے دید وشنید ہے، مولانا سے اپنے سفر کا مقصد ظاہر کیا تو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا کہ آپ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوجائیں تو پھر لوگوں سے ملاقات کرائی جائے۔ اور تقریر وبیان کا پروگرام بنایا جائے۔ چنانچہ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے ہم لوگوں کو لے کر نعمت سیٹھ سے ملاقات کرائی۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا اور شام کو کھانے پر بلایا۔ اس کے بعد ہم لوگ لڑکیوں کی درس گاہ جامعۃ الصالحات گئے، جو مہاراشٹر کی سب سے بڑی لڑکیوں کی خالص دینی درسگاہ ہے۔ جس میں ۱۸ سو لڑکیاں پڑھتی ہیں اور ۱۲، ۱۳ سو دارالاقامہ میں رہتی ہیں، یہاں پورا درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ ادارہ کے ناظم اور نائب ناظم صاحب نے جب اپنا نصاب تعلیم دکھایا اور رائے پوچھی تو راقم الحروف نے ان کو ہندی اور انگریزی زبان اور ہوم سائنس بھی پڑھانے کا مشورہ دیا۔ ہوم سائنس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ صرف سلائی کڑھائی ہی نہیں بلکہ گھریلو صنعتوں (Cottage Industries) سے متعلق جتنی صنعتیں ہیں وہ انہیں انفرادی ذوق کے مطابق سکھادی جائیں۔ اس مشورہ پر کسی آمادگی کا اظہار تو محسوس نہیں ہوا

مگر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے مالیگاؤں سے تین چار کیلومیٹر آبادی سے دور منصورہ کے نام سے جامعہ محمدیہ کی جو نئی بستی بسائی ہے وہاں کے ذمہ داروں کو میری آمد کا علم ہوا تو ان کے ایک نمائندے۔ ۔ ۔ ـــــــ ۔ ۔ ـــــــ ۔ ۔ ۔ ـــــــ جامعۃ الصالحات آگئے اور انہوں نے منصورہ چلنے کیلئے کہا۔ مگر وہاں سے مجھے جامعۃ الہدی جانا تھا اس لئے ہم وہاں گئے اور پھر وہاں سے منصورہ گئے۔ منصورہ اس علمی بستی کا نام ہے جہاں طبیہ کالج اور لڑکے اور لڑکیوں کی الگ درسگاہیں ہیں۔ یہ بستی تقریباً ۲۵ ـ ۳۰ ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں طبیہ کالج عربی درسگاہ اور دار الاقامہ کی شاندار دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں، اس کے ساتھ اساتذہ اور ملازمین کیلئے رہائشی مکانات بھی بنے ہوئے ہیں۔ مغربی جانب لب سڑک شاندار مسجد ہے جو اپنی تعمیری خوبیوں میں آپ اپنی نظیر ہے۔ وہاں پہونچکر جدید دور کی یونیورسٹیوں کی عمارتیں بھی ہیچ نظر آتی ہیں۔ مگر اس بھرپور کمیت میں کیفیت کی کمی نظر آتی ہے، جس کا ذکر میں نے مولانا مختار احمد ندوی سے بھی کیا۔ جس کا ان کو بھی اعتراف ہے، یہاں سے ہم لوگ ۱۲ ½ بجے واپس ہوئے اور کھانے و نماز سے فارغ ہونے کے بعد معہد ملت کے طلبہ اور اساتذہ سے خطاب کا پروگرام مولانا ازہری صاحب نے بنا دیا تھا۔ اور پھر ۴ بجے جامعۃ الہدیٰ کے طلبہ کے سامنے خطاب کا پروگرام بھی انہوں نے ہی طے کرایا تھا۔ چنانچہ۔ دونوں بحمد اللہ پورے ہوئے۔

عصر کی نماز ہم لوگوں نے واپس آکر پھر معہد ملت میں پڑھی۔ پھر چائے پی کر خاص لوگوں کی ملاقات کیلئے گئے۔ اور پھر واپسی دس بجے رات کو ہوئی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ، جامعۃ الصالحات اور منصورہ کے پروگرام کے علاوہ ہر جگہ مولانا ازہری صاحب اور نوجوان عالم اور معہد کے مدرس مولانا زبیر احمد صاحب شروع سے آخر تک ساتھ ساتھ رہے۔

دوسرے دن اے ٹی ۔ ٹی انٹر کالج کے پرنسپل امان اللہ صاحب نے مولانا احمد کمال صاحب اور میری تقریر کا پروگرام رکھا تھا، ہم لوگوں کے پہونچنے میں قدرے تاخیر ہو گئی۔ ہمارے پہونچنے پر کالج کے دو طالب علموں کی تقریریں مسلم پرسنل لاء اور ملت کے مسائل پر ہوئیں، بچوں نے ایسی شستہ اور مدلل تقریریں کیں کہ بڑے بڑے اداروں کے بچے بھی شاید ایسی تقریر نہ کر سکیں

پھر مولانا احمد کمال صاحب نے پھر راقم نے بچوں اور اساتذہ کو خطاب کیا۔ راقم نے اپنی تقریر میں طلبہ کے ڈسپلن کی تعریف کی۔ اور یہ کہا کہ ہماری ملت کو جدید تعلیم کی ضرورت ہے اور پھر جدید تعلیم ہی نہ دی جائے بلکہ طلبہ میں امانت و دیانت کا احساس اور مقابلہ کی قوت بھی پیدا کی جائے۔ یہی امانت و دیانت اور مقابلہ کی قوت انہیں اونچا اٹھائے گی۔ اور دوسرے لوگ انہیں نظر انداز بھی کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں گے۔

ابھی راقم نے وہاں کے طلبہ کے ڈسپلن کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل سنیئے۔ اسکول ۸ بجے صبح سے ہوتا ہے، طلبہ پونے آٹھ بجے پہونچ گئے اور زمین کے اوپر قطار سے کھلے میدان میں دھوپ میں بٹھا دیئے گئے تقریباً ۱۲ سو طلبہ تھے، ہم لوگوں کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ اس لئے یہ پروگرام تقریباً ۱۰ بجے تک چلتا رہا مگر کیا مجال کہ بچے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے نظر آتے ہوں یا شور شرابا کر رہے ہوں۔ بلکہ دو گھنٹے تک تیز دھوپ میں بڑی سنجیدگی سے بیٹھے رہے۔ میں نے تقریر میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ یو پی کے لڑکے ہوتے تو یہی نہیں کہ سنجیدگی سے بیٹھے نہیں رہتے بلکہ شاید برا بھلا بکتے ہوئے اٹھ کر چلے جاتے۔

اس پروگرام کے بعد پرنسپل صاحب نے سارے شعبوں کا معائنہ کرایا۔ ہر درجہ کے سامنے اردو زبان میں جلی حروف میں خوشخط مناسب اخلاقی عبارتیں یا اشعار لکھے ہوئے تھے، اور ہر چیز سے سلیقہ مندی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کالج میں ۲۴ سو لڑکے ہیں اور دو شفٹ میں چلتا ہے۔ سائنس کا شعبہ بھی ہے۔ انٹر تک تمام مضامین اردو کے ذریعہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس پروگرام کے بعد ہم لوگ دو ایک جگہ مدرسہ کیلئے گئے۔ اور پھر واپس آکر جمعہ کی تیاری میں لگ گئے۔ جمعہ کی نماز راقم کو وہاں کی نورانی مسجد میں پڑھانی تھی۔ اور نماز سے پہلے بیان بھی تھا۔ ہم لوگ سوا بارہ بجے مسجد پہونچ گئے۔ مولانا ازہری صاحب اور مدرسہ کے دوسرے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت یہیں جمعہ میں موجود تھی۔ بحمد اللہ آدھ گھنٹہ بیان ہوا۔ پھر نماز ہوئی اور پھر نماز کے بعد ایک ماسٹر صاحب جن کا نام یاد نہیں رہ گیا کے یہاں کھانا کھایا گیا۔ ان حضرات نے بڑے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ حاجی نظام الدین صاحب ایڈوکیٹ کے گھر چلے گئے۔ اور وہیں عصر تک آرام کرتے رہے۔

ایک لطیفہ مالیگاؤں پہونچنے کے پہلے ہی دن ہم لوگ شام کو روشن سائزنگ میں اسرار صاحب اعظمی کے دفتر پہونچے، اتفاق سے موجود نہیں تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اسی کے قریب نظام الدین صاحب نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔ میں نے اسرار صاحب کے بھائی سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس وقت فلاں جگہ ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ فون کیجئے کہ وہ مجھ سے مل لیں۔ انہوں نے فون کیا اور پھر فون مجھے دے دیا۔ میں نے نظام الدین صاحب سے کہا کہ میں مجیب اللہ بول رہا ہوں، وہ نہ سمجھ سکے۔ کئی بار پوچھا تو میں نے بتایا کہ مجیب اللہ جامعۃ الرشاد۔ ان کو فون پر سنائی دیا کہ مجیب اللہ جاوید ورکشاپ۔ چونکہ وہ ایک ورکشاپ میں بیٹھے تھے اس لئے اس بھوکے کی طرح جس سے پوچھا گیا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا کہ چار روٹی۔ خیر انہوں نے کہا کہ میں روشن سائزنگ آرہا ہوں۔ ۱۰ منٹ کے بعد جب وہ پہونچے تو مجھے دیکھ کر حیرت میں آگئے اور ہنستے ہوئے بولے کہ آپ کے یہاں آنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، اور پھر جاوید ورکشاپ کا لطیفہ سنایا جس کو سنکر پوری مجلس دیوار قہقہہ بن گئی۔ اس کے بعد مولانا ازہری صاحب اور مولانا زبیر صاحب کے ساتھ مولانا رفیع الدین اور غفران سیٹھ سے ملے، نظام الدین صاحب اور ماسٹر یعقوب صاحب بھی سایہ کی طرح ساتھ رہے دوسرے دن نظام الدین صاحب نے بڑی پرتکلف دعوت کی۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا رفیع الدین صاحب جو وہاں مولانا کے لقب سے مشہور ہیں بڑی فراخ دلی سے اعانت بھی کی اور تیسرے دن رات میں بڑی شاندار دعوت کی۔ جس میں نظام الدین صاحب، ماسٹر یعقوب صاحب، مولانا عبدالاحد ازہری صاحب اور مولانا زبیر صاحب وغیرہ بھی شریک تھے، انہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے اچھی خاصی کاروباری ترقی کر لی ہے۔ ان کے ایک شریک جناب سیٹھ حاجی غفران صاحب رسالہ کے خریدار بنے اور ایک اچھی رقم سے مدرسہ کی اعانت کی۔

ماسٹر یعقوب صاحب جن کا ذکر اوپر آچکا ہے انجان شہید کے رہنے والے ہیں، بڑ مذاق ہونے کے ساتھ بہت سی خصوصیات کے مالک ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ملازمت کرتے ہوئے تیس برس ہو گئے مگر اس پوری مدت میں اسکول کے اندر نہ کبھی پیشاب کیلئے درجہ سے نکلے

اور نہ بیت الخلاء کیلئے اور نہ کبھی پوری چھٹی لی۔ اور نہ کبھی ایک منٹ لیٹ پہونچے۔

آخری دن حاجی عبدالمجید صاحب بھی ہمارے قافلہ میں شامل ہوگئے اور وہ کئی جگہ لے گئے اور اپنی مسجد میں بیان بھی کرایا۔

نعمت سٹینہ اور ان کی دعوت کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ایک اچھی رقم پیش کی۔ اس وقت مالیگاؤں کا پورا کاروبار کساد بازاری کا شکار ہے اسلئے جن حضرات نے اعانت کی وہ یہ کہتے ہوئے کہ کیا کیا جائے اس وقت کاروبار مندہ ہے ورنہ ہم لوگ کچھ اور خدمت کرتے یہاں کے تمام اعانت کرنے والے کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں ہے مگر اسرار صاحب روشن سائزنگ، مولانا محمد ایوب صاحب قاسمی، سرفراز ٹریڈنگ کمپنی، انصار سائزنگ کے ذمہ دار حاجی عبدالعزیز سردار صاحب، حاجی عبدالرحمن صاحب، مولانا محمد یحییٰ صاحب زبیری ہاؤس تاشقند باغ، حاجی عبدالستار صاحب تاشقند باغ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مالیگاؤں کے بارے میں مجموعی تأثر

میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ ایک نئی آبادی ہے جو سو ڈیڑھ سو برس کے اندر آباد ہوئی ہے مگر معلوم ہوا کہ یہ ایک تاریخی آبادی ہے اور بہت سی تاریخی یادگاریں اس سے وابستہ ہیں یہ بستی راجہ نارو شنکر کی آباد کردہ ہے۔ جو ۵۷ – ۱۷۵۰ء کے درمیان آباد ہوئی، اس وقت وہ مرہٹوں کی فوج میں تھے، پھر عالمگیر ثانی سے وابستہ ہوئے اور اس نے ان کو کچھ جاگیریں دیں۔ اس کا بنایا ہوا قلعہ اور مسجد آج بھی موجود ہے۔

کانگریس گراس

وہاں ایک گھاس ہر طرف نظر آتی ہے جو بالکل بے کار ہوتی ہے، میں نے پوچھا کہ اس گھاس کا کیا نام ہے، لوگوں نے بتایا کہ کانگریس گراس، یہ نام سنکر بڑی ہنسی آئی اور میں نے ساتھ والوں سے کہا کہ یہ موجودہ کانگریس پارٹی کی بالکل صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ جو نظر تو بہت آتی ہے مگر بیکار ہے۔

یہ ایک کاروباری بستی ہے جہاں ہر وقت پاور لوم کی آواز آتی رہتی ہے۔ زیادہ تر یہاں معمولی سوتی کپڑے تیار ہوتے ہیں۔ مگر کاروباری جگہ ہوتے ہوئے بھی یہاں دینی فضا قائم ہے اور علم دین کا چرچا ہے، اور ساتھ ہی جدید تعلیم کے بھی متعدد ادارے ہیں جنہیں اے، ٹی، ٹی، آئی

کالج سب سے ممتاز ہے۔ چار عربی مدرسے ہیں جن میں سب سے ممتاز معہد ملت اور جامعہ محمدیہ ہے اور تین لڑکیوں کی درسگاہیں ہیں جن میں سب سے بڑی درسگاہ جامعۃ الصالحات ہے۔

معہد ملت کی فضا معہد ملت کی جدید عمارت آبادی سے دور بنی ہے جس کے ہر طرف میدان بلکہ سبزہ زار ہے اور شرقی طرف پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ تقریباً دس ایکڑ میں ہے، ابھی ایک عمارت بنی ہے، مسجد زیر تعمیر ہے اور مسجد سے ملحق دار الاقامہ کا پروگرام ہے۔ جس زمین پر اس کی جدید عمارت بنی ہے وہ زمین ادارہ کے بانی مولانا عبد الحمید صاحب نعمانی مرحوم کی تھی۔ جسے انہوں نے مدرسہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

یہاں بعض درسگاہوں کی عمارتیں بہت شاندار بنی ہیں مگر تعلیم و تربیت کی جو سنجیدہ اور پرکشش بلکہ نورانی فضا یہاں نظر آئی وہ دوسری جگہوں میں دکھائی نہیں دی، یہاں کے اساتذہ اور طلبہ سب میں ایک توازن اور اعتدال نظر آیا اور دینی احساس کے ساتھ ملی مسائل سے واقفیت اور دلچسپی نظر آئی۔ ملت کے ہر طبقے اور ہر مکتب فکر کے لوگوں سے ان کے روابط ہیں، مختلف وجوہ سے تعلقات میں کمی بیشی ضرور ہوگی مگر کسی طبقہ یا مکتب فکر کو نظر انداز نظر نہیں آیا اس وقت ہمارے دینی طبقہ میں سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ ہر طبقہ حق و صداقت اور دین و تقویٰ کو اپنے دائرہ میں محدود کئے ہوئے ہے، اپنے دائرہ سے باہر اسے نہ تو پورا حق دکھائی دیتا ہے اور نہ دین و تقویٰ کا کوئی اونچا معیار نظر آتا ہے۔

معہد کی رات معہد ملت میں تین راتیں رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں بلکہ رشک ہوا کہ اس وقت رات میں وہاں کوئی استاذ بحیثیت نگراں نہیں رہتا، بلکہ بڑے طلبہ ہی عام طلبہ کو نماز وغیرہ کیلئے اٹھاتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ فجر کی نماز میں مشکل سے دو ایک طالب علم مسبوق نظر آئے۔ کچھ طلبہ صبح صادق سے پہلے اٹھ کر تہجد پڑھتے نظر آئے اور پھر اذان سے پہلے بیٹھ کر انہوں نے مدرسہ کیلئے اجتماعی دعا کی۔ فجر کی اذان سے پہلے راقم الحروف کو ایک پیالی چائے پینے کی عادت ہے۔ اس کیلئے مولانا عبد الاحد صاحب نے ایک طالب علم کو مقرر کر دیا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر چائے پیش کر دیتا تھا۔ غرض یہ کہ احیائے لیل

کی پوری کیفیت نظر آئی اللہ تعالیٰ ادارہ کو مزید ترقی نصیب کرے۔ آمین۔

بمبئی میں چند دن

۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ہم لوگ مالیگاؤں پہونچے تھے اور تین دن رہ کر ۵ر اکتوبر کو وہاں سے بمبئی جانے کا پروگرام تھا۔ مولانا عبدالاحد صاحب نے دو طالب علموں کو بس کے ٹکٹ اور ریزوریشن کیلئے اسٹیشن بھیجدیا تھا۔ مگر چلتے وقت سارے اساتذہ مولانا ازہری صاحب کے کمرے میں رخصت کرنے کیلئے آگئے تھے اس لئے مولانا نے فرمایا کہ ان کو کچھ نصیحت کردیں، میں نے چند باتیں عرض کیں، اس کی وجہ سے بس کا وقت نکل گیا اور ٹکٹ واپس کرنا پڑا۔ جب ہم لوگ بس اسٹیشن پہونچے تو وہاں چند طلبہ کے علاوہ مولانا زبیر احمد، حاجی نظام الدین صاحب اور ماسٹر یعقوب صاحب بھی موجود تھے۔ حالانکہ ان دونوں حضرات سے رات میں رخصت ہو چکے تھے۔ مگر ازراہِ محبت یہ لوگ رخصت کرنے بس اسٹیشن تک آگئے اور بڑی محبت سے لوگوں نے رخصت کیا۔ مالیگاؤں، ناسک کا سفر ٹیکسی کے ذریعہ ہوا۔ وہاں کے عام مزاج کے مطابق ٹیکسی والا صرف چھ سواری لے کر بڑی ذمہ داری سے روانہ ہو گیا۔ اور سوا سو کلومیٹر کا سفر دو سوا دو گھنٹے میں طے کر لیا اور پھر ناسک سے ہم لوگ بس سے بمبئی روانہ ہو گئے۔

مہاراشٹر کے بارے میں ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ زیادہ تر غیر زرعی علاقہ ہے مگر مالیگاؤں سے بمبئی تک ہر طرف زرخیزی ہی نظر آئی، جابجا انگور کے باغات دکھائی دیئے اور دھان، باجرہ اور گنے کی کھیتی کثرت سے نظر آئی۔ ادھر کی مٹی کچھ ایسی مرطوب قسم کی واقع ہے کہ پانی کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے مگر پھر بھی جابجا نہریں اور ٹیوب ویل نظر آئے۔

ہماری بس ۴ بجے شام کو بمبئی پہونچی۔ پہلے سے مدرسہ رحمانیہ مدنپورہ میں قیام کیلئے مولانا محمد عمر صاحب ندوی ناظم مدرسہ کو مولانا احمد کمال صاحب نے لکھدیا تھا۔ وہ ہم لوگوں کے انتظار میں تھے۔ ہم لوگوں کے پہونچتے ہی انہوں نے ایک صاف ستھرے کمرے میں ٹھہرنے کے سارے انتظامات کر دیئے، نہا دھو کر عصر کی نماز پڑھی گئی۔ اور چائے پی کر ہم لوگ مولانا قاری ولی اللہ صاحب سے ملنے مسجد نور چلے گئے اور وہیں عشاء کی نماز پڑھی گئی۔ نماز کے بعد وہیں محترم حاجی شمس الدین صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے دفتر پہلوی بیکری لے گئے اور ایک گھنٹہ

ٹھہر کر پھر ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔

دوسرے دن شفقت علاؤ الدین صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ جنہوں نے کئی آدمیوں سے ملاقات کرائی۔ ان میں عزیزی ظفر الاسلام شاہ صاحب کی ملاقات سے قلبی مسرت ہوئی۔ ان کے اخلاق وسلوک کا قلب پر بے حد اثر ہے۔ جتنے دن بمبئی میں رہنا ہوا میں برابر ان کے یہاں جاتا رہا اور اپنی قیام گاہ کے علاوہ وہیں پہونچکر سکون ملتا تھا۔ انہوں نے نہ صرف خود اچھی اعانت کی بلکہ دوسروں سے بھی کرائی۔ مولانا محمد عمر صاحب نے جس خلوص و محبت سے مہمان نوازی اور سلوک کیا اس کا قلب ودماغ پر نہ مٹنے والا غیر معمولی اثر ہے۔ ان کے علاوہ علماء میں مولانا غلام جیلانی صاحب، مولانا جنید عالم صاحب، مولانا اسرار صاحب، مولانا قاری ولی اللہ صاحب اور مولانا مختار احمد صاحب ندوی کی ملاقات سے بھی بے حد مسرت ہوئی۔ خاص طور پر مولانا غلام جیلانی صاحب نے تو کئی جگہ میرا پروگرام کرایا اور ہر طرح کی عزت افزائی کی، صابو صدیق ٹیکنیکل کالج کے وسیع ہال میں بہت بڑا جمعہ ہوتا ہے جس میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے ہیں۔ جمعہ مولانا جیلانی صاحب پڑھاتے ہیں اور جمعہ سے پہلے تقریر کرتے ہیں۔ ایک جمعہ کو انہوں نے یہ خدمت میرے سپرد کر دی۔ بحمد اللہ کچھ کہنے سننے کا لوگوں پر اچھا اثر ہوا۔ پھر انہوں نے اسی دن رات کو تامل ناڈ بیت الحجاج میں بیان کرایا۔ اور پھر اتوار کو خلافت ہاؤس میں جس میں خواص کا مجمع تھا۔ وہاں کچھ کہنے سننے کا موقع ملا۔ مولانا انجمن اسلام ہائی اسکول میں عربی اردو کے استاد ہیں۔ مگر ان کی علمی وعملی سرگرمیاں صرف ملازمت تک محدود نہیں بلکہ پورے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔

مولانا جنید صاحب کپڑے کے اچھے تاجر ہیں اور اپنے والد مولانا اسحٰق صاحب مرحوم کی طرح باغ وبہار ہیں۔ انہی کے ذریعہ مولانا اسرار صاحب سے تعارف ہوا۔ مگر ملاقات کے بعد یہ علم ہوا کہ انہوں نے بیس برس پہلے "اہل کتاب صحابہ وتابعین" پڑھی تھی۔ اسی وقت سے غائبانہ متعارف تھے۔ انہوں نے ایک دن کھانے پر بلایا۔ مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ نہیں پہونچ سکے۔ اور بعد میں معذرت کرنی پڑی۔ بحمد اللہ صاحب اثر عالم ہیں۔

مولانا قاری ولی اللہ صاحب مسجد نور کے امام ہیں اور بزرگوں کے طریقہ پر زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے ان کا دینی واخلاقی اثر بہت وسیع ہے۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور مہتاٹرانسپورٹ

کے مالک جناب بابو بھائی مہتا سے ملاقات کرائی۔ انہوں نے اعانت بھی کی اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ میری چھڑی دیکھ کر انہوں نے کہا کہ آپ چھڑی کیوں لگاتے ہیں؟ میں نے کہا کہ سنگاپور میں پھسل کر گر گیا تھا جس کی وجہ سے بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بحمد اللہ وہ جڑ گئی اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ مگر چھڑی سے سہارا ملتا ہے۔ انہوں نے نام لے کر کہا کہ میں نے فلاں فلاں علماء کو ایک ایک چھڑی دی ہے کیا ایک چھڑی آپ بھی قبول کریں گے۔ میں نے کہا بسر و چشم۔ ان کے اس اخلاق سے قلب متاثر ہوا۔

مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اپنے معیار سے نہیں بلکہ ہم لوگوں کے معیار سے مدرسہ کے ساتھ تعاون بھی کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے طرز عمل میں ندویت کو غالب رکھیں اور ندویت نام ہے اعتدال و توازن کا۔ جس کی امت کو اس وقت سخت ضرورت ہے انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی بعض مجبوریوں کی وضاحت کی۔

حاجی ابوبکر صاحب گجراتی بھی لائق تشکر ہیں۔ جنہوں نے اپنی بعض پریشانیوں کے باوجود راقم الحروف کے ساتھ بغیر کسی سابقہ تعارف کے ہر طرح کا تعاون کیا، وہ کئی بڑے تاجروں سے ملاقات کرانا چاہتے تھے مگر اپنی مشغولیت کی وجہ سے وہ بھی کم وقت نکال سکے اور جب انہوں نے وقت نکالا تو ہم لوگ ساتھ نہ ہو سکے۔ پھر بھی ایک بڑے تاجر سے ملاقات کرائی۔ جنہوں نے بڑے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ بات چیت کے درمیان انہوں نے کہا کہ مولانا ہم لوگوں کیلئے دعا کریں۔ میں نے عرض کیا کہ میں ایک چھوٹا آدمی ہوں، میری دعا کیا۔ مگر ایک مومن کو دوسرے مومن کے حق میں دعا کرنی چاہیئے اس لئے دعا کروں گا۔ اس پر انہوں نے جواب میں جو مومنانہ بات کہی اس سے آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ انہوں نے کہا کہ مولانا آپ لوگ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس جو علم دین کی دولت ہے اس کو کوئی زوال نہیں ہے۔ اور ہم لوگوں نے چار پیسے کما لئے ہیں اس لئے ایرکنڈیشن میں بیٹھے ہیں۔ ابھی یہ چھن جائے تو سڑکوں کے عام آدمیوں کی طرح ہو جائیں گے۔

ہم لوگ دو چار لاکھ میں بے خود ہو جاتے ہیں اور یہ کروڑوں میں رہ کر اپنے کو بے حیثیت سمجھتے ہیں۔ ایسا ہی ہے۔ من تواضع للہ رفعہ اللہ۔ جو اللہ کیلئے خاکساری اختیار کرتا ہے

اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتے ہیں۔

فیض الرحمٰن صاحب لبرٹی بیکری کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے بھی اچھے اخلاق کا ثبوت دیا۔ گھر پر دعوت بھی کی اور تعاون بھی کیا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مولانا غلام جیلانی صاحب کی خواہش پر ہم لوگوں نے جمعہ کی نماز صدیق ٹیکنیکل کالج میں پڑھی۔ اور بیان بھی ہوا۔ ایک ہفتہ بعد کالج کے ایک ذمہ دار عبد القیوم صاحب مدرسہ رحمانیہ تشریف لائے اور کالج کے پرنسپل حسن صاحب کا پیغام دیا کہ ان کی خواہش ہے کہ آپ ایک دن ہم طلبہ سے خطاب کریں۔ میں نے دوسرے دن عصر بعد کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ ہم لوگوں نے وہاں کی قریب کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی اور پھر اس جگہ گئے جہاں طلبہ جمع تھے۔ راقم الحروف نے آدھ گھنٹہ طلبہ سے خطاب کیا۔ بس ان سے دو تین خاص باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ آپ محنت کے عادی بنیں، وہی انسان زندگی میں کامیاب ہوتا ہے جو اپنے کام میں محنت کرتا ہے۔ آپ یاد رکھیں کہ ذہانت کبھی محنت کا بدل نہیں ہو سکتی عام طور پر جو طلبہ صرف اپنی ذہانت کے بل پر آگے بڑھتے ہیں وہ آگے چل کر ناکام ہو جاتے ہیں اور متوسط درجہ کے لڑکے بھی اگر محنت کے عادی ہو جاتے ہیں تو وہ زیادہ کامیاب رہتے ہیں، دوسری بات یہ عرض کی کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جو طلبہ جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کو اپنے اندر مقابلہ کی قوت پیدا کرنی چاہیئے خوشامد اور رعایت طلبی کے بجائے اپنی صلاحیت سے آگے بڑھنے کی آپ کوشش کریں۔ جن قوموں میں یہ حوصلہ پیدا ہوجاتا ہے وہ سربلند ہو کر رہتی ہے۔ امریکہ کے یہودیوں کی مثال آپ کو سامنے رکھنی چاہیئے۔ جب ایک یہودی سے ہندوستان کے ایک صحافی نے پوچھا کہ آپ لوگ امریکہ میں ۳۔۴ ر فیصد ہوتے ہوئے کیسے اس کی معشیت اور سیاست پر چھائے ہوئے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ ہم نے امریکہ میں یہ طے کر لیا ہے کہ جس پرچہ میں امریکی بچہ ۷۵ ر فیصد نمبر لاکر امتیاز حاصل کرتے ہیں اس میں ہمارے بچے ۹۰۔۹۵ فیصد نمبر لائیں گے تب ان کو امتیاز ملے گا۔ ہم نے اپنی نسل کو اسی طرح تیار کیا ہے جس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

تیسری بات یہ عرض ہے کہ برادران وطن کیلئے تعلیم کے سلسلہ میں ایک مسئلہ ہے کہ ان کے بچے موجودہ تعلیم حاصل کریں اور ان میں ہر طرح کا امتیاز حاصل کریں، مگر تمہارے

اوپر تعلیم کے سلسلہ میں دہری ذمہ داری ہے۔ ایک طرف تمہیں جدید تعلیم حاصل کر کے اچھے انجینیئر اچھے ڈاکٹر اور اچھے ٹیکنیشین بننا ہے تو دوسری طرف تمہیں اچھا مسلمان بھی بننا ہے۔ اگر تم دین کی بنیادی تعلیم سے محروم رہ گئے تو پھر تمہاری اس ترقی سے نہ تو تم کو فائدہ ہوگا اور نہ ملت کو۔ بلکہ مولانا محمد علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین بننے کے بجائے تم حمید دلوائی اور چھاگلا بنو گے۔

عزیزو! میری خواہش ہے کہ تم دین وملت کیلئے بھی مفید بنو اور ملک کیلئے بھی مفید ہو اس وقت ملک میں ہر طرف رشوت، بددیانتی اور لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ تم اپنے کو دیانتدار اور باکردار شہری بنانے کی کوشش کرو۔ تم عثمان بریگیڈیئر اور حولدار عبدالحمید بنو تو کوئی حرج نہیں ہے مگر کمار نرائن نہ بننا جس نے چند پیسوں کیلئے ملک کے اہم راز بیچ دیئے۔

تقریر کے بعد پرنسپل صاحب نے سارے ٹیکنیکل شعبوں کو دکھایا، یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ درجنوں ایسے لڑکے ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں جو ہائی اسکول فیل ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اسکول کے مسلمان طلبہ کے علاوہ ایسے مسلمان لڑکوں کو مختلف کاموں کیلئے چھ مہینے یا تین مہینے ٹرینڈ کر دیتے ہیں جو آگے تعلیم حاصل نہیں رکھ سکتے یا وہ اتنی ذہنی صلاحیت نہیں رکھتے انشاءاللہ چھ مہینے میں یہ اس قابل ہوجائیں گے کہ سو پچاس روز کما سکیں۔ انہوں نے لڑکوں کا بنایا ہوا لکڑی کا ایک خوبصورت گلدان بھی تحفتہً پیش کیا۔

اوپر میں مہاراشٹر کے بارے میں ذکر کر چکا ہوں کہ یہاں کے مسلمان دینی ودنیاوی تعلیم اور معاش دونوں لحاظ سے مشرقی ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت آگے ہیں۔ اور پھر صنعتی اور پیشہ وارانہ ادارے قائم کر کے انہوں نے وہ کام کیا ہے جو شاید مسلمانوں کی بعض حکومتیں نہیں کر سکی ہیں۔

چھوٹی بڑی اور بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں مگر اس وقت انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے ناانصافی ہوگی اگر یہاں شمس پیرزادہ کے ادارہ دعوۃ القرآن کا ذکر نہ کروں۔ ان سے بیس برس پہلے کی ملاقات تھی۔ مگر ملاقات کے وقت ایسا محسوس ہوا کہ ملاقات کا تسلسل قائم رہا ہے انہوں نے بڑی محبت سے اپنا ادارہ دکھایا اور اپنے علمی کاموں کے پروگراموں کی تفصیل بیان کی جس سے خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ اپنے کن کن بندوں سے کس کس طرح کام لے رہا ہے۔

انھوں نے بڑے خلوص سے کہا کہ میں نے ادارہ کیلئے ایک اچھا بڑا فلیٹ لیا ہے ، ابھی وہ خالی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ وہیں ٹھہریں مگر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ بہت مناسب جگہ قیام ہے، چند دن رہنا ہے ورنہ میں ضرور یہ سعادت حاصل کرتا۔

مدرسہ رحمانیہ

اوپر ذکر آچکا ہے کہ بمبئی میں ہم لوگوں کا قیام مدرسہ رحمانیہ میں تھا، یہ چار منزلہ عمارت ہے جس میں نیچے کے حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تین منزلیں مسجد بھی ہیں اور مدرسہ بھی۔ اوپر والی منزل میں صرف ٹین ڈالکر شیڈ کر دیا گیا ہے۔ ان تینوں منزلوں میں وہ بچے اور بچیاں پڑھتی ہیں جو صبح یا شام کو اسکولوں میں پڑھتی ہیں۔ بمبئی میں عام طور پر اسکول دو شفٹ میں چلتے ہیں۔ مسلمانوں کے سارے اسکول اردو میڈیم ہیں، مگر قرآن پاک اور دینیات پڑھانے کیلئے عام طور پر مسجدوں میں مدرسے قائم ہیں۔ مدرسہ رحمانیہ میں بھی یہی صورت ہے۔ جو لڑکے اور لڑکیاں شام کی شفٹ میں مختلف اسکولوں میں جاتی ہے ان کیلئے صبح ۷ ½ بجے سے دس بجے تک قرآن پاک اور دینیات کے کلاس چلتے ہیں۔ اور جو بچے صبح کی شفٹ میں اسکولوں میں جاتے ہیں ان کے لئے ۲ بجے سے ۴ ½ تک کلاس چلتے ہیں۔ تقریباً ۸ سو بچے اس طرح مدرسہ رحمانیہ میں صبح و شام قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ صرف نام کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ جس طرح بڑے بڑے معیاری اسکولوں میں تعلیم کا نظام ہوتا ہے وہ یہاں دیکھنے میں آیا۔ اساتذہ یسرنا القرآن یا قرآن پاک ادائے مخارج کے ساتھ اور دینیات بالکل جدید انداز میں پڑھاتے ہیں۔ اور ہر درجہ میں بلیک بورڈ کا باقاعدہ استعمال ہوتا ہے۔ گھنٹی کے بعد ایک منٹ کوئی لڑکی یا لڑکا تاخیر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اساتذہ گھنٹی سے ۱۵ منٹ پہلے ناظم کے کمرہ میں پہونچ جاتے ہیں۔ اور پھر رجسٹر پر دستخط کر کے درجوں میں جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہدایت دینی ہوتی ہے تو ناظم صاحب ہدایت دے دیتے ہیں۔ ۷۔ ۸ مدرس تعلیم کا کام انجام دے رہے ہیں، خود ناظم مولانا محمد عمر صاحب پورے وقت میں تعلیم کی نگرانی کرتے ہیں۔ کتنی مسجدوں میں اس طرح کا نظام ہے۔ مگر پورے بمبئی میں اتنا منظم انتظام دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

۲۴ گھنٹے بھیونڈی میں

ابھی تک ہم لوگ بھیونڈی نہیں جا سکتے تھے۔ ۱۵ اکتوبر کو بمبئی سے ہم لوگ بھیونڈی گئے۔ اور سید سے ہندوستانی مسجد مدرسہ مفتاح العلوم میں پہونچے۔ وہاں مولانا شہاب الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت سے لوگوں سے ملاقات کرائی۔ اور مغرب بعد تبلیغی جماعت کے مرکز میں بیان کرایا۔ اور اعلان کر کے عشاء بعد ہندوستانی مسجد میں بیان کرایا۔ وہاں مولانا شہاب الدین صاحب کے علاوہ حکیم عزیز الرحمن صاحب، ڈاکٹر منظور احمد صاحب مولانا فیاض صاحب اور مولانا احسان صاحب ندوی سے بھی ملاقات ہوئی، ڈاکٹر منظور صاحب کے دینی جذبات اور علمی ذوق نے بہت متاثر کیا۔ وہاں فیضان احمد صاحب اور نیاز احمد صاحب نے بھی بڑی خوش اخلاقی کا ثبوت دیا۔ اور مدرسہ کی اعانت بھی کی۔

مولانا شہاب الدین صاحب مدرسہ مفتاح العلوم کے روحِ رواں ہیں، وہ قلندرانہ انداز میں ہر وقت رواں دواں رہتے ہیں اور بحمد اللہ وہ خواجہ میر درد کے اس شعر کے مصداق ہیں۔

ہمیشہ نظروں میں اپنی سبک میں رہتا ہوں
دیا ہے اوروں کی نظروں نے گو وقار مجھے

مہاراشٹر کے مسلمان اور وہاں کی حکومت

مہاراشٹر کے مسلمانوں نے تعلیمی اور معاشی دونوں محاذوں پر پوری توجہ دی ہے، اور ساتھ ہی دینی احساس سے بھی وہ خالی نہیں ہیں۔ میں جہاں گیا اور جس مسجد میں گیا، پانچوں وقت مسجدیں آباد پائیں اور تبلیغی کام ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آیا۔ بمبئی ہندوستان کی سب سے بڑی معاشی منڈی ہے اور ساری انسانی زندگی اسی چکی کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ مگر اس معاشی دوڑ دھوپ بلکہ اس کے چکر میں وہاں کے مسلمانوں نے اپنی تعلیمی اور دینی ذمہ داری کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ع

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

تعلیمی اور دینی احساس میں عام طور پر اگر کمی پائی تو ان لوگوں میں جو یوپی اور بہار سے جا کر وہاں اپنا دھندا کر رہے ہیں۔ تعلیمی جد و جہد کا ذکر ہم اوپر کئی جگہ کر چکے ہیں وہاں کے عام

مسلمانوں میں خاص طور پر مدارسیوں اور گجراتیوں میں سیاسی چرچا بہت کم سنائی دیا۔ وہاں جو لوگ سیاسی میدان میں ہیں وہ عموماً اونچے درجے کی سیاست کرتے ہیں۔ یوپی اور بہار کی ہوٹل اور شرک والی سیاست وہاں مسلمانوں میں بہت کم دکھائی دی۔

وہاں ایک شاندار ہائر سنٹر لہ بیت الحجاج کئی کروڑ کی لاگت سے بنایا گیا ہے۔ جو مہاراشٹر کے مسلمانوں کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے کئی تقریروں میں مہاراشٹر کی حکومت کی تعریف کی کہ ہندوستان کے سیکولر دستور کی اگر کچھ لاج رکھی ہے تو مہاراشٹر کی حکومت نے۔ مسلمانوں کے سارے تعلیمی ادارے کالج کی سطح تک اردو میڈیم میں چلتے ہیں۔ اور اردو کی کتاب بھی حکومت اسی طرح چھاپتی ہے جس طرح دوسری زبانوں کی چھپتی ہیں اور اردو کی کتابیں ہر جگہ فراوانی سے مل جاتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے معاملات میں بھی حکومت کا طرزِ عمل بسا غنیمت ہے۔ حکومت یوپی کی تنگ نظری۔ عصبیت اور جانبداری بہت کم دکھائی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ بال ٹھاکرے وغیرہ کی ہرزہ سرائی کا مسلمانوں پر بہت کم اثر پڑتا ہے۔

یہ معلوم کر کے بھی خوشی ہوئی کہ ملت نگر، رحمت نگر وغیرہ کے نام سے مسلمانوں کی کچھ نئی کالونیاں بن رہی ہیں۔ جس میں خالص مسلمانوں کی آبادی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہاں کے مسلمان زندگی کے ہر میدان میں۔ بحمد اللہ ترقی کر رہے ہیں۔ مگر جدید تعلیم یافتہ اور کچھ سیاسی افراد ایسے بھی ہیں جن کے اندر چھاگلا اور حمید دلوائی کے جذبات ہیں مگر مصلحتاً وہ ظاہر نہیں کرتے۔

۲۰ راکتوبر ۱۹۸۶ء کو ہم لوگ ۱۱½ بجے رات میں مہانگری سے واپس ہوئے اسٹیشن پر رخصت کرنے کیلئے مولانا محمد عمر صاحب اور مولوی عبداللہ صاحب ساتھ تھے، مولانا محمد عمر صاحب نے چلتے وقت کچھ تحفے دیئے اور بار بار اس افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ ہم لوگوں سے کوئی خدمت نہ ہو سکی حالانکہ انہوں نے توقع سے زیادہ مہمان نوازی ہی نہیں کی بلکہ حسن سلوک کیا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

وفیات

ندوہ کا ایک اور روشن چراغ گل ہوا

میں دو ہفتہ پہلے بمبئی میں تھا کہ حاجی علاؤ الدین صاحب کے ذریعہ یہ جانکاہ خبر ملی کہ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ زبان سے بڑے درد کے ساتھ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ نکلا۔ اور خود ان کیلئے قرآن پاک پڑھ کر مغفرت کی دعا کی۔ اور اسی وقت اپنے تاثرات وہاں کے اردو اخبارات انقلاب اور اردو ٹائمس میں لکھ کر بھیج دیئے۔ جس کا عنوان تھا۔

جو کام شاہوں سے نہ ہوسکا اسے ایک بوریہ نشیں نے پورا کردیا۔

مولانا محمد عمران خانصاحب ندوی کے انتقال سے ہم نہ صرف ایک دینی شخصیت سے محروم ہوگئے بلکہ ندوہ کی علمی تاریخ کا ایک روشن باب ختم ہوگیا۔ یا ایک روشن چراغ گل ہوگیا۔

مولانا عمران خانصاحب نے کئی بار راقم الحروف سے بھوپال آنے کیلئے کہا۔ پچھلے سال جو سمینار حضرت سید صاحبؒ ان کے اہتمام میں ہوا تھا اس میں بھی انہوں نے بلایا مگر سوءِ اتفاق کہ میں نہ پہونچ سکا بمبئی کے سفر سے پہلے برادرم مولوی منظور صاحب اعظم گڈھ آئے تھے انہوں نے کہا کہ مہتمم صاحب کی طبیعت خراب ہے بمبئی جاتے ہوئے بھوپال ہولیجئے ارادہ بھی تھا مگر افسوس ہے کہ میں ان سے آخری ملاقات نہ کرسکا جس کا قلق ہے۔

مولانا محمد عمران خانصاحب ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد ندوہ کے دفتر کے منصرم بنا دیئے گئے پھر وہ مزید تعلیم کیلئے ازہر گئے اور دسمبر ۱۹۳۰ء میں واپس آئے، اور واپس آتے ہی حضرت الاستاذ سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مسعود عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے مجلس انتظامیہ میں

سفارش کر کے انہیں ندوہ کا مہتمم بنا دیا۔ جس وقت انہوں نے ندوہ کا چارج لیا تو ندوہ کا دفتری ڈھانچہ پراگندہ تھا انہوں نے اسے درست کیا۔ چنانچہ اس کے بعد ندوہ میں جب مطلق مہتمم صاحب کہا جاتا تھا تو اس سے مولانا عمران خانصاحب ہی مراد ہوتے تھے۔

پھر اس زمانہ میں ندوہ کی مالی حالت بہت خراب تھی تقریباً ۱۰، ۱۵ ہزار کا اس کے اوپر قرض تھا۔ مہتمم صاحب نے اپنی ذاتی کوشش سے بھی اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی۔ اور حضرت سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب رحمہا اللہ کو بھی اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس کیلئے حیدرآباد کا سفر کریں۔ چنانچہ یہ حضرات حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے ۳۰ ہزار روپے ندوہ کیلئے لے آئے۔ یہ ۳۰ ہزار ۱۹۴۱ء کا تھا جو اس وقت ۳، ۴ لاکھ روپیہ کے برابر ہے۔ اس طرح ندوہ کی مالی دقت کسی قدر دور ہوئی۔

مولانا محمد عمران خانصاحب سے پہلے ندوہ عوامی ادارہ نہیں بن سکا تھا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے اندر چند رئیسوں کی اعانتیں اس کو ملتی تھیں۔ عوام سے بہت کم رابطہ تھا۔ مگر مولانا محمد عمران خانصاحب نے عوام سے بھی رابطہ قائم کیا۔

ندوہ سے عوام کے رابطہ کا ایک ذریعہ تبلیغی کاموں میں ان کی شرکت بھی تھی۔ ہم لوگ طالب علمی میں ان سے پہلے حضرت مولانا علی میاں کی قیادت میں مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں کئی چھٹیاں گذاریں۔ مگر جب انہوں نے اس کام میں حصہ لینا شروع کیا تو پھر اسی کے ہو رہے، اور دوسری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ اور ان کی دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں کے نتیجہ میں بھوپال کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور ۲۵، ۳۰ برس سے تبلیغی جماعت کا اجتماع وہاں تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے اور شاید کسی دوسری جگہ اس تسلسل کے ساتھ اجتماع نہیں ہوا۔

بھوپال کی تاج المساجد جو شاید ہندوستان و پاکستان کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ جس کی بنیاد نوابان بھوپال نے ڈالی تھی۔ مگر وہ مکمل نہ ہو سکی، اور ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ مولانا عمران خانصاحب مرحوم نے اس کی تکمیل کا ارادہ کر لیا۔ اور پھر پچاسوں لاکھ روپیہ خرچ کر کے اسے مکمل کر دیا۔ یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے، جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سنہرے حروف

سے نکھا جائے گا۔ مسجد سے متعلق بیسوں ایکڑ زمین تھی، جس پر غیروں نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ ان سب کو واگذار کرایا۔ اور پھر اس میں ایک شاندار دارالعلوم قائم کیا۔ آج سے کچھ سال پہلے تک عام طور پر ندویوں کا مزاج مدرسوں کے قیام کا نہیں تھا بلکہ ان کا زیادہ رجحان صحافت اور سرکاری ملازمت کا ہوتا تھا۔ مگر شاید مولانا محمد عمران خانصاحب ندوہ کے ملقہ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ندوی انداز کا ایک عربی مدرسہ قائم کیا۔ اور یہ کہنا بھی شاید صحیح ہوگا کہ راقم الحروف دوسرا ندوی ہے، جس نے مدرسہ کے قیام کو ایک بنیادی کام سمجھا اور ایک مدرسہ کے کام میں لگا۔ چنانچہ جب جامعۃ الرشاد قائم ہوا تو ایک بار مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہٗ بھی تشریف لائے اور مسجد کے میرے کمرے میں بیٹھ کر فرمایا کہ ہم تو مدرسہ سے اکتائے ہوئے ہیں اور تم مدرسہ قائم کر رہے ہو مگر اب کچھ اسباب کے بنا پر مولانا کی رائے بھی بدل گئی ہے۔

مولانا محمد عمران خانصاحب جس کام میں لگتے تھے وہ تن من دھن سے لگ جاتے تھے، وہ بیک وقت ایسے بہت سے کام اپنے ذمہ لینا پسند نہیں کرتے تھے جن کو وہ اچھی طرح اور پوری یکسوئی کے ساتھ نہ کر سکتے ہوں۔ وہ یک گیر محکم گیر کے قائل تھے۔

ندوہ کے ملقہ میں دو آدمی اپنے نظم و انتظام، صفائی، ستھرائی، سلیقہ مندی اور تعمیری ذوق کے لئے مشہور تھے۔ قدماء میں مولانا مسعود علی صاحب ندوی مرحوم اور متوسطین میں مولانا محمد عمران خانصاحب ندوی مرحومؒ کے ذوق تعمیر اور سلیقہ مندی کا نمونہ ندوہ کا انتظامی ڈھانچہ، تاج المساجد اور ان کا قائم کردہ دارالعلوم ہے۔

ایک بار ہم لوگ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں نظام الدین میں بیٹھے تھے، مہتمم صاحب بھی موجود تھے اسی درمیان ناشتہ آگیا، ناشتہ میں کچھ باسی روٹیاں اور باسی سالن کے ساتھ کچھ دالموٹ اور بسکٹ بھی تھا۔ آدمی زیادہ تھے اور دالموٹ بسکٹ صرف ایک پلیٹ میں رکھا ہوا تھا جس تک سب کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً ایک پلیٹ خالی کر کے اسے دو جگہ کر دیا۔ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ ندوہ والوں کی اسی سلیقہ مندی سے ہم خوش رہتے ہیں۔

بظاہر وہ سخت گیر تھے مگر نظم و انتظام کی حد تک۔ زندگی کے عام معاملات میں وہ سخت گیر نہیں

تھے ۔ایک سال راقم الحروف رمضان کی چھٹی ندوہ میں گزار رہا تھا۔جب رمضان المبارک کے شروع ہونے میں دو دن رہ گئے تو مجھے بلایا اور فرمایا کہ کیا تراویح نہیں سناؤ گے؟ میں نے عرض کیا کہ اگر کوئی مسجد مل جائے تو ضرور سناؤں گا۔ انہوں نے کتب خانہ کے ملازم علی احمد کو بلایا اور کہا کہ دیکھو گھسیانہ کے لوگ ایک حافظ چاہتے ہیں۔ جاؤ دریافت کر آؤ کہ وہ اب بھی چاہتے ہیں؟ وہ دو گھنٹہ بعد آئے اور بتایا کہ ہاں ضرورت ہے۔انہوں نے ان لوگوں کو بلاکر نظم کر دیا اور میں قرآن سنانے لگا۔ انہوں نے فرمایا کہ دیکھو کھانا ندوہ ہی میں کھانا وہاں نہ کھانا۔چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔مگر گھوسی لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ ہم سحری کیلئے بالائی اور پاؤروٹی ناشتہ دان میں دے دیا کریں گے۔اسے آپ لے جایا کریں میں نے کہا کہ کل بتاؤں گا۔میں نے مہتمم صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ان سے کہو کہ ان کا آدمی خود ندوہ تک پہونچا یا کرے تو ضرور اسے قبول کر لو ایسا انہوں نے عزت نفس کی خاطر کیا تھا۔

بھاگلپور کے ایک رئیس سید فخر عالم صاحب تھے ،جن کے صاحبزادے شرف عالم ندوہ میں طالب علم تھے۔اور اب وہ خود شیخ وقت ہو گئے ہیں اور ان کے دو بچے منظر عالم اور آفتاب عالم جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء کی گرمیوں کی چھٹی میں مہتمم صاحب کو لکھا کہ ایک اچھے طالب علم کو آپ بھیجدیں ۔جو اپنی چھٹی بھر یہاں رہیں اور بچوں کی نگرانی کرتے رہیں اور کچھ پڑھا دیا کریں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ،میں تیار ہوگیا ۔میں وہاں چھٹی بھر گھر کی طرح رہا۔ اور چھٹی ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے گھر چلا آیا اور پھر ندوہ آگیا ۔ بھاگلپور سے چلتے وقت فخر عالم صاحب مرحوم نے مجھے کرایہ کے علاوہ پچیس روپئے اور دینا چاہا۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور چلا آیا۔جب ندوہ آیا تو مہتمم صاحب نے پوچھا کہ کرایہ کے علاوہ کچھ اور رقم دیا؟ میں نے کہا کہ ہاں دے رہے تھے مگر میں نے نہیں لیا۔انہوں نے فوراً ان کو خط لکھا کہ یہ طالب علم بڑے شرمیلے تھے آپ نے ان کو جو چلتے وقت رقم دی تھی نہیں لی ۔آپ کو اصرار سے دینا چاہئے تھا ۔ آپ بھیج دیں میں ان کو دے دوں گا ۔چنانچہ وہ رقم آئی اور انہوں نے میرے حوالہ کی۔

غرض یہ کہ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو ان کی نرم خوئی اور اصول پرستی کے شاہد ہیں۔

عام طور پر طلبہ ان کی اصولی سختی کی وجہ سے ان سے نالاں رہتے تھے جن میں ہم لوگ بھی تھے مگر وہ سختی ضرور کرتے تھے مگر انتقام کا جذبہ ان میں بالکل نہیں تھا۔ ۱۹۴۳ء میں اسٹرائک کے بعد جب طلبہ کی تعداد کم رہ گئی تو کچھ بڑے طلبہ شبلی ہاسٹل سے دار العلوم کی عمارت میں بھیجدیئے گئے اور چھوٹے بچے شبلی ہاسٹل کے پوربی حصہ میں کر دیئے گئے۔ میرے ساتھیوں میں وحید الرحمن بھپرایونی بڑے پرمذاق تھے۔ وہ رات کو مہتمم صاحب کی بکری جو پرانے مطبخ میں بندھی رہتی تھی کبھی کبھی چائے کیلئے اس کا دودھ دوھ لیا کرتے تھے۔ جب دودھ کم ہو جاتا تو مہتمم صاحب نوکر کو ڈانتے، وہ جانتے ہوئے ڈانٹ سن لیتا۔ مگر ایک دن اس نے بتادیا، وحید الرحمن کے ایک ملاقاتی خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشیں خلیل میاں تھے۔ وہ جمعرات کو عموماً گوشت وغیرہ لے کر آجاتے اور وہ اور ہم سب لوگ مل کر پکاتے تھے اور پھر کھا پکا کر کچھ اشعار بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ اور عبداللہ عباس کی چپت بازی ہوتی تھی۔ مہتمم صاحب دار العلوم کی عمارت کے پوربی حصہ میں بال بچوں سمیت رہتے تھے۔ دو ایک جمعرات تو انہوں نے صبر سے کام لیا۔ پھر ایک جمعرات جب مجلس جمی تھی کمرہ میں آگئے۔ اب تو سب کے سب حواس باختہ ہو گئے۔ مگر انہوں نے بڑے سنجیدہ انداز میں فرمایا کہ آپ لوگوں کو بکری کے دودھ کی ضرورت ہو تو ہمارے گھر سے منگا لیجئے۔ تاکہ نوکر پر شبہ نہ ہو اور نہ وہ خود اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور آپ لوگ ذرا اپنی لے دھیمی رکھیئے۔ ایسا نہ معلوم ہو کہ یہ کوئی بازار ہے۔ ان کی اس حکیمانہ نصیحت کا ایسا اثر ہوا کہ یہ دونوں حرکتیں بند ہو گئیں۔

۱۹۴۲ء میں جب کوئٹ انڈیا کا ریزولیشن کانگریس نے پاس کیا تو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر اور پورے ملک کے قابل ذکر لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ دوسرے دن جب اخبارات کے ذریعہ ندوہ کے طلبہ کو اطلاع ملی (اس وقت ریڈیو کا رواج خال خال تھا) تو انہوں نے ندوہ میں چھٹی کرادی۔ مولانا عمران خانصاحب ریاست بھوپال کے ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے حامی تھے۔ مگر طلبہ کے جذبات کا لحاظ کر کے انہوں نے چھٹی دے دی۔ دن بھر طلبہ شور شرابا مچاتے اور نعرے لگاتے رہے، دو بجے دن کے وقت ندوہ میں یہ اطلاع پہونچی کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے لڑکے دوکانیں بند کرانے اور دوسرے انقلابی اقدامات کرنے کیلئے شہر جا رہے تھے کہ موتی محل کے پل پر پولیس نے روک لیا۔ اور لاٹھی چارج کیا۔ لڑکے نہیں مانے تو ان پر گولی چلادی اور کئی لڑکے زخمی ہو گئے ہیں اور کچھ مر گئے۔ یہ خبر سنتے ہی

ندوہ کے بڑے طلبہ کی ایک بڑی جماعت جمع ہو گئی اور یونیورسٹی کے طلبہ کی مدد کیلئے موتی محل پل کیطرف چلنے کا ارادہ کر لیا۔ اور تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ ترنگا لئے ہوئے روانہ ہو گیا جس کی قیادت نواب خاں اور اوناسرار صاحب کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں مہتمم صاحب کو اس ارادہ کی اطلاع ملی، وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ کرتا پائجامہ پہنے اور ترکی ٹوپی لگائے پھاٹک کی طرف بڑھے۔ ادھر طلبہ کا قافلہ بھی پوربی پھاٹک پر پہونچ چکا تھا۔ انہوں نے طلبہ سے کہا کہ آپ لوگ ندوہ کے احاطہ کے اندر جو چاہیں کریں مگر باہر نہ جائیں۔ مہتمم صاحب چونکہ مسلم لیگ کے حامی تھے اس لئے طلبہ مسلم لیگ اور ان کے خلاف بھی نعرہ لگاتے رہے۔ مثلاً مسلم لیگ مردہ باد، گورنمنٹ کے پٹھو مردہ باد وغیرہ، مگر انہوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اپنی ترکی ٹوپی کو زمین پر پھینکتے ہوئے کہا کہ اس ٹوپی کو روند ڈالو، مسل ڈالو اور میں لیٹ جاتا ہوں تم کو میرے اوپر سے گذرنا ہو تو گذر جاؤ۔ مگر میں تم لوگوں کو پھاٹک سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ ان کے اس خیر خواہانہ احتجاج نے بھڑکی ہوئی آگ پر پانی کا کام کیا۔ سارے طلبہ شرمندہ ہو گئے اور واپس چلے آئے۔

اسی دن ۱۲/ بجے رات میں، لڑکوں کی مسجد میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں راقم الحروف بھی تھا۔ سب نے طے کیا کہ ندوہ کے سامنے کا ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا جائے۔ اور سب نے قسم کھائی کہ اس راز کو وہ فاش نہ کریں گے۔ چنانچہ مسجد کی سیڑھی لی گئی اور دو لڑکے اوپر چڑھے اور دو سیڑھی پکڑے ہوئے تھے اور دو دو لڑکے سیٹی لئے ہوئے سڑک کے مغربی اور مشرقی حصہ میں فاصلہ سے کھڑے ہو گئے تاکہ اگر کوئی فوج یا پولیس کی گاڑی کی آواز آئے تو فوراً سیٹی بجا دی جائے اور سب لوگ اندر ہو جائیں چنانچہ آدھ گھنٹہ کے اندر تار کٹ گئے۔ تار ندوہ کے پھاٹک کے بجائے آرٹ اسکول کے پھاٹک کے سامنے کاٹے گئے تھے جو بیس پچیس گز کے فاصلہ پر تھا۔ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوئی اور ہم لوگ کمروں میں آکر سو گئے صبح ۷۔ ۸/ بجے درجہ کی گھنٹی لگ گئی تھی کہ دیکھا گیا کہ فوجی سپاہیوں کی گاڑی ندوہ کے پھاٹک پر رکی اور پھر وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ مہتمم صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے۔ دو آفیسر مہتمم صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے اور کہا کہ آپ کے لڑکوں نے رات میں ٹیلی فون کا تار کاٹا ہے۔ ہمیں انہیں گرفتار کرنا ہے۔ اتفاق کی بات کہ ان کے آنے سے پہلے رفیق رودولوی نے مہتمم صاحب کو اپنی خوشنودی میں اس کی اطلاع دے دی تھی۔ مہتمم صاحب حالات کی نزاکت سمجھ گئے اور افسروں سے کہا کہ میں

دومنٹ میں آتا ہوں ۔ اور مفتی سعید صاحب مرحوم سے کہا کہ ذرا کچھ دبلے پتلے اور مریل قسم کے ۲۰۔۲۰ طلبہ کو آپ دفتر کے سامنے والے برآمدہ میں بھیجدیں ۔ یہ کہکر مہتمم صاحب دفتر میں گئے ۔ اور ان سے بات کرتے رہے اور چائے وغیرہ پلائی ۔ اور فرمایا کہ ضرور پتہ لگایا جائے گا ۔ یہ کہہ کر ان کو ساتھ لے کر برآمدہ میں آئے اور ان لڑکوں کی طرف جو برآمدہ میں موجود تھے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان لڑکوں کو دیکھ رہے ہیں ۔ کیا اسی قسم کے مریل اور کمزور لڑکوں کا یہ کام ہو سکتا ہے ؟ یہ کام آرٹ اسکول یا یونیورسٹی کے لڑکے کر سکتے ہیں ۔ جو کل بھی ہنگامہ کر چکے ہیں ۔ مہتمم صاحب نے یہ بات ایسے پرزور انداز میں ان سے کہی کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ۔ اور وہ بغیر کسی مزید تحقیق کے واپس چلے گئے ۔

؎ رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت

مہتمم صاحب کے ان دونوں مثالی طرزِ عمل کی وجہ سے مخالف سے مخالف طالب علم بھی ان کا گرویدہ ہوگیا اس طرح کے بے شمار واقعات راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں پیش آئے ، جن سے ان کی ذمہ داری اور اصول پرستی ظاہر ہوتی تھی گو ہم کچے ذہن کے طلبہ ان کاموں کے باوجود ان کے خلاف وہاں جو فضا بعض اساتذہ اور کچھ سیاسی طلبہ نے بنائی تھی اسی سے متاثر رہتے تھے اور طلبہ کے سلسلہ میں ان کے ہر اقدام کو سخت گیری سمجھتے تھے ۔

مولانا محمد عمران خانصاحب جس وقت ۱۹۴۰ء میں مصر سے واپس ہوئے تو وہ کرتا پائجامہ اور شیروانی پہنتے تھے ، اور گورے چٹے اور کالی داڑھی کے ساتھ سر پر ترکی ٹوپی لگاتے ۔ جس وقت یہ لباس پہن کر وہ جمعہ کا خطبہ دیتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مصر کا کوئی پاشا خطبہ دے رہا ہے ۔

وہ جمعہ کی اور فجر کی نماز خود پڑھاتے اور فجر کی نماز میں وہ مسلسل سادہ انداز میں ایک ربع قرآن پاک پڑھتے تھے ۔ ان کے پیچھے فجر کی نماز پڑھنے میں بے حد لطف آتا تھا ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان کا یہ لباس بدل گیا اور پھر کرتا ، اونچا تنگ مہری کا پائجامہ اور دو پلی ٹوپی سر پر آگئی ۔ اور پھر آخر وقت تک اسی لباس میں بڑے بڑے جلسوں اور علمی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے ۔

وہ تقریر بہت کم کرتے تھے مگر جب کرتے تھے بہت دلچسپ انداز میں کرتے تھے ، عموماً بات کم کرتے تھے اور کرتے تھے تو ضرورت بھر کرتے تھے جس سے بسا اوقات ان کی کج خلقی کا احساس ہونے لگتا تھا ، البتہ وہ کسی ناگوار بات پر جب ڈانٹتے یا کسی کو کوئی بات سمجھاتے تو ان کی آواز

بہت تیز ہو جاتی تھی اور بات طویل بھی اور پھر ان کے ہاتھ پیر اور جسم کی حرکت دیکھ کر صحنا طلب لرزہ براندام ہو جاتا تھا اور جب دفتر میں کسی طالب علم کو طلب کیے ہوتے تو وہ تعمیل حکم بجا لانے ہی کیلئے کیوں نہ بلایا ہو مگر اسکی حالت نہ پوچھئے کیا ہوتی تھی۔

مہتمم صاحب کوئی پیشہ ور مقرر تو نہیں تھے مگر تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں ترغیبی تقریریں وہ بہت اچھے انداز میں کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی سیرت وغیرہ کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ عام جلسوں کا ماحول عموماً غیر ذمہ دارانہ ہوتا ہے جس پر وہ بڑے پر مذاق انداز میں تنقید کرتے تھے۔ ایک بار ایک سیرت کے جلسہ میں گئے، وہاں مردوں کے ساتھ کچھ عورتیں بے پردہ سامنے بیٹھی ہوئی تھیں، مہتمم صاحب نے ایک بار اِدھر اُدھر دیکھا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ اس سیرت کے جلسہ کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے گورنمنٹ آف انڈیا کوئی جلسہ کرے اور اس میں جھنڈا چین کا لگا دیا جائے، یہ سیرت کا جلسہ ہے اور ماحول غیروں کا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ ساری عورتوں نے اپنا اپنا دوپٹہ چہرے تک لٹکا لیا۔

ان کے خاندان میں عموماً تعلیم کا آغاز حفظ سے ہوتا ہے اور پھر شاید ان کے لڑکے اور بھائیوں بھتیجوں میں مشکل ہی ہے کوئی لڑکا ہوگا جس نے مکمل یا نامکمل عربی نہ پڑھی ہو اور جہاں تک مجھے علم ہے کہ انہوں نے پورے خاندان کی معاش و تعلیم کے سلسلہ میں اپنی بساط بھر حصہ لیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے بال بال مغفرت کرے۔ آمین۔

(بقیہ صفحہ ۲۴ کا)

اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (یعنی ان تمام کا وعدہ گاہ جہنم ہے) تو چلائے اور ہاتھ سر پر رکھ لیا اور تین دن تک حیران و سرگرداں رہے انہیں معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کہاں جاتے ہیں۔

اے دوست! علماء سلف کے حالات میں غور کر اور دیکھ کہ تجھے بھی قرآن مجید سننے سے کبھی حقیقی یا بطور پر غشی ہوئی ہے، یا تیری قساوت قلب کی وجہ سے بالکل نہیں ہوئی۔ سو تو اپنے بچاؤ کی فکر کر اور بھوکا رہنا لازم پکڑ کیونکہ اس سے دل نرم ہوتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین۔

شہر اعظم گڈھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارے کے شعبے | اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں۔

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ وقرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔

(۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت وجلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر واشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ۲/۲ درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ :۔ تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

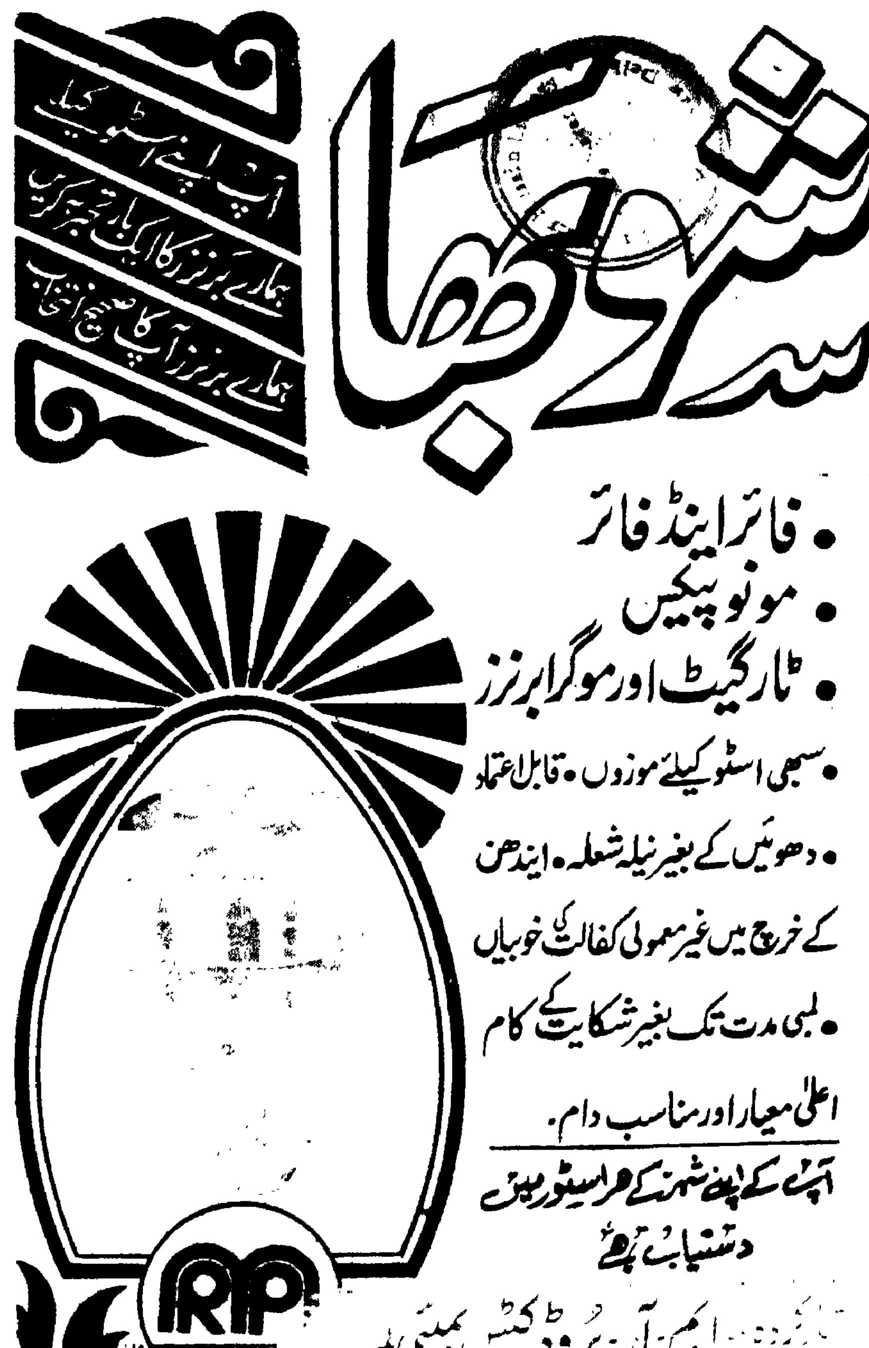
آئندہ کے منصوبے | ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درسگاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے۔ جس پر کم از کم ۵۰ لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت | (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنے کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی۔ اے میں اور فضیلت پاس کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں ایم۔ اے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں۔ (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

۲۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط وکتابت کرنا چاہئیے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۱۵ جون سے شروع ہو جاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ۱۰ رشوال سے داخلہ شروع ہو جاتا ہے اور ۲۰ رشوال تک ختم ہو جاتا ہے۔

افضل نیوز پریس سعید روڈ مئو

Regd. No Azm. / N.P. 42 / 84 Phone : 24[illegible]
Regd. No. R.N 38937 / 81 NOVEMBER 19[illegible]
MONTHLY JAMEATUR RASHAD
AZAMGARH (U.P.)



دسمبر
۱۹۸۶

ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

مرتبہ

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

دار التالیف والترجمہ کی چند تصنیفات

عبادت و خدمت | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر بھی اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادت پر ملتا ہے۔ (صفحات ۵۶، قیمت ۵۰؍)

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں | یہ مولانا محترم کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے، جو طلبہ، اساتذہ اور عربی مدرسوں کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں یہ تقریریں اور تحریریں دردو اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیے۔ قیمت ۵۰؍

اسلامی فقہ | از مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ: اردو زبان میں اسلامی مسائل پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر جتنی تحقیق اور تفصیل، خاص طور پر معاملات اور معاشرتی مسائل میں اس کتاب میں ملے گی، شاید وہ کسی دوسری کتاب میں نہ ملے، ہر مسئلہ کا اصل کتاب سے حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔

تبع تابعین (حصہ اول) | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے جو یہودی یا عیسائی تھے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ابتدا میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اس پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا دیباچہ بھی ہے، اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

اہل دل کی باتیں | مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پُراثر اور پُرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ قیمت ۱۵؍

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل | یہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو "معارف" اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے ہیں، ان میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

مسئلہ کفائت | شادی بیاہ میں کن چیزوں کی برابری ہونی چاہئے اور مسلمانوں میں برادریوں کی مصنوعی تقسیم، ان دونوں مسائل پر شرعی حیثیت سے مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی) قیمت ۱۵؍

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڈھ۔ (یوپی)

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان	سالانہ چندہ
ہندوستان سے 25/=	ماہنامہ	غیر ممالک سے
خصوصی معاون 100/=	**جامعۃ الرشاد**	بارہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ 2/50		12/= $

جلد ۱۳ | دسمبر ۱۹۸۶ء مطابق ربیع الآخر ۱۴۰۷ھ | شمارہ ۶۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت	کتابت
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی	شوکت علی دھوبیا املی روڈ مئو

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل نعیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رشحات

ہماری پوری اسلامی تاریخ جدوجہد اور ایثار و قربانی سے بھری ہوئی ہے۔ میدانِ جہاد کی تگ و تاز ہو یا علم و فن کے بحر بیکراں کی غواصی ہو۔ اپنوں کے اصلاح کا کام ہو یا غیروں میں دعوت و تبلیغ اور بے لوث خدمت کا کام ہو۔ غرض یہ کہ زندگی کے جتنے گوشے تھے سب کو ہمارے بزرگوں نے دین کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی۔ اور مادیت سے بھری ہوئی اس دنیا کو انہوں نے ایمان و یقین، اخلاق و کردار اور دیانت و امانت سے محروم نہ ہونے دیا۔ دنیا کی تاریخ کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو علم و فن اور اخلاق و کردار کی جتنی خوبیاں اس وقت دنیا میں نظر آتی ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا۔ ع

یہ سب پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے

خود ہمارے ملک ہندوستان کے چپہ چپہ پر علماء و صلحاء کے علم و عمل اور مجاہدین اور غازیوں کے کارناموں کے نقوش ثبت ہیں جن علماء و صلحاء اور مجاہدین کے کارناموں کا ذکر جمیل ہماری تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ خدا کے ان برگزیدہ بزرگوں کے کارنامے ہیں جو اپنا نام و نشان مٹا کر ہمیں ایمان و یقین، اخلاق و کردار اور علم و فن ہی سے نہیں بلکہ دنیا کی دولت و حشمت سے بھی مالا مال کر گئے، آپ ہندوستان کی کسی مسلمان بستی میں چلے جائیں وہاں آپ کو کسی نہ کسی شہید یا غازی یا بزرگ کا مزار ضرور ملے گا۔ مگر ان میں مشکل سے پانچ فیصد ایسے حضرات ملیں گے جن کے نام و نشان اور کارناموں کی پوری تاریخ سے ہم واقف ہوں گے یا تاریخ کے صفحات میں

انہیں محفوظ کیا گیا ہوگا، بقیہ حضرات کے حالات پردۂ خفا میں ہوں گے مگر مسلمان بستیوں کے ذرے ذرے ان کے کارناموں کے شاہد عادل ہوں گے۔ یہ انہی کا فیض ہے کہ ہندوستان میں اسلامی زندگی کے آثار ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، اور اس ملک میں خود مسلمانوں کا وجود اس کا زندہ ثبوت ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت جن روح فرسا حالات سے گذر رہے ہیں ہمارے بزرگوں کو ان سے زیادہ سخت حالات سے گزرنا پڑا تھا۔ ہم آج جس تنگ نظری، تعصب اور تشدد کے شکار ہیں ان کے زمانہ میں یہ تنگ نظری، تعصب اور تشدد اس سے زیادہ بدترین صورت میں موجود تھا، مگر ان کا ایمان ویقین ہم سے بڑھا ہوا تھا، اس لئے ان کے آگے دین کے راستہ کی ہر مصیبت ہیچ نظر آتی تھی۔ ان کے اخلاق وکردار میں اتنی بلندی تھی کہ اس کی عظمت ورفعت کے آگے بڑا سے بڑا عدو سرد شمن بھی سرنگوں ہو جاتا تھا۔ ان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی ایسی محبت اور دین کی ایسی عظمت تھی کہ دنیا کی ساری محبتیں اور عظمتیں اس کے آگے ماند پڑ گئی تھیں۔ ان کے دل میں خدا کا خوف ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑے جابروں، ظالموں اور بڑی سے بڑی حکومتوں سے ٹکرا جانے میں بھی انہیں ایک لمحہ کیلئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ خدا کی عبادت ان کی زندگی کی سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ چیز تھی۔ بندگانِ خدا کی خدمت کر کے ان کو ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے ان کو کوئی بڑی دولت مل گئی ہو۔ گویا وہ زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے تھے ؎

حاصل عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

مگر ہمارا ایمان ویقین اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ایک ہلکی سی رکاوٹ بھی ہم کو پہاڑ نظر آتی ہے۔ ہم اپنے اخلاق وکردار کے لحاظ سے اتنے کمزور ہیں کہ ہماری آنکھیں دوسرو کے سامنے جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں دنیا کی محبت نے اتنا گھر کر لیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کیلئے اس میں بہت کم جگہ باقی رہ گئی ہے۔ ہمارے دلوں سے

خدا کا خوف نکل گیا ہے اس لئے ہم اپنے سایہ سے بھی ڈرنے لگے ہیں، خدا کی عبادت میں چند منٹ صرف کرنا ہم کو بوجھ معلوم ہوتا ہے اور رات کی رات ہوٹلوں اور بازاروں میں گزار دیتے ہیں۔ بندگان خدا کی خدمت اور رفاہِ عام کے کاموں کو ہم نے دینا کا کام سمجھ لیا ہے۔ ہمارے اسلاف سراپا ایثار تھے اور ہم سراپا خود غرض بن گئے ہیں۔ وہ فکر و عمل کے لحاظ سے آپس میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے اور ہم اختلاف و انتشارِ فکر و عمل کے شکار ہیں۔

اگر ہم کو ایک معزز قوم کی طرح زندہ رہنا ہے تو پھر ہم کو پر کشش مگر پر فریب مغربی تہذیب و ثقافت ہو یا مشرکانہ، مشرقی تہذیب و ثقافت سب کی تقلید ترک کرنا اور اسلاف کی سادہ اسلامی تہذیب و ثقافت اختیار کرنا ہوگی۔ اپنے ایمان و یقین کو درست اور مضبوط کرنا ہوگا۔ دنیا کی محبت کو دل سے نکالنا اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی محبت دل میں بٹھانا ہوگا۔ آپسی اختلاف و انتشار کو دور کرنے کیلئے اپنے جذبات و احساسات کی قربانی دینی ہوگی۔ ہمارے اور اسلاف کے طرزِ عمل میں جو فرق ہو گیا ہے اسے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے حکیمانہ اور شاعرانہ اندازِ بیان میں جوابِ شکوہ میں لکھا ہے اسے سنئے اور پھر اپنے طرزِ عمل پر غور کیجئے ؎

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے ۔۔۔ نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے ۔۔۔ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!
کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟ ۔۔۔ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟ ۔۔۔ ہو گئی کس کی نظر طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو!
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟
ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوتِ بازو پر تھا ہے تمہیں موت کا ڈر اسکو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو؟
ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم تم خطاکار و خطابیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم!
تختِ فغفور[1] بھی ان کا تھا، سریر کے[2] بھی
یونہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

الرشاد جون ۱۹۸۶ء کے رشحات میں راقم الحروف نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ملی اتحاد و اتفاق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مسلمانوں کی ایک سال کی موجودہ بیداری سے فائدہ اٹھا کر اپنی وحدت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ وحدت سیاسی اغراض کے لئے نہیں بلکہ ملی مفاد

---

[1] شاہ چین کا لقب تھا۔ [2] سریر کے ایران کے تخت شاہی کی طرف اشارہ ہے۔

کے تحت قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کیلئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ "مسلم مجلس مشاورت" جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مشترکہ ادارہ ہے اور جس کو ۹۵ فیصدی مسلمانوں کی حمایت حاصل رہ چکی ہے اگر ہم کوشش کریں تو آج بھی اسے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہمارے رہنما اس کی اہمیت کو محسوس کریں، خاص طور پر ہمارے محترم مولانا اسعد صاحب مدنی اپنے جماعتی تشخص کے ساتھ اسکی اہمیت کو محسوس کرلیں تو شاید یہ کام آسانی سے ہو جائے، ہم ۴۷ برس سے دوسروں کے سہارے اپنے مسائل کے حل کا تجربہ کرتے رہے ہیں اور اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، ایک بار ہم یہ تجربہ بھی کرکے دیکھیں، اس تجربہ کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ہمارے ممبروں کا تناسب گھٹ جائے مگر انشاءاللہ ہمارا اصلی وزن اس سے بڑھ جائے گا۔ ؎

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

اس تجربہ کے سلسلہ میں فرقہ واریت کے بڑھنے کا ہوا کھڑا کیا جائے گا ہندوستان کی دوسری تقسیم کا الزام مسلمانوں پر لگایا جائے گا مگر ہم تو یہی کہیں گے ؎

ارے سود و زیاں دیکھا نہیں جاتا محبت میں
یہ سودا اور سودا ہے یہ دنیا اور دنیا ہے

اس کے بعد اگست ہی میں راقم الحروف نے دلی میں مولانا اسعد مدنی صاحب سے ملنے کی کوشش کی مگر ملاقات نہ ہو سکی تو جمیعۃ العلماء کے جنرل سکریٹری مولانا اسرار الحق صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو کی، انہوں نے بھی میری باتوں سے بڑی حد تک اتفاق کیا، خواہش ہے کہ اس بات کو اور آگے بڑھایا جائے۔ مولانا اسرار الحق صاحب نے کہا تھا کہ

مسلم مجلس مشاورت کو ضرور زندہ کیا جائے مگر وہ تنظیم نہ رہے بلکہ بورڈ کی حیثیت سے رہے۔ ان کے بعد سید شہاب الدین صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی اس سے متفق تھے صرف اتنی ترمیم کے ساتھ کہ ہر صوبہ میں بھی اس کا ایک مرکز رہے۔

لیکن کیا کہا جائے کہ مولانا اسعد صاحب کو ملی اتحاد سے زیادہ عزیز اپنا ذاتی اور جماعتی تشخص ہے۔ اس کیلئے ملت چاہے پارہ پارہ ہوجائے۔ بڑی سے بڑی شخصیت کا خون ہوجائے مگر ان کی انا کو تسکین ہوتی رہے۔ جمیعۃ العلماء کی سکریٹری شپ، پھر اس کی صدارت کیلئے مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم اور دوسرے اکابر کی جس طرح تذلیل کرنے کی کوشش کی گئی اس کو لوگ بھولے نہیں ہیں۔" مسلم مجلس مشاورت" کی متحدہ طاقت کو جس طرح کمزور کیا گیا وہ لوگوں کے حافظہ میں اب تک موجود ہے دیوبند میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا اس کی غمناک داستان دینی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہوچکی ہے۔" ملک وملت بچاؤ" تحریک چلا کر اور سیاسی داؤ پیچ دکھا کر اندرا گاندھی کو برسر اقتدار لانے کیلئے ملت کو جس طرح ذلیل کیا اس کا چرچا اب بھی لوگوں میں جاری ہے، انگریزی اخبار کی اسکیم کا غلغلہ کچھ دن بہت سنائی دیا مگر اس پر بھی ہمیشہ کیلئے موت کا سناٹا چھا گیا۔ بابری مسجد اور مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر انہوں نے جس طرح چشم پوشی سے کام لیا وہ آج کل کی بات ہے، یہ سب باتیں ان کی انانیت اور اپنے تشخص کے لئے ملت کے بڑے سے بڑے مفاد کو نقصان پہنچانے کا ثبوت تھیں کہ اب انہوں نے ایک نیا فتنہ امیر الہند کے انتخاب کا اختیار کیا۔ بنتا تو انہیں تھا مگر اس کے لئے رکھ کر انتہائی عجلت سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو آلۂ کار بنا لیا۔ سننے میں آیا ہے دار القضاء وغیرہ کے قیام کی گونج سے ان کو خطرہ پیدا ہوا کہ یہ سہرا کسی اور کے سر نہ بندھ جائے۔

اس وقت ملک میں مختلف دینی جماعتیں کام کر رہی ہیں اور سب نے اپنا ایک امیر اور صدر یا سربراہ مقرر کر رکھا ہے اور ان کو اس کا پورا حق ہے جمیعۃ العلماء کے صدر خود مولانا مدنی محترم ہیں مگر جب پوری ملت کا سربراہ بنانے کی بات آئے گی تو ضروری ہے کہ تمام دینی جماعتوں سے اور ملک کی اہم شخصیتوں سے مشورہ کیا جائے

خاص طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں سے جس کے ایک ممبر وہ خود بھی ہیں، اگر ایسا ہوا تو اس کی حیثیت ایک خود ساختہ امیر الہند کی ہو گی۔ جیسا کہ اس انتخاب کی حیثیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود جمیعۃ العلماء کے بہت سے انصاف پسند لوگوں نے بھی اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اور کر رہے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی علمی عظمت اپنی جگہ پر مسلم ہے مگر اپنی پیرانہ سالی کے علاوہ وہ کبھی ملی کاموں میں کوئی سربراہی نہیں کر سکے ہیں۔ اس لئے ان کا انتخاب کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کاش مولانا اسعد صاحب کبھی تنہائی میں یہ بات سوچنے کی تکلیف گوارا کرتے کہ وہ اس طرح کے تماشوں سے دین وملت کی کونی خدمت انجام دے رہے ہیں یا جو کچھ رہی سہی ان کی اور ملت کی عزت دوسروں کی نگاہوں میں باقی ہے اسے بھی خاک میں ملا رہے ہیں۔ ان کے وہائٹ پیپر پر جو لوگ بے سوچے سمجھے دستخط بناتے رہتے ہیں ان سے میری گزارش ہے کہ آپ لوگ ذرا ملت کے وسیع مفاد اور اس کی عزت ووقار کے پیشِ نظر مولانا کے پندرہ بیس سالہ طرزِ عمل پر غور کریں کہ اس سے ملت نے کیا پایا ہے اور کیا کھویا ہے؟ آپ اگر اس پہلو سے غور کریں گے تو ہمیں امید ہے کہ آئندہ مولانا کو ملت کے مفاد کی خاطر دوسروں سے جڑ کر کام کرنے پر ضرور آمادہ کر سکیں گے۔ اس سے ان کا اور آپ کا وقار گھٹے گا نہیں بلکہ بڑھے گا۔

راقم الحروف ۷، ۸ مہینے سے مسلسل دفعہ ۴۴ کے نفاذ کی طرف ملت کے اہل فکر اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو متوجہ کرتا رہا ہے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ میری آواز سنی گئی اور اسی کے اثر سے اب تمام لوگوں کو ہوش آیا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جب اس کی گونج پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر خاص طور پر بار کونسل کے چیرمین شرما کی تقریر کے بعد سنائی دینے لگی تو مسلم پرسنل لا بورڈ اور جماعت اسلامی وغیرہ سب نے اس کو اہمیت دی۔ ورنہ ۲ مہینے سے پہلے ہر طرف سناٹا دکھائی دے رہا تھا، بلکہ بعض ذمہ دار تو یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ اختیاری سول کوڈ نافذ ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔؟

مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ۷ر دسمبر سے ۱۴ر دسمبر تک شریعت ہفتہ منانے کا جو پروگرام دیا ہے اس کو ہمیں پوری کوشش سے کامیاب بنانا چاہیئے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ صرف ہفتہ منانے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ اس کیلئے مزید عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ جب اس مسئلہ پر کچھ ذمہ دار قانون داں قسم کے لوگ خانہ جنگی کی دھمکی دے رہے ہیں تو اسی سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتنی افسوسناک اور فکرمندی کی بات ہے کہ ملک کے قانون دانوں کا سب سے بڑا ادارہ بار کونسل گویا ہندو احیاء پرستی کا ریزولیشن پاس کردیتا ہے اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ یکساں سول کوڈ کے پیچھے کونسی ذہنیت کام کررہی ہے۔

۲۱ر نومبر ۱۹۸۶ء کو دینی تعلیمی کونسل کی چھٹی صوبائی کانفرنس بنارس میں ہوئی جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی سعادت حاصل کی۔ اس کانفرنس میں سید حامد صاحب کی تقریر اور خطبۂ افتتاحیہ دینی تعلیمی کونسل کی کانفرنس کی جان   بلکہ اس کیلئے وہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل کی تحریک کا بنیادی مقصد ہندوستان میں ابتدائی دینی تعلیم کے نظام کا اجراء ہے، یہ ایک ایسی تعمیری اور بنیادی تحریک ہے جس پر ہماری آئندہ نسل کے دین وایمان کے تحفظ کا مدار ہے۔ اس کے ساتھ اس کے ذمہ داروں کو یوپی گورنمنٹ سے خاص طور پر اس کے محکمۂ تعلیم سے بھی مسلسل لڑائی کرنی پڑی ہے۔ تب جاکر ایجوکیشن کوڈ میں ترمیم ہوئی۔ اور کوٹھاری کمیشن رپورٹ سردخانہ میں پڑگئی۔ گو ملت کے اہل ثروت اور پڑھے لکھے لوگوں نے اس اہم تحریک کے سلسلہ میں بہت زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ ہیں کیا۔ بلکہ قدرے سردمہری سے کام لیا۔ مگر پھر بھی اس تحریک کی کوششیں اس شعر مصداق ضرور ہیں ؎

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

اس کانفرنس کا انتظام بنارس کے لوگوں نے کیا تھا، جن میں ڈاکٹر خلیل اللہ قریشی حب، مولوی ابو نصر صاحب اور حاجی منظور احمد صاحب وغیرہ پیش پیش تھے۔ مگر اس نفرنس کے سلسلہ میں دو تین باتیں ذہن کو ذرا کھٹکیں، ایک تو یہ کہ اس میں شہر کے

مشہور مدرسہ مظہر العلوم کی نمائندگی نظر نہیں آئی جبکہ اس کے بیشتر اساتذہ اور کارکنوں کو اس تحریک سے دلچسپی ہے۔ اور انہوں نے اس کیلئے مدرسہ میں چھٹی بھی کر دی تھی۔

دوسری بات سپاسنامہ وغیرہ کا پیش کیا جانا اچھا نہیں لگا، تحریک کے کاموں میں ان چیزوں کو فروغ دینا اصل کام کو نقصان پہونچانے کے مرادف ہے۔ اس لئے کہ اس سے چھوٹے کارکنوں کا مزاج بھی یہی بنے گا کہ جب تک اعزاز و اکرام اور داد و تحسین کا مظاہرہ نہ ہو ان کا دل کام میں نہیں لگے گا۔ حالانکہ اس کام کے لئے مزاج ایسا بنانا ہے کہ وہ داد و تحسین اور صلہ کی پروا کئے بغیر کام کریں۔ ذمہ داروں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹے کارکنوں کی صف میں آکر ان کی ڈھارس بندھائیں اور ان کی ہمت افزائی کریں۔ بلکہ وہ اپنی طرف سے مبارکباد دیں۔ کارکنوں کی طرف سے قصیدے، سپاسنامے عہد ملوکیت کی یادگار ہیں اسے یکسر ختم ہو جانا چاہیئے۔ کوئی عام جلسہ ہو جس میں مہمان کی حیثیت سے بلایا جائے تو اسے کسی طرح گوارا کیا جا سکتا ہے مگر یہاں تو ذمہ داروں کی حیثیت مہمان کی نہیں بلکہ سب کی حیثیت میزبان کی تھی۔

تیسری بات اس کانفرنس کے ساتھ پیام انسانیت کے کام کو اس سے جوڑنا دو وجہ سے بالکل مناسب نہیں تھا۔ ایک تو اس لئے کہ دینی تعلیمی کونسل کے بہت سے ارکان اور اس کے کارکن اس کام سے اسلئے دلچسپی نہیں رکھتے کہ اقلیت کی طرف سے یہ آواز خوشامد کے علاوہ کچھ نہیں سمجھی جائے گی۔ اور اکثریت کا ایک بھی فرد حتیٰ کہ ونوبا بھادے جیسا آدمی بھی اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس وقت اخلاقی باتوں کا سننا اور کرنا ایک سیاسی حربہ بن گیا ہے اس لئے ایک آدمی بھی اس سے واقعی متاثر نہیں ہوگا جیسا کہ اب تک کا تجربہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم دینی تعلیم کے نظام کو پھیلانے کی بات کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں حکومت فرقہ پرست عناصر اور ہندو میتھالوجی کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں، پھر اسی کے ساتھ مشترکہ قدروں کی بات کرنا اور اسلام کی صرف ان تعلیمات کو پیش کرنا جن میں اخلاقی پہلو زیادہ ہو اور کشمکش کا کوئی پہلو نہ ہو اس سے مسلمانوں کے اندر ایک مرعوبانہ ذہن اور اپنے مسائل کو قوت سے نہ پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوگا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا۔

الحَجَرُ

(۲)

مولانا سعید الرحمٰن علوی۔ پاکستان

حجر اور کورٹ آف وارڈ کی بنیاد[1]

حضرات فقہاء کرام نے حجر جس کو مروجہ اصطلاح میں کورٹ آف وارڈ کہتے ہیں کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہی رکھی ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے:

"ولا تؤتوا السفهاء اموالكم التى جعل الله لكم قيما وارزقوهم فيها واكسوهم وقولوا لهم قولا معروفا" [۲۴]

اور دیکھو! مال و متاع کو اللہ نے تمہارے لئے قیام (معیشت) کا ذریعہ بنایا ہے۔ پس ایسا نہ کرو کہ کم عقل آدمیوں کے حوالے کردو (یعنی کم عمر اور نادان لڑکوں کے حوالے کردو اگر وہ کم سن ہیں تو) ایسا کرنا چاہیئے کہ ان مال میں سے ان کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کر دیا جائے اور نیکی اور بھلائی کی بات انہیں سمجھا دی جائے [۲۵]

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

مال قیام زندگی کا ذریعہ ہے پس جب تک یتیم بچے عاقل و بالغ نہ ہو جائیں اور اپنے مفاد کی حفاظت نہ کر سکیں مال و متاع ان کے قبضے میں نہ دے دو [۲۶]

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

یعنی بے سمجھ لڑکوں کے ہاتھ میں ان کا وہ مال مت دے دو کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے آدمیوں

---

[1] تسلسل کے لئے اگست دستمبر کا شمارہ دیکھئے۔

کے لئے سامان معیشت بنایا ہے بلکہ اس کی پوری حفاظت رکھو اور اسے ہلاکت سے بچاؤ، اور جب تک ان کو سامان کا ہوش نہ آئے اس وقت تک ان کو اس میں سے کھلاؤ پہناؤ، اور تسلی کرتے رہو کہ یہ سب مال تمہارا ہی ہے، ہم تو تمہاری خیر خواہی کرتے ہیں جب سمجھ دار ہو جاؤ گے تم کو ہی دے دیں گے[۳]

قرطبی فرماتے ہیں:

بیّن ان السفیہ وغیر البالغ لایجوز دفع مالہ الیہ[۵]

واضح ہوگیا کہ سفیہ اور نابالغ کو اس کا مال دینا اور سپرد کرنا درست نہیں۔

"السفیہ" کون ہے؟

زجاج کہتے ہیں کہ سفیہ "سفہ" سے ہے جس کا معنی "جہل" ہے ای جھل امر نفسہ فلم یفکر فیھا کسائی، اخفش سے بھی یہی نقل کرتے ہیں، یعنی "جھل فی نفسہ"۔

ابن جحر کہتے ہیں:

"معناہ جھل نفسہ وما فیھا من الدلالات والآیات الدالۃ علی ان لھا صانعا لیس کمثلہ شئ فعلم بہ توحید اللہ وقدرتہ"[۲۹]

سالم سعید بن جبیر سے نقل کرتے ہیں کہ سفہا یتامی ہیں۔ اسماعیل بن خالد ابو مالک سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد اولاد صغار ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں:

"من لم یتفقہ فلا یتجر فی سوقنا فذالک قولہ تعالی ولا تؤتوا السفہاء اموالکم"

یعنی الجھال باحکام۔ سمجھ بوجھ سے عاری۔ احکام سے ناآشنا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں:

السفہاء ھنا کل من یستحق الحجر۔

کہ سفہاء سے مراد یہاں ہر وہ شخص ہے جو حجر کا مستحق ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ تعریف

بالکل جامع ہے۔

سفیہ کے کئی روپ ہیں، صغرسنی اور کم سنی بھی سفاہت کی ایک قسم ہے۔ جنون وغیرہ کے سبب عقل کا فقدان بھی اس میں شامل ہے۔ ایسی حالت کہ آدمی اپنے مال کے معاملہ میں بری سوچ اور نظر کا شکار ہو کر اڑاتا رہے۔

آگے لکھتے ہیں:

واما الجاهل بالاحکام .... فلا یدفع الیه المال لجهله بمفاسد البیاعات وصحیحها وما یحل وما یحرم منها[۳۰]

جو شخص احکامات دینیہ سے جاہل ہے اس کا مال اس کے سپرد نہیں کیا جائے گا کہ اسے معلوم نہیں کہ صحیح تجارت و بیع کون سی ہے حلال کیا ہے اور حرام کیا۔

امام مالک اور جمہور فقہاء اسی بحث میں سفیہ اور کبر السن (بوڑھا) کو حجر کا مستحق گردانتے ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ اس شکل میں اس پر حجر کی پابندی لازم قرار دیتے ہیں جب وہ اپنے مال کو ضائع کرنے والا ہو۔

الا ان یکون مفسد المالہ فاذا کان کذالک منع من تسلیم المال الیه[۳۱]

الجصاص الحنفی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

یقتضی خطاب کل واحد منهم بالنهی عن دفع ماله الی السفهاء لما فی ذالک من تضییعه لعجز هولاء عن القیام بحفظه وتثمیره[۳۲]

یعنی سفہاء کے سپرد مال نہ کیا جائے کہ وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتے اور اس کو ثمر آور نہیں کر سکتے (بلکہ برباد کر دیں گے)

آگے فرماتے ہیں:

وفیه الدلالة علی النهی عن تضییع المال ووجوب حفظه وتدبیره والقیام به ———

یعنی اس حکم میں اس بات کی دلالت ہے کہ مال کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور

اس کی حفاظت لازم ہے۔

پھر شیخ الجصاص الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تائید میں اور بہت سی آیات نقل کرتے ہیں۔ جن میں ایک وہ آیت ہے جو سورۃ بنی اسرائیل میں ہے، جس میں تبذیر سے روکا گیا ہے اور تبذیر کا ارتکاب کرنے والوں کو شیطان کے بھائی بتلایا گیا، اسی آیت سے فقہاء نے ایک سبب حجر نکالا، یعنی التبذیر[۱۳] (جس پر آئندہ گفتگو ہوگی)

دکتور محمد محمود حجازی کہتے ہیں:

السفهاء جمع سفيه، والسفه الاضطراب فى العقل والفكر والخلق والمراد به هنا من لا يحسن التصرف فى المال[۳۴]

یعنی سفہ عقل، فکر اور اخلاق میں اضطراب کا نام ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ جو شخص تصرف مالی میں احسن طریق اختیار نہ کرے۔

حافظ ابن کثیر دمشقی فرماتے ہیں:

وهم (اى السفهاء) اقسام فتارة يكون الحجر للصغير فان مسلوب العبارة وتارة يكون الحجر للجنون وتارة لسوء التصرف لنقص العقل او الدين الخ[۳۵]

گویا عقل یا دین کے نقص کے سبب سوء تصرف کا اس پر اطلاق کیا گیا ہے، کشاف میں ہے:

السفهاء المبذرون اموالهم الذين ينفقونها فيما لا ينبغي الخ[۳۶]

یعنی سفہا وہ فضول خرچ افراد ہیں جو اپنا مال نامناسب طریق سے خرچ کرتے ہیں۔ السید محمد رشید رضا مصری فرماتے ہیں:

ان السفه هو الاضطراب فى الرأى والفكر او الاخلاق..... واستعمل فى خفة النفس لنقصان العقل وفى الامور الدنيوية والاخروية ثم جعل السفه فى الامور الدنيوية.... فالسفهاء هنا المبذرون اموالهم ينفقونها فيما لا ينبغي ويسيئون التصرف بانمائها

وتشیرھا.... قال الاستاذ لا یحسن التصرف فی مالہ الخ[۱]

یہ عبارت بھی اپنے مفہوم میں بڑی واضح ہے کہ جو شخص رائے، فکر اور اخلاق میں اضطراب کا شکار ہے، جس کی عقل ناقص ہے دینی اور اخروی امور میں جو غیر محتاط ہے مبذر ہے۔ نامناسب جگہ مال خرچ کرتا ہے اور حسن تصرف کا اہتمام نہیں کرتا وہ سفیہ ہے۔

دوسری آیت:

سورۃ نساء کی آیت ۶ کو بھی بعض حضرات نے اس سلسلہ میں دلیل کے طور پر پیش کیا[۲]۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اور یتیموں کی حالت پر نظر رکھ کر انہیں آزماتے رہو کہ ان کی سمجھ بوجھ کا کیا حال ہے، یہانتک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہونچ جائیں پھر اگر ان میں صلاحیت پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو[۳]

مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا کہ جب ان میں (یتیموں میں) نفع و نقصان کی سمجھ آجائے، اور وہ حفاظت اور انتظام مال کے سلیقہ سے آشنا ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو (اس سے قبل نہیں)[۴]

ابن کثیر میں حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالے کے حوالہ سے ہے:

صلاحًا فی دینھم وحفظا لاموالھم وکذا روی عن عباس والحسن البصری وغیرو احد من الائمۃ وھکذا قال الفقھاء الخ[۵]

گویا اس میں دینی طور پر صلاحیت پیدا ہو جائے اور مال کی حفاظت کا اس میں شعور پیدا ہو جائے تو حجر کا قصہ ختم۔ اب مال اس کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ خواجہ حسن بصری وغیرہ ائمہ اور فقہاء کا یہی قول ہے۔

حجازی کہتے ہیں:

حتی تبینوا رشدھم وکمال تصریفھم[۶] ——————

ان کا رشد (دینی صلاحیت، عقلی کمال) اور خرچ کا کمال واضح ہو جائے۔

الصابونی فرماتے ہیں:

لے ان ابصرتم منہم صلاحا فی دینہم ومالہم فادفعوا الیہم اموالہم بدون تاخیر[۲۲]

یعنی جب تم ان میں دینی اور مالی اصلاح دیکھ لو تو بغیر تاخیر ان کا مال ان کے سپرد کردو۔

قرطبی نے "رشد" جس کے مشاہدہ کے بعد مال اس کے سپرد کر دیا جائے گا، اس کی تفسیر میں لکھا کہ:

حسن و قتادہ کہتے ہیں:

"صلاحا فی العقل والدین"

ابن عباس سدی اور ثوری کہتے ہیں:

"صلاحا فی العقل وحفظ المال"[۲۳]

سنن الکبریٰ بیہقی میں ہے:

"الرشد ھو اصلاح فی الدین والمال"

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے نقل کیا:

"الرشد ھو الدین"[۲۵]

جس کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اصل بات دینداری ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ ایک شخص خرچ اخراجات اور دوسرے معاملات میں کس حد تک احکامات ربانی کی اتباع کا خیال کرتا ہے اگر ایسا ہے تو بہت اچھا ورنہ اس پر حجر لگایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں اس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ایک صحابی اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا عزم رکھتا ہے اس کا وہ حضور اقدس علیہ السلام سے ذکر کرتا ہے لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ اس شخص کا مقصد بہت اچھا ہے، پھر بھی ایک ثلث سے زائد کی اجازت نہیں دیتے تو جو شخص اپنا مال للّے تللوں میں خرچ کرتا ہے اور بے جا اڑاتا ہے، مکانات پر مکانات بناتا چلا جا رہا ہے، گاڑی پر گاڑی خریدتا چلا جاتا ہے، کراکری، ملبوسات اور ایسی چیزوں سے گھر بھر رکھا ہے اور ایسے ہی انداز میں مال صرف کرتا ہے جبکہ معاشرہ میں غربت و افلاس ننگا ناچ رہی ہے، لوگوں کا ایمان معرض خطر میں

ہے، معاشی فساد برپا ہے تو ایسے شخص پر جبر کی پابندی کیوں نہ لگائی جائے گی۔

ایک مزید آیت:

السید سابق نے "فقہ السنۃ" میں سورۃ الاعراف کی آیت ۳۲ کو اس ضمن میں بطور دلیل پیش کیا ہے اور بڑے نفیس طریق سے استدلال کیا ہے۔ پہلے اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمالیں:

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہو، اللہ تعالیٰ کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کیں ہیں؟ تم کہو "یہ (نعمتیں) تو اسی لئے ہیں کہ ایمان والوں کے کام آئیں، دنیا کی زندگی میں (زندگی کی مکروہات کے ساتھ اور) قیامت کے دن (ہر طرح کی مکروہات سے) خالص" دیکھو اس طرح ہم ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں جو جانتے ہیں[۶۲]

یہ آیت سورۃ الاعراف کے چوتھے رکوع کی پہلی آیت ہے، اس سے پہلے اس سورۃ کے پہلے رکوع میں تو انسانیت کو برے انجام سے ڈرایا، دوسرے رکوع میں سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش۔ شیطان کا مقابلہ آدم علیہ السلام پر عتاب، ان کی توبہ کی قبولیت اور پھر زمین پر بسانے کا ذکر ہے، تیسرے رکوع میں دنیا کی ضرورت کے پیش نظر "لباس مہیا کرنے" کا ذکر ہے اور "لباس تقویٰ" کو سب سے بہتر لباس قرار دیا گیا، پھر تنبیہہ کی گئی کہ اے اولاد آدم ذرا ہوشیار ہو کر رہنا۔ کہیں تم بھی اسی طرح شیطان کے بہکاوے کا شکار ہو جاؤ جس طرح تمہارے بڑے کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ جب تک جنت میں شیطان کے پھسلانے کا قصہ پیش نہ آیا سیدنا آدم، اور ان کی اہلیہ کے ستر کا معاملہ درست تھا، جونہی یہ حادثہ پیش آیا ستر کھل گیا، اور ستر پوشی کے لئے لباس کی ضرورت محسوس ہوئی، اب کارگاہ حیات میں شیطانی راستوں پر چلنے کا انجام شرم وحیاء کی بربادی کی شکل میں سامنے آئے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جب کوئی انسان حماقت اور برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا الزام بڑوں کو دیتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا؟ اصل میں تو اتباع حکم الٰہی کی چاہیئے نہ کہ آباؤ اجداد کے راستہ کی۔ اس لئے افراط وتفریط سے بچ کر استدلال کی راہ اپناؤ، اپنی عبادات میں اللہ تعالیٰ کی طرف

دھیان رکھو، اس کے لئے دین میں خلوص کا مظاہرہ کرو اس لئے کہ ابتداء کی طرح تمہارا لوٹنا بھی اسی کی طرف ہوگا۔ پھر انسانوں کے دو گروہوں کا ذکر کیا ایک ہدایت یافتہ دوسرا گمرکردہ۔ جس نے خود ساختہ گمراہیوں میں ڈال کر اپنے آپ کو غارت کر لیا، ان لوگوں نے شیاطین کو اپنا دوست بنا کر گمراہی اختیار کر لی اور پھر اس پر زعم یہ ہے کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں۔ بنی آدم کو حکم یہ تھا اور ہے کہ عبادت کے ہر موقعہ پر اپنے بدن کو زیب و زینت سے آراستہ کئے رہا کرو، کھاؤ پیو، مگر حد سے نہ گزرو۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والے ہیں۔

اس سورۃ کے ابتدائی تین رکوعوں کا خلاصہ اس لئے ضروری تھا کہ متعلقہ آیت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ تیسرے رکوع کی آخری آیت میں اسراف سے روک کر بعض اسلاف کے مطابق "آدھی طب اس میں جمع کر دی" اسراف کا مفہوم حد سے تجاوز کرنا ہے جس کی کئی شکلیں ہیں۔

حلال کو حرام کر لینا، حلال سے گزر کر حرام سے متمتع ہونے لگنا، اناپ شناپ بے تمیزی اور حرص سے کھانے پر گر پڑنا۔ بدون اشتہا یا ناوقت کھانا، یا اس قدر کم کھانا کہ جسم کی ضرورت بھی پوری نہ ہو یا مضرِ صحت چیزیں استعمال کرنا وغیرہ ذالک ؎

اس پورے پس منظر کو سامنے رکھ کر اب اعراف کی آیت ۳۲ پر غور کریں، اس کا ترجمہ آپ نے ملاحظہ کر لیا۔ اب مولانا ابوالکلام کا تفسیری نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

رہبانیت یعنی جوگ پنے کا رد اور اس رجلِ عظیمؒ کا اعلان کہ دنیوی زندگی کی آسائشیں اور زینتیں خدا پرستی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین خدا کی مرضی کی تعمیل ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا اولادِ آدم کو جو تعلیم دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اپنی زیب و زینت سے آراستہ ہو کر خدا کی عبادت کرو، پیروانِ مذاہب کی عالم گیر گمراہی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ روحانی سعادت تب ہی مل سکتی ہے جب دنیا ترک کر دی جائے اور خدا پرستی کا مقتضا یہ ہے کہ زینتوں اور آسائشوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے، حقیقت اس کے عین برعکس ہے، تم سمجھتے ہو زندگی کی زینتیں اس لئے ہیں کہ ترک کر دی جائیں، حالانکہ وہ اس لئے ہیں کہ کام میں لائی جائیں —— دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھیک طور پر کام میں لانا مشیتِ الٰہی کو پورا کرنا ہے (خط کشیدہ الفاظ بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ناقل)

خدا نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تمہارے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ کھاؤ پیو، زینت و آسائش کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ مگر حد سے نہ گذر جاؤ، دنیا نہیں، دنیا کا اعتدال سے ہٹا ہوا استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے۔ زندگی کی جن زینتوں کو پیروان مذاہب خدا پرستی کے خلاف سمجھتے تھے انہیں قرآن "زینۃ اللہ" یعنی خدا کی زینتوں سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیا دیں الٹ دیں، وہ دنیا جو نجات وسعادت کی طلب میں دنیا ترک کر رہی تھی اب اسی نجات وسعادت کو دنیا کی تعمیر و ترقی میں ڈھونڈنے لگی۔ یہاں زینت سے مقصود وہ تمام چیزیں ہیں جو زندگی کی قدرتی ضروریات سے زیادہ ہوں۔ مثلاً اچھا لباس، اچھا کھانا، معیشت کی تمام بے ضرر آسائشیں اور لذتیں[۴۹]

حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد فرماتے ہیں:

عالم کی تمام چیزیں اسی لئے پیدا کی گئی ہیں کہ آدمی ان سے مناسب طریقہ سے منتفع ہو کر خالق جل علا کی عبادت، وفاداری اور شکر گذاری میں مشغول ہو[۵۰]

حجازی متصل قبل کی آیت "کلوا واشربوا ولا تسرفوا" پر لکھتے ہیں:

بل علیکم بالعدل والتوسط فلا تقتیر ولا اسراف۔

کہ کھانے پینے میں عدل وتوسط سے کام لو نہ تو بالکل ہی بخل سے کام لو نہ اسراف سے۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد امام نسائی اور امام ابن ماجہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں جس کا ترجمہ ہے:

نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا، کھاؤ پیو، صدقہ کرو، ایسا لباس پہنو جس میں عجب وغرور نہ ہو اور نہ اسراف ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے کے وجود پر نظر آئے، اس لئے زینت میں قطعاً حرج نہیں۔ بشرطیکہ اس میں اسراف نہ ہو اور عجب وتکبر نہ ہو۔

اس کے بعد اسراف کے مختلف مدارج پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جسمانی طاقت وضرورت سے زیادہ کھانے پینے کی اشیاء کا استعمال کرنا نقصان کا باعث ہے[۵۱]

اپنی معاشی حالت سے بڑھ کر استعمال کرنا بھی نقصان کا سبب ہے اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا حرام و ہلاکت کا باعث ہے۔ ۵ۀ

السید سابق "حجر علی السفیہ" کا مستقل عنوان قائم کرکے پہلے تو سورۃ نساء کی آیت (ولا تؤتوا السفہاء الخ) سے استدلال کرتے ہیں۔

اور فرماتے ہیں:

دلت الآیۃ علی جواز الحجر علی السفیہ۔

اور پھر ابن المنذر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اکثر علماء الامصار یرون الحجر علی کل مضیع لمالہ صغیرا کان ام کبیرا۔

کہ اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو مال کو ضائع کرنے والا ہو چھوٹا ہو یا بڑا اس پر حجر لازم ہے۔

اور صاحب نیل الاوطار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وہ حماقت و سفاہت جو حجر کا باعث بنتی ہے وہ ہے مال کا خرچ کرنا فسق و فجور کے کاموں میں یا ایسی چیز میں جس میں کوئی مصلحت نہ ہو نہ اس میں دینی غرض ہو نہ دنیوی، جیسے ایسی چیز خریدنا جو فی الحقیقت ایک درہم کی ہو لیکن اپنی اکثر میں سو درہم ادا کرنا، اس کا فائدہ؟ نہ یہ اچھے لباس کے کام آیا نہ اچھی خوراک کے کہ اچھی خوراک اور اچھے لباس کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہے (جیسا کہ الاعراف کی آیت ۳۲ سے واضح ہے) لیکن یہ رویہ کیا ہے؟ اس کی توجیہ کیا ہوگی۔؟

اسی طرح کوئی شخص محض قرب سلطانی یا اس قسم کے مقاصد کے لئے پیسہ اڑاتے،

وکذا المنفقہ فی القرب الخ ۵ۀ تو یہ بھی سفیہ ہے اور حجر کا مستحق (اس حوالے شہر شہر کوٹھیاں، الیکشن پر لاکھوں کا صرف وغیرہ کو ذہن میں رکھیں اور پھر سوچیں کہ اس صرف کا مقصد سوائے حصول قرب چودھراہٹ اور کیا ہے؟)

اس کے ساتھ ہی وہ آیت بھی سامنے لائیں جس میں "تبذیر" سے منع کیا گیا اور پہلے گذر چکا ہے

اہل صفیہ سے "مبذر" مراد لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دو آیات ہیں سورۃ بنی اسرائیل کی۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

اور (دیکھو) جو لوگ تمہارے قرابت دار ہیں، جو مسکین ہیں جو (بے یار و مددگار) مسافر ہیں۔ ان سب کا تم پر حق ہے، ان کا حق ادا کرتے رہو اور مال و دولت کو بے محل خرچ نہ کرو، جیسا کہ بے محل خرچ کرنا ہوتا ہے۔ بے محل خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا ہے ۳۲ھ

مولانا آزاد کا نوٹ:

ماں باپ کے بعد قرابت داروں کے حقوق ہیں اور پھر ان سب کے ہیں، جو ہماری خبرگیری کے محتاج ہوں۔ پس آیت ۲۶ میں اس کا حکم دیا اور فرمایا "ولاتبذر واتبذیرا" تمہارے خرچ کرنے کا صحیح محل یہ ہے، پس بے محل مال و دولت خرچ نہ کرو۔ پھر فرمایا۔ جو لوگ تبذیر کرتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت بے محل خرچ کرڈالتے ہیں، مثلاً محض اپنے نفس کی عیش پرستیوں میں اڑا دیں گے تو وہ شیطان کے بھائی بندوں میں سے ہیں کیوں کہ شیطان کی راہ کفران کی راہ ہے اور انہوں نے بھی (مبذرین نے) کفران نعمت کی راہ اختیار کی۔

مال و دولت کے بے جا استعمال کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ آدمی نہ تو اپنے اوپر خرچ کرے نہ دوسروں پر۔ محض جمع کر کے رکھے، دوسروں پر خرچ نہ کرے قرآن نے دونوں صورتوں کو معصیت قرار دیا ہے، پہلی صورت "اکتناز" کی ہے۔

والذین یکنزون الذهب والفضة (۹: ۳۴)

دوسری تبذیر کی، یہاں اس سے روکا ہے ۳۳ھ

مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

وہ مال خدا کی بڑی نعمت ہے جس سے عبادت میں بڑی دلجمعی ہو، بہت سی اسلامی خدمات اور نیکیاں کمانے کا موقعہ ملے اس کو بے جا اڑانا ناشکری ہے، جو شیطان کی

تحریک و اغواءات سے وقوع میں آتی ہے اور اس سے انسان ناشکری کر کے شیطان کے مشابہ ہو جاتا ہے جس طرح شیطان نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتوں کو عصیان اضلال میں خرچ کیا اس نے بھی حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو نافرمانی میں اڑایا۔

سفیہ ومبذر کا معاملہ!

ایک شخص مرض الموت میں اپنی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کا ۳/۱ سے زائد حصہ عطیہ یا صدقہ میں دینا چاہتا ہے۔ تو اسے روکا جائے گا اور اس پر حجر کے حوالے سے پابندی لگائی جائے گی کہ یہ حضرت نبی کریم علیہ السلام کا واضح حکم ہے اور ایسا نہ کرنے سے وارثوں کا نقصان ہوتا ہے اس میں کسی قسم کے جھگڑے کا سوال نہیں، سبھی اس پر متفق ہیں۔ اسی طرح ایک صحیح العقل، سلیم الفطرت بیوی اپنے خاوند کے مال سے یا اپنے مال سے خرچ کرتی ہے تو اسے بھی شریعت اجازت دیتی ہے لیکن یہ اجازت بھی ۳/۱ تک ہے اس سے زائد پر گرفت ہوگی۔

ایک بچہ ہے تو اس پر پابندی لگانا کہ وہ کم سنی کے سبب اپنا مال اڑا نہ دے، بالکل صحیح اور مسلمہ معاملہ ہے، غلام کی بات ہے تو آج دنیا میں اس کا رواج ہی نہیں یہ قصہ مدت ہوئی انجام کو پہونچ چکا ہے۔ ہمارے سامنے اصل سوال سفیہ و مبذر کا ہے سفیہ' اس معنی میں نہیں کہ وہ کمسن ہے یا جنون کا شکار ہے بلکہ سفیہ بمعنی مبذر کا معاملہ ہے اور یہ اس لئے کہ اس سے اجتماعی طور پر فساد و بگاڑ اپنی انتہا تک پہونچ چکا ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کا ایمان معرض خطر میں ہے، اس وجہ سے دنیا میں ایسے انقلاب رونما ہو چکے ہیں جن کی وجہ سے ایمان واخلاق کا جنازہ نکل گیا ہے، جب کوئی معاشی نظام قارونی ذوق کے مطابق استوار ہوگا اور ایک مخصوص طبقہ یہ سوچ کر کہ میرے حالات، میری علمی و عملی صلاحیت وغیرہ نے مجھے اس کا موقعہ فراہم کر دیا ہے کہ میں دو چار سو مربعہ زمین ۱۰، ۲۰ محلات اور کوٹھیوں، تجارتی اداروں اور صنعتی پلانٹس کا مالک بن سکتا ہوں تو پھر قوموں کی اکثریتی آبادیاں دوسرے رخ سے سوچیں گی۔ اس سے پہلے کہ ایسی شکل پیدا ہو ضروری ہے کہ حالات پر قابو پالیا جائے۔

آج لوگ اخلاقی تعلیم سے یکسر غافل ہو کر کہتے ہیں کہ صاحب معاشیات سے اخلاق کا کیا تعلق؟ یہ تو اپنے زور کی بات ہے۔ آپ جتنا چاہیں سمیٹ لیں، لیکن یہ فلسفہ قابل قبول نہیں۔

جمہوریہ ہند کے سابق صدر مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین ایک معروف ماہر معاشیات تھے، انھوں نے لکھا،

کسی دیوار میں کبھی کوئی کیل بھی بلا اخلاقیات کے نہیں ٹھونکی گئی اور آپ کہتے ہیں کہ تم معاشیات سے اخلاقیات کو یکسر نکال دو۔[۵۵]

اور ایک دوسرے مفکر کے بقول:

معاشی مشاغل کے دائرہ میں اسلام کا مقصد پورے سماج کی عام خوش حالی ہے نہ صرف چند مستثنیٰ خواص کی جاگیر داری، جو بھی مختلف معاشی تعلیمات اسلام نے دی ہیں، سب کی انتہائی غرض وغایت معاشرہ کے مختلف طبقات و افراد میں کسی نمایاں فرق و امتیاز کو مٹانا ہے۔[۵۶]

ایک ندوی مفکر" اسلام کی اقتصادی روح کا تعین" کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ وہ روح کیا ہے؟ اور اس کا تعین کیونکر ہو سے جواب واضح ہے، مسائل واحکام کی اس ترتیب کی تہہ میں فلسفہ یا روح یہ ہے کہ جہاں تک تقسیم دولت کا تعلق ہے۔ کسی بھی شخص کے ساتھ ظلم نہ روا رکھا جائے، ہر شخص کو اس میں سے مناسب حصہ ملے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب دولت پھیلتی رہے، تقسیم ہوتی اور مختلف افراد میں بٹتی رہے، بیع وشراء، وراثت، اور صدقات اور زکوٰۃ کے مسائل دراصل اسی غرض کو پورا کرتے ہیں، بہ حیثیت مجموعی اسلام کے مزاج پر غور کرو، اس کا اشکال یہ نہیں کہ دولت کیونکر جمع ہو یا کس طرح معاشرہ میں بڑے بڑے قارون اور سرمایہ دار پیدا کئے جائیں، اس کے برعکس اس کا اشکال یہ ہے کہ دولت کیونکر بکھرے، کس طرح مستحق ہاتھوں تک پہونچے اور کیونکر آخر میں غربت اور احتیاج کا خاتمہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اسلام جب صدقات، زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین کرتا ہے تو اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ معاشرہ ہمیشہ بلند و پست اور محتاج و غنی کے دو طبقوں میں منقسم رہے، ہمیشہ ایک بالاتر گروہ تو دولت و ثروت کی

فراوانیوں سے بہرہ مند رہے اور ایک طبقہ یا انسانوں کی بہت بڑی اکثریت
غربت، افلاس اور احتیاج کے ہاتھوں نالاں اور پریشان رہے ۔

پھر انہوں نے واضح کیا ہے کہ اصل روح گردش دولت ہے، اس سلسلہ میں سورۃ التوبہ کی آیت ۳۵۔ سورۃ حشر کی آیت ۷، سورۃ ذاریات کی آیت ۱۹، اور البقرہ کی آیت ۱۷۷ (آیت البر) کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے، جو بلاشبہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، اور اسلام کی روح کا اصل اقتضا یہی ہے، وہ کسی طرح اجازت نہیں دیتا کہ اس میں استحصال کا دور دورہ ہو، استحصال کا مفہوم یہ ہے کہ معاشرہ میں لینے دینے کے دو پیمانے ہوں، صاحب حیثیت و ثروت کا معاملہ آئے تو اپنی حیثیت کے بل بوتے پر اور انداز اختیار کرے۔ لیکن اس کی تجوری سے نکلنے کی نوبت آئے تو وہ مزدور کے اس وقت کے پیسے بھی کاٹ لے جس میں اس نے نماز ادا کی ۔
قرآن عزیز نے سورۃ مطففین کی ابتدا میں ایسے ہی لوگوں کو خرابی کا مستحق گردانا اور فرمایا :

ناپ، تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر اور تول کر دیں تو کم دیں ۔

یعنی جب اپنے نفع کا سوال ہو تو بھاؤ ڈانچا ہو (بلکہ اہل اقتدار سے ملی بھگت کر کے کنٹرول ریٹ کا چکر چلائے) اور جب دوسروں کو ان کی محنت کا ثمرہ دینا پڑے تو بھاؤ کم ہو جائے ۔ گویا استحصال تطفیف کی ایک قسم ہے[۵۴]

(باقی آئندہ)

مجیب اللہ ندوی

سید صاحبؒ کے بارے میں کچھ اور باتیں

۱۱/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے الرشاد میں "خدمت سلیمانی میں چند سال" کے عنوان سے راقم الحروف نے کچھ ذاتی تاثرات اور مشاہدات لکھے تھے، مگر حافظہ میں اور بہت سی باتیں محفوظ تھیں مگر لکھتے وقت ساری باتیں زبانِ قلم پر نہ آسکیں۔ چند اور باتیں جواب پردۂ حافظہ سے باہر آرہی ہیں انہیں سپرد قلم کیا جا رہا ہے" (مرتب)

حضرت سید صاحب تہجد کی نماز کے بعد اپنے گھر کے سامنے والے صحن میں بیٹھ کر ہلکی مگر پرسوز آواز سے جب ذکر فرماتے تھے تو اس کی آواز ہم لوگوں کے کمرے تک جاتی جس کا فاصلہ ان کے گھر سے کم از کم ڈھائی سو گز تھا، جس سے ہم لوگوں کو بھی مہمیز ہوتی تھی۔

سید صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کچھ لوگ شیخ ابن عربی پر سخت تنقید کرتے ہیں اور کچھ امام ابن تیمیہ پر اعتراض کرتے ہیں، مگر ہم ندوہ والے دونوں کے قدرداں ہیں۔ ع

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

ہر بڑے آدمی کے کچھ سطحیات اور کچھ تسامحات ہوتے ہیں، ان کی شخصیت کو ان باتوں پر نہ تولنا چاہیئے ہم لوگ ان بڑوں کے سلسلہ میں یہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔

ایک بار میں نے پوچھا کہ مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ میں کون بڑا عالم تھا۔ فرمایا کہ امام سیوطیؒ اور امام سخاویؒ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔! میں نے دونوں کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ فرمایا کہ ان میں ایک سیوطی تھا اور دوسرا سخاوی۔ ایک کے علم میں وسعت زیادہ تھی اور ایک میں گہرائی۔

مشہور اہلحدیث عالم مولانا ابراہیم سیالکوٹی مرحوم نے ایک بار سید صاحب کو لکھا کہ میں مئو ایک جلسے میں شرکت کرنے کیلئے آرہا ہوں، مگر میں پہلے اعظم گڈھ آکر آپ کی زیارت کروں گا پھر مئو جاؤں گا۔ سید صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ دیکھو مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی فلاں تاریخ کو آرہے ہیں، شبراتی کی بگی لے کر اسٹیشن چلے جانا اور ان کو لے آنا۔ اعظم گڈھ میں اس وقت دو گھوڑوں کی بگی ہی معزز لوگوں کو لانے، لیجانے کیلئے استعمال ہوتی تھیں اس وقت انسانوں سے جانوروں کا کام لینے والی سواری (رکشے وغیرہ) کا رواج نہیں تھا پہلے شہر میں کئی بگیاں تھیں، اب صرف ایک بگی رہ گئی تھی۔

چنانچہ میں مقررہ تاریخ کو بگی لے کر اسٹیشن گیا۔ چند منٹ بعد گاڑی آگئی۔ اور ایک بزرگ گاڑی سے اترے جن کے ساتھ ایک خادم تھے۔ کبھی دیکھا نہیں تھا مگر میں نے اندازے سے سمجھ لیا کہ یہی بزرگ مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی ہیں۔ میں نے سلام کے بعد کہا کہ حضرت سید صاحب نے مجھے آپ کے استقبال کی خدمت پر مامور کیا ہے۔ وہ بولے بہت اچھا۔ گاڑی ۴ ½ بجے اسٹیشن پہونچی تھی، یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ مگر انہوں نے کہا کہ عصر کی نماز یہیں پڑھ لی جائے یا دارالمصنفین چل کر، میں نے ان کی رعایت سے کہا کہ وہاں پہونچنے میں دیر ہو جائے گی آپ یہیں پڑھ لیں۔ چنانچہ اسٹیشن پر ہم لوگوں نے نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر ہم لوگ سیدھے دارالمصنفین کیلئے روانہ ہو گئے۔ سید صاحب نے انتظار میں چائے نہیں پی تھی، جاتے ہی چائے ہوئی اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔

اسٹیشن سے آتے ہوئے مولانا محترم نے مجھ سے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں ایک بار مجھے خیال آیا کہ ان میں ارجاء تھا۔ یہ خیال آنا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے فوراً استغفار کیا اور معاً یہ خیال بھی آیا کہ جو شخص اپنے زمانہ کا اتقی الناس رہا ہو وہ مرجی کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر جا کر میری یہ کیفیت دور ہوئی۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ ان کے بارے میں حسن ظن سے کام لیا۔ مولانا کی اس حق گوئی سے میں بہت متاثر ہوا اور چائے کے بعد سید صاحب سے بھی اس کا ذکر کیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بحمداللہ ہر طبقہ کے معتدل لوگوں سے ہی میرا تعلق ہے۔

میں نے ان کی اس بات کے نقل کرنے میں بحمداللہ قریب قریب روایت باللفظ کی پوری رعایت کی ہے۔

اس وقت راقم الحروف دارالمصنفین کے احاطہ ہی میں رہتا تھا۔ اور امامت بھی میرے ہی سپرد تھی، مگر میں ہر نماز کے وقت مولانا سے نماز پڑھانے کیلئے کہتا تھا، مگر انہوں نے نماز نہیں پڑھائی۔ فجر کے وقت میں مسجد پہونچا تو دیکھا کہ مولانا اور ان کے خادم باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں۔ ابھی غلس کا وقت تھا، اس لئے مجھے خیال ہوا کہ یہ حضرات تہجد پڑھ رہے ہیں، ان کی نماز ختم ہونے کے بعد میں نے اذان کہی اور پھر سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب وغیرہ تشریف لائے اور اسفار کے ابتدائی حصہ میں فجر کی نماز ہوئی۔ مگر یہ دونوں حضرات نماز میں شریک نہیں ہوئے۔ سید صاحب یا کسی اور نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر نماز کے بعد جب سید صاحب وغیرہ مسجد سے چلے گئے اور مولانا کچھ وظیفہ پڑھنے میں مشغول تھے کہ میں سلام کے ان کے قریب بیٹھ گیا، اور جماعت میں نہ شریک ہونے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ عموماً غلس میں نماز پڑھنے کی عادت ہے۔ اسی عادت کے مطابق آج بھی نماز پڑھ لی۔ میں نے پوچھا مولانا یہ فرمائیں کہ غلس میں نماز پڑھنا افضل ہے یا اسفار میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا افضل ہے؟ فرمایا کہ ہاں بھائی افضل تو جماعت ہی سے پڑھنا ہے، اس وقت یہ بات ختم ہوگئی لیکن جب ہم لوگ ناشتہ پر بیٹھے تو مولانا نے سید صاحب سے فرمایا کہ ان صاحبزادے نے تو مجھ سے آج بہت سے سوالات کر ڈالے، پھر مسجد کی گفتگو نقل کی، سید صاحب مسکرا کر خاموش ہوگئے۔

ایک بار عشاء بعد میں اپنے کمرے میں ہدایہ کا مطالعہ کر رہا تھا، جاڑے کا زمانہ تقریباً رات کے دس بجے تھے کہ کمرہ میں پیچھے سے آہٹ محسوس ہوئی، کرسی سے مڑ کر دیکھا تو سید صاحب کمرہ میں داخل ہو رہے تھے۔ پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بتایا تو پھر فرمایا کہ پڑھنا اور مطالعہ سب اعتدال سے کرو ورنہ میری جیسی صحت ہوجائے گی۔ اب رات میں کچھ کام نہیں ہوتا ورنہ بارہ بارہ بجے رات تک کام کرتا تھا۔

حضرت سید صاحب کے علمی انہماک کے بارے میں دارالمصنفین کے خوش مذاق پرانے

مصحح مولوی عبد الباری صاحب کہا کرتے تھے کہ "اگر سید صاحب کو قضائے شہوت کے وقت بھی کوئی علمی مسئلہ یاد آجائے تو وہ چھوڑ کر کتب خانہ چلے آئیں اور اسے فوراً لکھ کر واپس جائیں۔ واقعہ بھی تھا کہ کبھی کبھی رات میں وہ کتب خانہ کھلوا کر لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے تھے اور گھنٹوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔

ایک بار میں نے پوچھا کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے آپ نے قرآن پاک میں استفادہ کیا ہے؟ فرمانے لگے کہ ہاں میں نے بہت سی جگہوں پر ان سے استفادہ کیا ہے۔ مگر ان سے استفادہ کی شکل یہ نہیں ہوتی تھی کہ کوئی سوال کیا جائے اور فوراً جواب دیدیں۔ بلکہ اگر غور کرنے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجانے والی بات ہوتی تو فرماتے کہ آپ پھر غور کریں۔ اور اگر ذرا کوئی مشکل بات ہوتی تو پھر اسے بتاتے تھے۔

سید صاحب نے حیات شبلی کا مقدمہ اس وقت لکھا جب وہ مولانا تھانویؒ سے بیعت ہو چکے تھے۔ جو اس وقت تصوف کے فکر وعمل کے سب سے بڑے شارح تھے اور علامہ شبلیؒ نے گو سوانح مولانا روم اور شعر العجم میں مسائل تصوف کی جابجا بڑی اچھی تشریح کی ہے مگر مجموعی حیثیت سے ان کے سوچنے اور برتنے کا انداز متصوفانہ نہیں تھا۔ سید صاحبؒ کے دل میں مولانا تھانویؒ کا انتہائی احترام تھا۔ مگر علامہ شبلی سے بھی انہیں بے پناہ محبت تھی۔ جو کسی زمانہ میں کم نہیں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں طرز فکر وعمل کی مقدمہ میں بڑی اچھی توجیہ بھی کی ہے اور صوفیا اور متکلمین دونوں کا مقام بھی مقرر کیا ہے۔ سید صاحبؒ نے ۱۹۴۰ء میں طلبائے قدیم کے جلسہ کے اختتام کے دن خواص علماء کی موجودگی میں اپنا یہ مقدمہ جالیہ ہال میں سنایا۔ مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادیؒ درمیان درمیان میں اپنے جسم کی حرکت سے زیادہ اور زبان سے کم اس کی داد دیتے رہے اور مولانا عبد الباری صاحبؒ ندوی نے سنکر فرمایا کہ صوفیا اور متکلمین کے کاموں کی آپ نے بہترین تعبیر کی ہے۔

سید صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب کسی جگہ، میٹنگ یا کانفرنس وغیرہ میں بلایا جاتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ نہ جائیں گے تو لوگ کمی محسوس کریں گے اور انتظار کریں گے۔ مگر وہاں پہنچ کے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے نہ آنے سے کوئی کمی نہ ہوتی بلکہ اپنے کو بسا اوقات بے ضرورت محسوس

تا تھا۔

سید صاحبؒ انتہائی کم گو اور باوقار رہتے تھے، مگر جب انشراح ہوتا تو اپنے خوردوں سے بھی مزاح فرما لیتے تھے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ تمہارے گاؤں کا نام کیا ہے میں نے "کسی خورد" فرمایا کہ میاں یہ تو کسی عورت کا نام معلوم ہوتا ہے۔

ایک بار گھر جانے کیلئے رخصت کی درخواست دی، جلد ہی میری شادی ہوئی تھی۔ مسکرا کر فرمایا کہ "کیا تم نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔"

ہندوستان کے سارے علماء و صلحاء سید صاحبؒ کو سید الطائفہ سمجھتے تھے، مگر حضرت سید صاحب اپنے سے بڑے علماء و صلحاء ہی نہیں بلکہ ہم عصر علماء و صلحاء کی مجلس میں بھی زیادہ خاموش بیٹھے ان لوگوں کی باتیں سنتے رہتے تھے، ذکر آچکا ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ جب پہلی بار ۱۹۴۳ء میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ میں قیام ہوا تو تین دن مسلسل حضرت سید صاحبؒ موجود تھے مگر ان کی مجلس میں ایک لفظ نہیں بولے برابر ان کی گفتگو سنتے رہے۔

ایک بار دارالمصنفین میں مولانا تھانویؒ کے کئی اہم خلفاء جن میں مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ، مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ، ڈاکٹر عبدالحیؒ، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ وغیرہ جمع ہو گئے تھے اور کئی دن یہاں قیام رہا۔ مگر سید صاحب نے بہت کم گفتگو فرمائی، زیادہ تر مولانا پھولپوریؒ اور خواجہ عزیز الحسن صاحب بولتے رہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خواجہ صاحب ہی پوری مجلس پر چھائے رہے۔ بات بات پر وہ اشعار پڑھتے، خود بے خود رہتے اور دوسروں کو بے خود بناتے رہتے۔

سید صاحب جب مولانا تھانویؒ سے بیعت ہوئے اور ندوہ کے حلقہ میں اس کی اطلاع ہوئی تو اس کو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا کچھ ندویوں نے زبانی اور کچھ نے تحریری طور پر سید صاحب کو لکھا کہ آپ کے قلم سے سیرت نبوی اور خطبات مدراس جیسی کتابیں لکھی گئیں اور سیکڑوں موضوع پر آپ نے علم و تحقیق کے موتی بکھیرے ہیں پھر بحمد اللہ روز اول سے آپ تابع سنت اور زہد و تقویٰ سے بھی بہرہ ور ہیں پھر وہ کون سی کمی تھی کہ آپ نے یہ قدم اٹھایا۔

عوام کیلئے تو یہ چیز صحیح ہو سکتی ہے مگر آپ جیسے علامۂ وقت کیلئے یہ چیز زیب نہیں دیتی۔

سید صاحب نے بعض عزیز ندویوں کو لکھا اور کچھ لوگوں سے زبانی فرمایا کہ بھائی اگر تم علم و تحقیق میں مجھے علامہ سمجھتے ہو تو میرے اس اقدام میں بھی مجھے کیوں علامہ نہیں سمجھتے۔

امام غزالی اپنے وقت میں مدرسہ نظامیہ کے صدر تھے جو اس وقت کا خلافت کے بعد سب سے بڑا اعزاز تھا، مگر انہوں نے اپنے اندر کچھ کمی پائی اس لئے اسے چھوڑ کر برسوں اہل دل کی جبہ سائی اور صحرا نوردی کرتے رہے اور پھر احیاء العلوم وغیرہ لکھی۔

انہوں نے المنقذ من الضلال میں اپنی پوری سرگزشت لکھی ہے، اس لئے میرے اس اقدام کو بھی کسی کمی کا نتیجہ کیوں نہیں سمجھتے؟۔

سید صاحب کے پاس قرآن پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ کے ساتھ ہمیشہ ساتھ رہتا تھا، اسی سے عموماً تلاوت فرماتے تھے اور اس پر ان کے کچھ حواشی بھی تھے، معلوم نہیں دارالمصنفین کے لوگوں نے اسے محفوظ رکھا ہے یا نہیں؟

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے قرآن پاک کے حاشیہ میں قصص اور مقامات کی تعیین میں سید صاحب کی کتاب ارض القرآن سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر کہیں سید صاحب کا نام نہیں لیا ہے۔ بلکہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ" ارض القرآن کا مصنف لکھتا ہے" جیسے کسی مستشرق وغیرہ کا ذکر ہو۔ سید صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ بھائی میں تو ان کے حواشی کا بڑا قدرداں ہوں۔ اب وہ اس طرح لکھتے ہیں تو انھوں نے قدردانی کا یہی معیار مقرر کیا ہوگا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں گجرات کے سفر سے واپس ہوتے ہوئے دو دن ندوہ میں بھی سید صاحب کا قیام رہا، اسی قیام کے دوران ایک دن شام کو مولانا علی میاں اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم کے قائم کردہ ادارہ تعلیمات اسلام تشریف لے گئے اور راقم الحروف بھی ساتھ تھا، باتوں باتوں میں مولانا عبدالغفار صاحب ندوی نے سید صاحب سے عرض کیا کہ سنا ہے آپ ریاست بھوپال بحیثیت قاضی تشریف لے جا رہے ہیں؟ سوال کا انداز معترضانہ تھا سید صاحب نے فرمایا کہ

آپ کو اس سے اختلاف ہے؟ عبدالغفار صاحب نے کہا کہ ہاں! وہاں آپ کی حیثیت انگریزوں کی باطل یا جگنذار ریاست کے قاضی کی ہوگی۔ سید صاحب نے ذرا ناراضگی کے انداز میں فرمایا کہ تم لوگوں کو بس ہر کام میں باطل نظر آتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہمارے کچھ علماء نے مسلمان حکومتوں سے تعلق قائم کر کے بہت سی اصلاحات کی ہیں۔ پھر زہری امام شعبی اور امام ابو یوسف وغیرہ کی مثال دی۔ پھر فرمایا کہ ابھی کوئی فیصلہ تو نہیں کیا ہے لیکن اگر جانا ہوا تو محکمۂ قضا میں کچھ اصلاحات کیلئے جاؤں گا۔

ملفوظات حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی مدظلہ

ایک نسخۂ کیمیا

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ آیئے ہم آپ کو ایک نسخۂ کیمیا بتائیں وہ یہ ہے کہ ہم جو بھی کام کریں اس میں سنت کا لحاظ کریں۔ مثلاً جب کھانا کھائیں تو اکڑو بیٹھ کر یا ایک پاؤں کھڑا کر کے کھائیں یہ سمجھ کر کہ یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اسی طرح جب سونے کیلئے لیٹیں تو داہنی کروٹ پر لیٹیں کہ یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسجد میں دائیں پیر سے داخل ہوں اور بائیں پیر سے نکلیں اور استنجا خانے میں بائیں پیر سے داخل ہوں اور داہنے پیر سے نکلیں یہ قصد کر کے کہ یہ بھی سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اسی طرح ہر کام کو اس استحضار کے ساتھ کریں کہ یہ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ چند روز کوئی اس طرح کر کے دیکھ لے اگر وہ صاحب نسبت نہ ہو جائے تو میرا ذمہ ہے، فَاتَّبِعُوْنِیْ کا یہی مطلب ہے کہ تم میری چال چلو، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا ہر کام یعنی اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا رہنا سہنا، ملنا جلنا، لینا دینا، سب سنت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

قبولیتِ عمل کی دو شرطیں

بزرگوں نے فرمایا ہے اور میں اس کو برابر بیان کرتا ہوں کہ اعمال کے قبول ہونے کی دو شرطیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ عمل سنت کے مطابق ہو اور دوسرے یہ کہ اللہ ہی کے لئے ہو یعنی اس میں اخلاص ہو، پس جو کام سنت کے مطابق نہ ہوگا وہ بھی قبول نہ ہوگا اور جس عمل میں اخلاص نہ ہوگا وہ بھی قبول نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ

یعنی آگاہ ہو جاؤ اللہ کیلئے دین خالص ہی ہے

سنئے! علمائے کرام کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ شریعت کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اللہ و رسولؐ کے احکام بتلاتے ہیں، لوگوں کو عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اور صوفیائے کرام اعمال کو خالص اللہ کے لئے بناتے ہیں اور اس کے طریقے بتلاتے ہیں، نفوس کا تزکیہ فرما کر اخلاص پیدا کرتے ہیں یہی ان کا منصب ہے۔

آخرت کا یقین

حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے احوال و کیفیات میں یوں تو ہزاروں کتاب لکھی گئی ہیں لیکن سب کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ دنیا کا فانی ہونا، آخرت کا باقی ہونا، حق تعالیٰ کا کارساز ہونا اور اپنا لاشیٔ محض ہونا، ان سب چیزوں کا پورا پورا یقین ان کو حاصل تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ مٹ جانے والی ہے اور آخرت باقی ہے، اس بنا پر وہ ہر وقت آخرت کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔

اکابر امت اور بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ سلف صالحین کے بعد اس امت سے سب سے پہلے جو چیز رخصت ہوئی وہ آخرت کا یقین ہے۔ آج یہی یقین کمزور ہو گیا ہے جس کی وجہ سے لوگ آخرت کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں اور دنیا میں ایسا منہمک ہیں کہ آخرت ان کو بھول کر یاد نہیں آتی، اسلاف کے حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آخرت ہر وقت ان حضرات کے سامنے رہتی تھی۔

بزرگوں کی سخاوت

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہ کی خدمت میں ایک نواب آئے اور انہوں نے ایک بہت قیمتی لباس حضرت کو پیش کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اس کو میں کسی کو نہیں دونگا اس کو صرف اپنے لئے رکھوں گا، اتنے میں ایک صاحب آئے اور زور کہنے لگے کہ میں مفلس آدمی ہوں میری دو لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں ان کی شادی کیلئے میرے پاس اور تو کچھ نہیں کیسے انتظام کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ بھائی میرے پاس اور تو کچھ نہیں، ابھی ایک شخص نے ایک عبا پیش کیا تھا لاؤ اسی کو دیدوں، چنانچہ دیدیا۔

حضرت کے وہاں یہ بھی معمول تھا کہ جو بڑے بڑے لوگ وہاں موجود رہتے تھے وہ اس

قسم کی چیزیں تبرکاً خرید لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بڑے رئیس نے اس عبا کو ایک ہزار روپیہ دیکر خرید لیا۔ اس نے بڑی خوشی سے وہ عبا دیدیا اور روپیہ لے کر چلا گیا۔ کسی خادم نے اس کے جانے کے بعد حضرت سے پوچھا کہ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ اس عبا کو میں کسی کو نہ دونگا صرف اپنے لئے رکھوں گا پھر آپ نے اس کو کیوں دیدیا؟ فرمایا کہ ارے بھائی تم نہیں سمجھا، رکھ تو لیا اللہ کے یہاں جمع ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ٥

ترجمہ:۔ اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہونچکر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔

اسی طرح یہ آیت ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ٥

ترجمہ:۔ یعنی تمہارے پاس والی سب چیزیں فانی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

مولانا ریاض الحسن نوری
(مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

سباق (گھڑ دوڑ)

شرعی نقطۂ نظر سے[1]

جہاں تک تابعی سعید بن المسیب کے محلل کے جواز کے قول کی بات ہے تو اس کے راوی امام مالک کا خود اس پر عمل نہیں بلکہ وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں. ہم کو واضح ہوگیا کہ ان کی روایت میں اس قول کی نسبت ابن المسیب کی طرح ضعیف قرار پائے گی. جس بات کی امام مالک مخالفت کرتے ہوں ہم اس کو کیسے قبول کر سکتے ہیں. یہاں بھی ابو حنیفہ کے اصول پر ہمارا عمل ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے. لیکن امام محمد نے جو ابن مسیب کے قول سے حجت پکڑی تو ابو حنیفہ کے خلاف کیا.

مزید عینی لکھتے ہیں کہ:

پیدل ریس میں اگر مالی شرط ایک جانب سے ہو تو ایسا پیدل مقابلہ یعنی دوڑ جائز ہو گی۔ یہ ایک رائے امام شافعی کی بھی ہے لیکن ان کا منصوص قول یہ ہے کہ ایسی پیدل دوڑ بھی جائز نہ ہو گی۔ اور امام مالک و امام احمد نے بھی پیدل دوڑ میں یکطرفہ شرط کو بھی ناجائز کہا ہے۔

مزید یہ کہ گدھوں اور خچروں کی ریس بھی جائز نہیں۔

امام شافعی کا ایک یہی قول ہے اور مالک و احمد کا قول بھی یہی ہے کہ جائز نہیں جب کہ اس میں یک طرفہ مالی شرط ہو، لیکن شافعی کا ایک قول جواز میں بھی ہے۔ اصل عربی الفاظ ملاحظہ ہوں:

والمسابقة بالاقدام تجوز اذا كان المال مشروطا من جانب واحد وبه قال الشافعي في قول وقال في المنصوص لا يجوز وبه قال مالك واحمد ولا تجوز المسابقة في البغال والحمير وبه قال الشافعي في قول ومالك واحمد

---

[1] تسلسل کے لئے اکتوبر ۸۳ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔

اذا کان بجعل ومن الشافعی فی قول تجوزه

اب ہم غرناطہ کے رہنے والے مشہور مالکی عالم کا قول بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے مالکی اصول فقہ پر ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک مختصر باب مسابقہ کا بھی ہے۔ ہم اس کو من وعن نقل کرتے ہیں۔ ان کا نام نامی محمد بن احمد بن جزی الغرناطی المالکی ہے۔ اور یہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور علماء میں سے ہیں۔ اس بیان میں سے سب سے اہم بات نوٹ کرنے والی یہ ہے کہ انعام، عوض رہان ہم معنی الفاظ ہیں، رہان کا لفظ فقہ کی کتب میں حاکم کے انعام اور یک طرفہ شرط کے لئے بھی آتا ہے، دونوں صورتیں رہان کہلاتی ہیں جو سب کے نزدیک جائز ہیں۔ جہاں حدیث وفقہ میں یہ لفظ ہے۔ وہاں یہی جائز صورت مراد ہے البتہ دوطرفہ شرط کو بھی رہان کرسکتے ہیں۔

فی المسابقة والرمی

المسابقة بین الخیل جائزة، وقیل مرغب فیها، کان کانت بغیر عوض جازت مطلقاً فی الخیل وغیرها من الدواب والسفن وبین الطیر لایصال الخبر بسرعة، ویجوز علی الاقدام وفی رمی الاحجار۔ والمصارعة وان کانت بعوض وهو الرهان فلها ثلاث صور" الاولیٰ" ان یخرج الوالی او غیره مالا یاخذه السابق فهذه جائزة اتفاقاً "الثانیة" ان یخرج کل واحد من المتسابقین مالا فمن سبق منهما اخذ مال صاحبه وامسك متاعه ولیس معهما غیرهما فهذه ممنوعة اتفاقاً، فان کان معهما ثالث وهو المحلل فجعلا له المال ان کان سابقاً ولیس علیه شئ ان کان مسبوقاً فاجاز ذلك ابن المسیب والشافعی ومنعه مالك" الثالثة" ان یخرج المال احد المتسابقین فیجوز ان کان

لہ عمدۃ القاری : ۱۴ : ۱۶۱۔

لا یعود الیہ و یاخذہ من سبق سواہ او من حضر، والرمی کالسبق فیما یجوز ویمتع، ویجعل للسبق امد، وللرمی اشارۃ غرض۔ [1]

ترجمہ: یعنی مسابقہ اور تیر اندازی کا باب، گھوڑوں کے درمیان مقابلہ جائز ہے، کہا جاتا ہے کہ مرغوب ہے۔ اگر اس مقابلہ میں کوئی عوض یعنی انعام مقرر نہ ہو تو ایسا مقابلہ جائز ہے۔ مویشیوں اور کشتیوں اور پرندوں کے ذریعہ خبر کو سرعت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچایا جا سکتا ہے، اسی طرح سے پیدل ریس اور پتھر پھینکنے کے مقابلے اور کشتی کے مقابلے بھی جائز ہیں۔ یہ تو بغیر عوض کی بات تھی۔ لیکن اگر انعام بھی رکھا جائے تو اس کو رہان کہتے ہیں۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ حاکم یا کوئی دوسرا شخص انعام مقرر کر دے جو اوّل آنے والے کو دے دیا جائے۔ ایسا مقابلہ یار ہان سب کے نزدیک جائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے مقابلہ کرنے والوں میں سے ہر ایک ایک رقم نکالے اور جیتنے والا دوسرے کی رقم بھی لے لے اور اس کی اپنی رقم بھی اسکے پاس رہے اور مقابلہ میں کوئی تیسرا نہ ہو تو یہ سب کے نزدیک منع اور ناجائز ہے، لیکن اگر ان دونوں کے ساتھ تیسرا بھی ہو جو محلل کہلائے گا اور دونوں اوّل الذکر اس محلل کو مال دے دیں۔ اگر وہ اول آجائے لیکن اس پر کوئی رقم دینی نہ آئے اگر وہ پیچھے رہ جائے۔ تو ایسے معاملہ کی اجازت ابن المسیب اور شافعی نے دی ہے لیکن امام مالک نے اس سے منع کیا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر ایک شخص جو دوڑ میں حصہ لے رہا ہے وہ اکیلا کوئی رقم نکالے۔ تو یہ معاملہ جائز ہوگا بشرطیکہ وہ رقم واپس اس کے پاس نہ آئے۔ بلکہ اوّل آنے والا لے یا وہاں موجود کوئی شخص لے لے۔ تیر اندازی بھی جواز اور ناجائز ہونے میں سبق کے مثل ہے۔ (ابن جزی کا بیان ختم ہوا)

یہ بات واضح ہو گئی محلل کی اجازت پر اہل مدینہ کا عمل ہرگز نہیں تھا، اور نہ صحابہ کا کبھی عمل تھا، امام مالک جو اہل مدینہ کے عمل کو اس حدیث پر بھی ترجیح دیتے ہیں،

---

[1] قوانین الاحکام الشرعیہ: ۱۷۷۔

جو خبر واحد ہو وہ امام مالک نہ صرف محلل سے منع کرتے ہیں۔ اسے ناجائز کہتے ہیں۔ بلکہ عینی اور مغنی کے بیان کے مطابق تو یک طرفہ شرط کو بھی قمار کہتے تھے۔

مزید یہ بات سب کو معلوم ہے امام مالک کا مذہب حجاز۔ تمام شمالی افریقہ سے لے کر سپین تک پھیلا ہوا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری کے ابن جزی کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس دور تک مالکی فقہاء بھی محلل کے خلاف تھے۔ گویا حجاز سے لے کر اندلس یعنی سپین تک محلل کے طریق پر کبھی مسلمانوں میں مقابلے نہیں ہوتے۔ تاریخ سے ہمیں کہیں بھی ایسے مقابلوں کا ثبوت نہیں ملتا۔ یوں حیلہ جو علماء کے ایسے افسوسناک واقعات بھی ملتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب جن کے پاس بہت مال و دولت تھا ۶ ماہ کے لئے اپنی دولت اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتے تھے اور پھر ۶ ماہ بعد ان کی بیوی ان کو ہبہ کر دیتی تھی۔ اس طرح سے کسی کی ملکیت میں بھی سال پورا نہ ہوتا اور کسی پر بھی زکوٰۃ عائد نہ ہوتی۔ قرآن میں میسر کے ساتھ خمر کا ذکر بھی آیا ہے۔ خمر کے سلسلے میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں؛

"اس وقت اسلامی سوسائٹیاں عموماً اس رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، مسلمانوں کو اس عہد میں امن فراغ، اطمینان، زر و مال سب کچھ میسر تھا، پھر کیا چیز تھی جو ان کو زندگی کے پُر خطر مقاصد سے روک سکتی، ایک مذہب البتہ دراندا ز ہو سکتا تھا لیکن جدت پسند طبیعتیں اس کو بھی کھینچ تان کر اپنے ڈھب کا بنا لیتی تھیں۔ شراب کی جگہ نبیذ (کھجور کی تاڑی) موجود تھی۔ جس کو عموماً عراق کے مذہبی پیشواؤں سے حلت کی سند مل چکی تھی۔ [۱]

چونکہ شبلی نے اس موقعہ پر گھوڑوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گھڑ دوڑ کیا اس پر شرط لگانے اور محلل کے استعمال کا رواج عراق وغیرہ میں بھی نہیں تھا۔ اس کا کوئی بھی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ مصر میں عمرو بن عاص کے

---

[۱] شبلی: المامون: ۲: ۱۲۸ مطبوعہ دہلی۔

دور میں جس گھڑدوڑ کا ذکر ملتا ہے اس میں بھی کسی قسم کے انعام یا شرط کا ذکر نہیں، نہ محلل کا ذکر ہے۔ پس ثابت ہوا مسلمانوں میں شرطیہ گھڑدوڑ کبھی رائج نہیں رہی، یہ چیز یورپ سے درآمد ہوئی ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ گھوڑ دوڑ پر شرطیں لگانا نہ حضورؐ کے زمانے میں رائج تھا اور نہ بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں رائج رہا۔ پس آج کے دور میں جب کہ موجودہ جنگ میں گھوڑے کام نہیں آتے نہ کوئی ڈویژن یا بریگیڈ پاکستانی فوج کا ایسا ہے جو گھڑسواروں پر مشتمل ہو۔ تو گھوڑوں پر شرطیں لگانا کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے دوطرفہ شرائط تو کیا۔ اب تو گھوڑوں پر یک طرفہ شرط بھی امام مالکؒ امام محمدؒ اور امام شافعی کے منصوص قول کے مطابق ناجائز ہو گی کیونکہ ہم عینی کا حوالہ پیش کر چکے ہیں کہ پیدل ریس بھی جس میں ایک جانب سے شرط ہو وہ بھی امام مالک، امام احمد اور امام شافعی کے منصوص قول کے مطابق ناجائز ہو گی تو پھر گھوڑ دوڑ کا کیا ذکر۔

مزید دیکھئے زیلعی شرح کنز الدقائق کے حاشیہ میں درج ہے کہ:

فان قیل اذا لعب بالشطرنج یرید بذلك تعلم الحرب قیل له یکون وزره اشد لانه اتخذ آیات الله هزوا لانه یرتکب المعصیة ویظهر من نفسه انه یرید الطاعة [1]

یعنی جو شخص شطرنج کھیلے اور یہ کہے کہ اس سے اس کی نیت جنگی علم حاصل کرنا اور مہارت جنگی حاصل کرنا ہے تو اسے کہا جائے گا کہ تیرا گناہ زیادہ بڑا ہو گیا ہے، کیونکہ تو نے خدا کی آیات کو مذاق بنا لیا ہے۔ کرتا گناہ ہے اور ظاہر یہ کرتا ہے کہ اللہ کی طاعت کر رہا ہے۔

یہی بات ہم ان ریس کلب والوں کو کہتے ہیں:

مذکورہ بالا صفحہ پر زیلعی خود لکھتے ہیں کہ ابن عمرؓ کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے تو

---

[1] حوالہ کے لئے دیکھئے عمدۃ القاری، ۱۴: ۱۶۱۔

ان کو سلام نہیں کیا، اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی کہ یہ ایسا کھیل ہے کہ کھیلنے والے کو با جماعت نماز ادا کرنے اور نماز کے علاوہ بھی ذکر الٰہی سے روکتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ حرام ہو۔[۱]

گھڑدوڑ اور دیر تک جاری رہنے والے دوسرے کھیل بھی نماز با جماعت اور ذکر الٰہی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ گھوڑوں کی کوئی جنگی اہمیت باقی نہیں رہی، اور ہمارے ملک میں یہ ہل چلانے کے کام بھی نہیں آتے۔ دیہات میں بھی عام لوگ سکوٹر یا سائیکل ہی استعمال کرتے ہیں۔ سوائے معدودے چند امراء کے۔ بس گھوڑوں کی اب ایسی کسی نسل افزائی اور تربیت کی ضرورت نہیں رہی جس کے لئے ریس کورس بنائے جائیں۔ اور وہاں لاکھوں روپے کی قیمت کا ایک ایک گھوڑا رکھا جائے۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں آج یہ عیاشی اور اسراف عوام اور غرباء پر ظلم کے مترادف ہے۔

بشکریہ سہ ماہی "منہاج" لاہور۔ پاکستان

---

[۱] (جلد ۶: صفحہ ۳۲)

شبلی نعمانیؒ حیات اور کارنامے

پر

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے اعتراضات[۱]

تیسری اور آخری قسط

ظفر احمد صدیقی لکچرر بنارس ہندو یونیورسٹی۔

ہم نے لکھا تھا کہ واقعۂ قربانی کی طرح علامہ شبلی نے "غزوۂ بدر" کے سلسلۂ واقعات کے بیان میں بھی تاویل و توجیہ سے کام لیا ہے اور جمہور مورخین و ارباب سیر کے برخلاف اس کو اقدامی کے بجائے دفاعی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ مستشرقین کے اس الزام سے بچا جاسکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیروؤں کو قتل و غارت گری کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے لکھا تھا کہ گو علامہ موصوف نے "اپنی دانست کی حد تک نقل و عقل، روایت و درایت اور فلسفہ تاریخ وغیرہ کی رُو سے اپنے دعوے کو مدلل و مستحکم" کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں موصوف کی تحقیق و تدقیق پر تاویل و توجیہ غالب ہے۔ "یہی وجہ ہے کہ بعد کے معتبر سیرت نگاروں میں کسی نے بھی ان کی ہم نوائی نہیں کی ہے، بلکہ مولانا عبدالواسع عثمانی نے تو ایک رسالہ ہی ان کی تردید میں تصنیف کر دیا ہے۔"

مولانا اصلاحی تحریر فرماتے ہیں "کیا کسی چیز کی تحقیق و تدقیق کا یہی معروضی انداز ہوتا ہے؟ آخر مقالہ میں اس موقع پر مولانا کے موقف کی تردید کے لئے زور اختراع سے کیوں کام نہیں لیا گیا۔؟ اور اپنی دانست کی حد تک نقل و عقل، روایت و درایت اور فلسفہ تاریخ وغیرہ کی رُو سے اپنے دعوے کو مدلل و مستحکم کرنے کی پوری کوشش نہیں کی گئی؟"

جواباً عرض ہے کہ فاضل مضمون نگار کو ہم پر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے سلسلۂ زیر بحث

---

[۱] تسلسل کے لئے اکتوبر کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔

میں علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی جیسے اکابر علماء اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسے نامور محقق سیرت کی پیروی کی ہے۔ ان حضرات کی تصریحات ذیل میں ملاحظہ ہوں،

علامہ شبیر احمد عثمانی:

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس سفر میں حضورؐ شروع ہی سے فوجی لشکر کے مقابلے میں نکلے تھے، جو مدینے پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آ رہا تھا، تجارتی قافلے پر حملے کی نیت آپ نے اول سے آخر تک کسی وقت نہیں کی، وہ فی الحقیقت اپنے ایک خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرۂ حدیث و سیر اور ارشادات قرآنیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ کفارِ محاربین جن کی دست بُرد سے مسلمانوں کی جان و مال کوئی چیز نہ بچی اور نہ آئندہ بچنے کی توقع تھی، ان کو جانی نقصان تو پہونچانا جائز سمجھا جائے، لیکن تجارتی اور مالی نقصان پہونچانا خلافِ تہذیب و انسانیت ہو۔"

(قرآن مجید، مع ترجمہ شیخ الہند و تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی مدینہ بکڈپو، سورۃ انفال) -

مولانا محمد ادریس کاندھلوی:

"یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوۂ بدر سے مقصد، قریش کے اس کاروانِ تجارت پر یلغار کرنا تھا، جو ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آ رہا تھا، قریشِ مکّہ کے کسی حملے کا دفاع مقصود نہ تھا، علامہ شبلی کی "سیرۃ النبی" میں رائے یہ ہے کہ غزوۂ بدر کا مقصد کاروانِ تجارت پر حملہ نہ کرنا تھا، بلکہ آپ کو مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینے پر حملہ کرنے کے لئے نکلے ہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مدافعت کے قصد سے نکلے اور بدر کا معرکہ پیش آیا... علامہ شبلی کا یہ خیال تمام محدثین اور مفسرین کی تصریحات بلکہ تمام صحیح اور صریح روایات کے خلاف ہے۔" (سیرۃ المصطفیٰ ۱/۴۲۹)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

"ایک طرف تو قریش کا مسلمانوں پر مظالم توڑ کر انہیں جلاوطنی پر مجبور کرنا، جلاوطنی پر ان کی جائیدادوں کا ضبط کر لینا اور ان کے نئے مسکن (حبشہ اور پھر مدینہ) میں وہاں کے حکمرانوں اور بااثر لوگوں کو ان تارکین وطن کو پناہ نہ دینے کی ترغیب دینا، دوسری طرف ان ناانصافیوں کا بدلہ لینے کے لئے مدینہ کے مسلمانوں کا قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا اور بہ زور قریشی قافلوں کی آمدورفت کو اپنے زیر اثر علاقوں میں روک دینا، یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ قریشی قافلوں کو لوٹ لینا، ڈاکہ اس وقت سمجھا جاتے جب یہ بے قصور ہوں، اور لوٹنے والے حکومت نہیں بلکہ خانگی افراد ہوں، ورنہ دو سلطنتوں میں کشیدگی پر نہ صرف جان بلکہ مال و آبرو کے خلاف بھی ہر فریق دوسرے فریق کو نقصان پہونچانے کا پورا حق رکھتا ہے۔

(عہد نبوی کے میدان جنگ، ص ۱۰)

مولانا اصلاحی نے ہمارے مقالے پر ایک تنقید یہ بھی فرمائی ہے کہ اس میں جابجا تضادات پائے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں ہماری بعض عبارتیں بطور مثال پیش کی ہیں کہ ایک ہی باب میں ایک جگہ ہم علامہ موصوف کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں تو دوسری جگہ تنقید کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ فاضل مضمون نگار کی پیش کردہ تمام مثالوں میں ہم نے ہر جگہ حیثیتوں کا فرق ملحوظ رکھا ہے۔ لہٰذا اس صورتِ حال کو تضاد بیانی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، مثلاً "سیرۃ النبی" کے علی الاطلاق سب سے عمدہ، جامع المعلومات اور محققانہ تصنیف ہونے سے انکار اور متکلمانہ و ادیبانہ حیثیت سے اپنے عہد کی تمام تصانیف سیرت میں سب سے بہتر ہونے کے اعتراف و اقرار میں کوئی تضاد نہیں، اسی طرح علامۂ موصوف کو ایک عہد ساز متکلم قرار دیتے ہوئے تاریخ علم الکلام میں در پردہ معتزلہ کی حمایت کی وجہ سے بحیثیت مورخ، جانبدار کہنے میں بھی کوئی تضاد نہیں یہی کیفیت مولانا اصلاحی کی پیش کردہ بعض دوسری مثالوں کی بھی ہے۔

اُردو کے ادیبوں اور ناقدوں کی عام روش رہی ہے کہ وہ مسلمہ ادبی شخصیتوں کا نام بالعموم کسی تعظیمی سابقے ولاحقے کے بغیر لیتے ہیں۔ اسی روشِ عام کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے بھی مقالے میں ہر جگہ "شبلیؒ" اور "سید سلیمان ندوی" لکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ مولانا اصلاحی نے اس کو ان دونوں بزرگوں کی توہین وتضحیک پر محمول فرمایا ہے جو خلافِ واقع ہے۔ تاہم مولانا کی خواہش کے مطابق مقالے کی زبان اس پہلو سے تبدیل کر دی جاتے گی۔

ہم نے مقالے میں بعض عبارتوں کے درمیان "فروتر"، "دیدہ دلیری"، "ایڑھی چوٹی کا زور" اور "ہتھکنڈے" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے ان الفاظ کو غیر علمی قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے متعدد الفاظ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں بھی استعمال ہوتے ہیں، لیکن یہاں بھی ہم مولانا اصلاحی کی تطبیبِ قلب کی خاطر ان عبارتوں کو تبدیل کر دیں گے۔

ہم نے لکھا تھا کہ علامہ شبلیؒ اپنے عہد کے ایک بلند پایہ اور عہد ساز متکلم تھے، تاہم علماءؒ کے حلقے میں ان کی اس حیثیت کا کما حقہٗ اعتراف نہیں کیا گیا، پھر اس کے سبب پر روشنی ڈالتے ہوتے لکھا تھا کہ "علامہ کی زندگی خشوع خضوع، تقویٰ، للّٰہیت، توجہ الی اللہ اور انابت کے اس معیار پر پوری نہیں اترتی، جو ایک متکلمِ اسلام کے شایانِ شان تصوّر کی جاتی ہے، اسلئے علماء کا ایک طبقہ ان کے متکلمانہ اقوال وافکار کو قدرے کم قابلِ التفات تصور کرتا ہے۔"

یہ ایک خالص علمی بحث تھی، لیکن مولانا اصلاحی نے نہ معلوم کس طرح اس عبارت کو علامہ شبلیؒ کی توہین وتضحیک پر محمول فرمایا ہے۔ بہرحال عرض یہ ہے کہ ہمارا متذکرہ بالا بیان مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی اور خود علامہ شبلیؒ کی درج ذیل تصریحات سے ماخوذ ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:

"عوام بھی اسی وقت کسی جدید خیال، نئی تحقیق اور مسلکِ عام اور قولِ مشہور سے علاحدگی کو گوارا اور برداشت کرتے ہیں، جب اس کے ساتھ نمایاں دینی زندگی،

ذوقِ عبادت اور زہد و تقویٰ ہی کی شان ہو، علامہ شبلی (جن سے زیادہ ان کے معاصرین میں کسی کی نظر تاریخ اسلام پر اتنی وسیع و عمیق ہوگی) نے بڑی خوبی اور صاف گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف اور تاریخ کے اس نتیجے کو بیان کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی 'حیاتِ شبلی' میں تحریر فرماتے ہیں:

"ایک زمانے تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بہت سے علماء اور ائمہ گذرے ہیں، جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علماء سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے اور لوگ ان کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے خیالات ان کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ ساتھ تھے، اس لئے وہ مقبول تھے اور یہاں یہ کیفیت نہیں۔"

(حیات عبدالحیٔ، ص ۶۵، ۱۶۴)

مولانا سید سلیمان ندوی:

"پھر اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع اور تقدس، جو علماء دین کا خاصہ ہے، نہیں تھا اور اس لئے ان علماء کی نگاہوں میں، جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا.... مولانا کی تصنیفات میں "علم کلام" اور "الکلام" ایسی دو کتابیں تھیں، جو مصنف کے ہزار احتیاطوں کے باوجود علماء کے نزدیک قابلِ اعتراض تھیں۔"

(حیات شبلی، ص ۵۷-۱۵۶)

مولانا اصلاحی نے اپنے گراں قدر مضمون کے آخر میں مقالے کی فہرست مآخذ و مصادر پر نظر ڈال کر یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ مقالہ ناقص اور سطحی ہے کیونکہ اس کا مواد اردو کی چند معمولی کتابوں سے ماخوذ ہے۔

جواباً عرض ہے کہ گذشتہ صفحات میں مختلف مباحث کے ذیل میں ہم نے جا بجا اپنے مآخذ

ومراجع کی نشان دہی کر دی ہے۔ اس کی روشنی میں ہمارے مآخذ کی نوعیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی ضمن میں مولانا اصلاحی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ہم نے "مولانا کے تلامذہ، معاصرین اور ان سے قریب تر اشخاص کو ماخذ بنانے کے بجائے، ان سے بہت کم درجے کے لوگوں کو ماخذ بنایا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ انھیں غیر معتبر مآخذ و ذرائع کا سہارا لے کر اوّلین و مستند ماخذ کی تردید و تکذیب کی گئی ہے۔"

مولانا اصلاحی کو یہاں بھی غلط فہمی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مقالہ اس صورتِ حال سے قطعًا مبرّا ہے۔ ہر جگہ معتبر و مستند مآخذ ہی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ غیر معتبر کے ذریعے مستند کی تردید کہیں بھی نہیں کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا نے مثالیں پیش نہیں فرمائیں ورنہ ہم مزید تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کرتے،

مولانا اصلاحی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں: "تعجب ہے کہ مقالہ لکھنے والے نے اعظم گڑھ سے وابستہ ہونے کے باوجود مولانا شبلیؔ کے خاندانی اور وطنی حالات لکھنے میں شیخ محمد اکرام کا سہارا لیا ہے، جو اعظم گڑھ سے سیکڑوں میل دور بیٹھ کر اپنی کتابیں لکھ رہے تھے۔"

جوابًا عرض ہے کہ علامہ شبلی کے خاندانی اور وطنی حالات کے سلسلے میں ہم نے کل ستائیس حوالے دیتے ہیں، جن میں بیس مولانا سید سلیمان ندوی اور محض تین شیخ محمد اکرام کے ہیں، بقیہ سات حوالے مختلف دیگر حضرات مثلاً عبدالحلیم شررؔ اور اقبال سہیلؔ وغیرہ کے ہیں، لہٰذا مولانا اصلاحی کا متذکرہ بالا الزام بے بنیاد ہے۔

ثانیًا شیخ محمد اکرام کی "یادگارِ شبلی" کو محض اس بنیاد پر نظر انداز کر دینا کوئی معقول امر نہیں کہ اعظم گڑھ سے سیکڑوں میل دور لاہور میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے۔ اصل چیز صحت و استناد کا وجود و عدم وجود ہے۔ اب سے بہت پہلے جب مولانا عبدالعزیز میمن کی "ابوالعلاء وما إلیہ" دارالمصنفین کے سلسلۂ تصانیف میں شامل ہو کر منظرِ عام پر آئی تھی تو مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں اس کی داد دی تھی:

"دارالمصنفین کی طرف سے ایک نئی عربی کتاب ابوالعلاء معری پر۔۔ مصر کے

مطبعۂ سلفیہ سے چھپوا کر منگوائی گئی ہے، یہ ہندوستان کے مشہور فاضل و ادیب مولانا عبدالعزیز میمن ... کی تصنیف ہے۔ اب تک بلادِ عربیہ میں اس شاعر پر جو کچھ لکھا گیا تھا، اس سے بہت زیادہ بڑھ کر اور ان سے زیادہ صحت، اور استیعاب کے ساتھ اس کتاب میں معلومات فراہم کی گئی ہیں"۔

(معارف، جنوری ۱۹۳۰ء)

فاضل گرامی مولانا ضیاء الدین اصلاحی راقم الحروف کے دیرینہ مخلص اور کرم فرما رہے ہیں۔ پیش نظر مضمون کا مقصد مناظرہ یا مخاصمہ نہیں بلکہ زیر بحث مقالے کے سلسلہ میں غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔ مولانا موصوف نے اپنے مضمون میں اصل مقالے سے ہٹ کر بھی بعض مسائل سے تعرض فرمایا ہے، لیکن ہم نے ان سے قصداً صرفِ نظر کیا ہے، تاکہ یہ مضمون علمی حدود سے متجاوز نہ ہو۔ یہ ضرور افسوس ہے کہ اس مضمون میں اگر ان کا قلم آزاد رہا ہوتا تو بہت سی ناگفتنی باتیں وہ نہ لکھتے۔

تفسیر سورۂ نور پر

ایک استدراک

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر افک و بہتان کا جو واقعہ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی میں پیش آیا اور اس سلسلہ میں ان کی برأت میں متعدد آیتیں سورہ نور میں نازل ہوئیں، قرآن مجید کی آیات میں حضرت عائشہؓ کے نام کا صراحتہً ذکر نہیں ہے، مگر متعدد احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام کا ذکر ہے خود حضرت عائشہؓ نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس کو امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور اس پر تقریباً امت کا اتفاق ہے، مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی نے ان احادیث پر جن میں اس کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف ہے جرح کی ہے اور انہیں غلط قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ ان آیات کے ذریعہ ان منافقین کی پردہ دری اور ان پر ملامت کی گئی ہے جو پاکدامن مسلمان عورتوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے تھے، ذیل میں مولانا زین العابدین حسن رضا کا ایک خط شائع کیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے مولانا کے خیال کی تردید کی ہے اور جمہور امت کی رائے کی تائید کی ہے، وہ اس موضوع پر مستقل تحقیقی مضمون بھی لکھ رہے ہیں فی الحال ان کا خط شائع کیا جا رہا ہے یہ خط مولانا نے اکتوبر ۸۶ء میں

الرشاد میں مولانا شبیر احمد صاحب کی کتاب مفتاح القرآن پر

تبصرہ کے بعد لکھا ہے" (ادارہ)

جامعہ مظہر العلوم دار الفتی

۱۰ رنومبر ۱۹۸۲ء

عزیز گرامی قدر مولوی نسیم احمد سلمہ اللہ تعالیٰ .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ

باعثِ تحریر یہ ہے کہ اکتوبر کے پرچہ میں مولوی شبیر احمد صاحب ازھر میرٹھی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے ان کی جسارت اور تکذیب حدیث صحیح اور خرق اجماع مسلمین کو ان کی تحقیق قرار دیا ہے، اگرچہ بہت کچھ بچ بچا کر آپ نے لکھا ہے پھر بھی قارئین کے ذہن میں ان کی سطحی تحقیق کی خوبی بیٹھ سکتی ہے، افسوس کہ آپ بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے، بخاری مسلم ہی نہیں ابوداؤد، ترمذی میں بھی حدیث افک اور اس کا حضرت عائشہ پر واقع ہونا کئی صحابہؓ سے مروی ہے، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ، اور حدیث افک کے واقعہ کے علاوہ حضرت عائشہ سے دوسرے طرق سے بھی ثابت ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرت عائشہ کی ذات سے ہے، اور جب اللہ تعالیٰ نے مکمل برأت نازل فرمادی تو " واسطہ در واسطہ عصمت انبیاء سے منافات کا شبہہ " جو نئے محقق نے پیش کیا ہے وہ خود ہی ختم ہو گیا۔

عزیزم! ———— حد ہو گئی کہ صحیحین کی روایت کو گھڑی ہوئی داستان جیسے گھناؤنے الفاظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اور خود تو دھوکہ کھائے ہی ہیں مغالطہ دینے کی کوشش بھی کی ہے، عقلی شبہات جو حدیث پر وارد کیا ہے اس کا جواب " واناجاریۃ حدیثۃ السن " مختصر جملہ خود ہی دے رہا ہے، ابواسامہ اور زہری کے سر اس داستان سازی کو تھوپنا سراسر مغالطہ دہی ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ اس حدیث کو عروہ بن زبیر سے ان کے صاحبزادے ہشام اور امام زہری نقل کرتے ہیں، پس ابواسامہ کا اس میں ذکر کرنا جو کہ عروہ کے شاگرد نہیں ہیں فریب دہی کے سوا کیا ہے؟، ہشام کے شاگرد البتہ ابواسامہ حماد بن اسامہ ہیں، اسی طرح زہری کے شاگرد فلیح بن سلیمان ہیں جو ہشام کے بھی شاگرد ہیں تو تقابل زہری اور ہشام کا ہے، نہ کہ زہری اور ابواسامہ کا تم بتاؤ کہ زہری اور ہشام دو جلیل القدر استاذ المحدثین مجروح ہو جائیں تو کس قدر

حدیثوں کے گلے پر چھری پھر جائے گی۔ ؟ ذرا مقدمہ صحیح مسلم میں ان دونوں پر مسلم کی وقیع رائے بھی ذہن میں رہے ،

اتنا بلند وبانگ دعویٰ کرنا اور حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر سے حدیث ام رومان پر صرف اعتراض نقل کرنا اور ابن حجرؒ کی فتح الباری سے صرف نظر کرلینا کس چیز کی غمازی کرتا ہے، ازہر صاحب کا مسروق کے صریح قول حدثتنی ام رومان" کو صرف اس لئے وہم بتانا کہ ضعیف قول کی بنا پر حضرت ام رومان کا انتقال عہد نبوی میں ہو گیا تھا، حالانکہ صحیح قول یہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں ان کی وفات ہوئی، خطیب بغدادی نے جو سنہ وفات ان کا عہد نبوی میں ذکر کیا ہے، صحیح حدیث سے اس کی خود تردید ہوتی ہے، بہرکیف یہ امت کو مغالطہ میں مبتلا کرنا ہی ہوسکتا ہے، خطیب کے اعتراض کو حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے اور ابن حجر نے مدلل اس کی تردید کی ہے، پس صرف اعتراض کو نقل کرنا اور جواب سے آنکھیں بند کر لینا فریب دہی نہیں تو کیا ہے ؟

واصبح ابوای عندی زہری کی روایت میں بھی ہے اور ابو اسامہ کی روایت میں بھی، کسی روایت میں اصبحت عند ابوی نہیں ہے، پس کیسے کہا جا سکتا ہے کہ "ایک روایت کی بنا پر یہ آیتیں حضرت ابوبکرؓ کے گھر نازل ہوئی ہیں اور دوسری روایت کی بنیاد پر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر" کیا صرف اس وجہ سے کہ ایک روایت میں لگے ہاتھ حضرت عائشہ کو اپنے گھر واپس لوٹنے کی تاکید مذکور ہے، اور دوسری میں اختصاراً اس کا ذکر نہیں ؟ اور کیا اسی سے یہ ایسا تضاد ہو گیا جس کی تطبیق کسی تاویل سے نہیں ہوسکتی ؟ جب کہ دونوں میں آگے چل کر یہ آرہا ہے واصبح ابوای عندی اس اختصار وتطویل کو اگر تضاد کہا جائے تو دوسری بہت سی حدیثیں بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں، نمونہ کیلئے حدیث معراج کو حضرت انس کی روایت عن ابی ذر اور انہیں کی روایت عن مالک بن صعصعہ کو بخاری کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الانبیاء میں ملاحظہ فرمالیں۔

اصول روایت اور اصول درایت پر اس حدیث کو رد کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور روایت عنعنہ کو مرسل زہری قرار دیا ہے یہ کہاں کا اصول ہے کہ عنعنہ کو مرسل قرار دیا جائے۔

کیا صرف اسی لئے مرسل زہری بتایا ہے کہ ان کی مرسل کو کسی صاحب نے غیر معتبر اور خراب قسم کی مرسل بتایا ہے؟ ستم یہ ہے کہ عروہ کے مدرج قول کو اس مغالطہ کیلئے بطور دلیل پیش کردیا ہے کہ انہوں نے خود حضرت عائشہ سے نہیں سنا ہے اس لئے کہ آگے آرہا ہے۔

قال عروۃ اخبرت انہ .... اور لم یسم دونوں فعل مجہول ہیں حالانکہ یہ زہری کا غایت احتیاط ہے کہ جو بات چاروں صحابہ سے بسند متصل نقل کرتے ہیں اس میں اس جملہ کو نہیں ملاتے جو تنہا عروہ نے روایت مجہولین سے نقل کیا تھا، تاکہ مدرج مسند سے الگ رہے اس کی وجہ سے مسند روایت ہی کی تغلیط کرنا صریح ظلم ہے۔

میں ازہر صاحب کی پوری تحقیق پر تعاقب لکھنے کو سوچ رہا تھا، مگر یہ خیال ہوا کہ اجماع مسلمین کے مخالف کی بات کو نقل کرنا خواہ تردید ہی کیلئے کیوں نہ ہو اس کے لغو قول کی ترویج ہو گی اور اس کو اہمیت دی جانے لگے گی۔ اور ایسی باتوں کا نوٹس نہ لینے سے آہستہ آہستہ لغویات لوگوں کے ذہن سے فراموش ہو جائیں گی۔ مگر آپ نے اچھے انداز میں تبصرہ کر دیا ہے اس لئے میں نے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، تاکہ آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس تحقیق کی محترم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے بھی تصویب فرمائی ہے، لیکن مولانا محترم کے مضمون "خدمتِ سلیمانی میں چند سال" میں سید صاحب کی اس ہدایت "تحقیق چاہے جو بھی کرو مگر جمہور محدثین فقہاء کی رائے سے ہٹنا نہیں چاہیئے" کے پیش نظر یہ بات ممکن نہیں معلوم ہوتی۔

میں نے خط میں جگہ جگہ اجماع مسلمین کا ذکر کیا ہے، اس کو فتح القدیر ج ۴ ص ۱۲ میں ملاحظہ فرمالیجئے "واجمع المسلمون علی ان المراد بما فی الآیۃ ما وقع من الافک علی عائشۃ ام المومنین" الخ۔ فقط والسلام

(مولانا) زین العابدین الاعظمی
(شیخ الحدیث جامعہ مظہر العلوم۔ بنارس)

الرّشاد کی ڈاک

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ ۵ رنومبر ۱۹۸۶ء، چہار شنبہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مزاج گرامی، معہ متعلقین، بخیر ہوگا۔

ماہنامہ "الرشاد" کا تازہ شمارہ "اکتوبر ۸۶ء" نظر نواز ہوا۔ یوں تو آپ کے تمام "رشحات" بہت پسند آتے ہیں۔ بلکہ دل کو چھو لیتے ہیں، مگر اس شمارے میں آپ کا مضمون "خدمتِ سلیمانی میں چند سال" بہت پسند آیا، سید صاحب پر میں نے بہت سے مضامین پڑھے جو "کاری گری" اور "فن کاری" کے اعلیٰ نمونہ تھے اور بے شمار علمی معلومات کے خزانہ تھے، مگر جو بے تکلفی، بیساختگی، برجستگی اور بیان کی صداقت، آپ کے مضمون میں پائی وہ اور جگہ مجھے بہت کم ملی، یہ میرا ذاتی تاثر ہے۔

آپ کے مضمون میں سید صاحب کی بعض باتیں تو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ جیسے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے "اجتماعی اور سیاسی چیزوں سے واقفیت ضرور رکھئے، مگر اسے غذا نہ بنایئے بلکہ اسے دسترخوان کی چٹنی ہی سمجھئے۔ جو لوگ چٹنی کو کھانا بنا لیتے ہیں انکی صحت خراب ہو جاتی ہے، پھر ان کا معدہ کھانا کھانے کے قابل بھی نہیں رہ جاتا۔" آپ کو خطاب کرتے ہوئے "جس موضوع پر لکھنا چاہو تو اتنا پڑھو کہ جس طرح پیالہ بھر جانے کے بعد چھلکنے لگتا ہے اسی طرح معلومات چھلکنے لگیں، پھر لکھنا شروع کرو۔" "دیکھو راستہ میں زیادہ لمبا چوڑا تعارف نہ کرایا کرو، بس نام بتا دینا کافی تھا۔" "صرف پڑھتے رہنے سے علم نہیں آتا، خود مطالعہ کرو تو

اعتماد پیدا ہوگا، "زندگی میں سکون آمدنی بڑھانے سے نہیں، بلکہ خرچ پر کنٹرول کرنے سے حاصل ہوتا ہے، آمدنی بڑھانا آسان ہے، مگر خرچ قابو میں رکھنا مشکل ہے، چونٹیوں کے منہ سے شکر جمع کرکے مٹھائی تیار کرنی ہوگی، "ملا آں باشد کہ چپ نہ شود"، وغیرہ۔

خط کچھ طویل ہوگیا ہے، معذرت چاہتا ہوں، کیا کروں؟ ؎

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

نسیم ظہیر اصلاحی سلمہٗ کو دعا، دیگر پرسان حال کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام

طالب دعا

عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی

جامعی

---

۲۰ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء۔ راندیر، سورت

محب مکرم محترم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی بخیر ہوگا، آپ کی خیریت اور حالات آپ کے مدرسہ کے سفیر جناب عقیل احمد صاحب سے معلوم ہوئی، بمبئی تشریف آوری کا بھی علم ہوا، اللہ تعالیٰ مدرسہ کے ہر کام میں اپنی غیبی نصرتیں شامل حال فرمائیں اور ہر قسم کی ضرورتوں کو اپنے خزانۂ غیب سے پورا فرمائیں، آمین آپ کو ذہنی سکون عطا فرمائے۔

خدا کے فضل سے طبیعت ایسی ہے کہ مسجد کی حاضری نصیب ہو جاتی ہے۔ گو پہلے کی طرح اب کام نہیں ہوتا، بہت ہی جلد تکان ہو جاتی ہے، نظر بھی کمزور ہو رہی ہے اور دماغی ضعف بھی محسوس ہوتا ہے۔ اللہ اپنا فضل فرماتے اور تا دم آخر اس مبارک خدمت میں محض اپنے فضل سے لگائے رکھے اور استقامت نصیب کرکے ذریعہ نجات بنادے، اپنی رضا نصیب کردے، آپ سے خاص دعاؤں کی درخواست ہے۔

خدا کے فضل سے فتاوی رحیمیہ کی جلد ششم طبع ہو گئی ہے، جناب عقیل احمد صاحب کے ہمراہ ارسال خدمت کی ہے، وصولی کی اطلاع فرمائیں تو موجب اطمینان ہوگا۔ آپ کی مشغولیات تو بہت زیادہ ہیں تاہم کچھ وقت نکال کر تحریر فرمادیں، اپنے حالات سے بھی مطلع کرتے رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت نصیب کرے، اور خوب خوب دین کا کام لے اور قبول فرمائے، مدرسے سے سچے اور پکے علماء ربانی، خادمِ دین، داعی الی اللہ پیدا ہوں، دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ فقط والسلام

(حضرت مفتی) سید عبدالرحیم لاجپوری

از لکھنؤ

۹ر نومبر ۱۹۸۶ء

مخدوم و محترم جناب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج گرامی؟ تقریباً عرصہ ڈیڑھ ماہ قبل جناب کا گرامی نامہ دستی موصول ہوا تھا، جس میں جناب نے حقیر کی تازہ کتاب "جدید میڈیکل مسائل" کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے کا بھی اظہار فرمایا تھا جس میں اس ہیچمیرز کے لئے کافی حوصلہ افزائی کا سامان تھا اور توقع تھی کہ وہ رائے عالی "الرشاد" کے جس شمارہ میں طبع ہوکر منظر عام پر آئے گی، کم سے کم وہ شمارہ تو ضرور باصرہ نواز ہوگا، مگر اس کے انتظار میں کافی مدت گذر چکی اور مایوسی ہو چلی تھی کہ ایک دن اچانک مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی (ایڈیٹر "البعث") نے یہ مژدہ سنایا کہ "الرشاد" کے شمارہ میں تمہاری کتاب پر تبصرہ آیا ہے، چنانچہ موصوف سے ہی وہ شمارہ لے کر متعلقہ حصہ پڑھا اور (خود آپ ہی کے ارشاد کے مطابق "تحسین شناس" کی گرانقدر رائے سے مطلع ہوکر حوصلہ افزائی ہوئی۔ جناب نے اپنی رائے کے ساتھ اس نارسا کی جس "رسائی" کا اعتراف کیا ہے وہ آپ کی تواضع اور انکسار کا آئینہ دار ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

دعائے خیر میں ضرور یاد رکھیں، خاص طور پر اس امر کی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس

حقیر کوشش کو قبول فرماتے اور اسے نافع بناتے۔ آج کل بقیۃ السلف عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب دامت برکاتہم یہاں ندوہ میں تشریف فرما ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ذات سے بیش از بیش استفادہ کی توفیق عطا فرماتے۔

فقط والسلام

احقر (مولانا) محمد برہان الدین (سنبھلی)

دارالعلوم ندوۃ العلماء

معہد ملت۔ مالیگاؤں

مورخہ ۴ نومبر ۱۹۸۶ء، سہ شنبہ

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت
در راہ قلب مرحلۂ قرب و بعد نیست
می گویمت ثناء و دعا می فرستمت

ذوالمجد والکرم حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی!

متعنا اللہ بطول بقائکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ارسال کردہ گرامی نامہ و قابل قدر تصنیفات آج کی ڈاک سے نظر نواز ہوتے، جس کے ذریعہ آپ کے اعظم گڈھ بخیریت پہونچنے کا علم ہوا۔

اسے حسن اتفاق کہیے کہ آج صبح مدرسہ جاتے ہوتے راستے میں جناب نظام الدین صاحب اعظمی سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے استفسار پر معلوم ہوا کہ آپ اعظم گڈھ وارد ہو چکے ہیں، اس لئے ایک روز روانگی سے قبل آپ نے انھیں اطلاع دی تھی۔

گرامی نامہ کی وصولیابی سے میں فرحت و نشاط اور مسرت و انبساط میں ڈوب گیا کہ اس کمترین و کم مایہ کو آنمحترم نے یاد فرمایا، نیز چند سطریں لکھنے کی تو زحمت گوارا فرمائی، اور آپ نے سویدائے قلب سے جس دعا کا ذکر کیا ہے، میں بھی صمیم قلب سے آمین کہتے ہوتے امیدوار ہوں کہ

ایسا ہی ہو۔ یقیناً آپ سے ملاقات میرے لئے سرمایۂ سعادت اور آیۂ رحمت ہی ہے۔ بقول شخصے؛

یک دو ساعت صحبتے با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

ارسال کردہ تصنیفات مدرسہ کے کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں، جیساکہ آپ نے تحریر فرمایا ہے، ساتھ ہی آپ نے الرشاد کی توسیع اشاعت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ انشاء اللہ میں اسے اپنے محدود حلقۂ اثر میں ادا کرنے کی کوشش کروں گا، ساتھ ہی خدمت گرامی میں عرض ہے کہ میرے نام سے گھر کے پتے پر "الرشاد" جاری کر دیجئے۔ انشاء اللہ قریب ہی میں سالانہ زر اشتراک ارسال کر دوں گا، لیکن چند ایک کا پیان زائد روانہ فرمائیں تو بہتر ہوگا، تاکہ ترغیب و تشویق کے لئے کام آسکیں۔

معہد ملت میں الرشاد کا نیا شمارہ اب تک موصول نہیں ہو سکا ہے، ایک مرتبہ ایڈریس چیک کر لیں تو ممکن ہے، یہ شکایت زائل ہو جائے۔

اخیر میں مولانا احمد کمال صاحب رشادی ندوی و دیگر خدام مدرسہ کو راقم کا سلام شوق عرض فرمادیں۔ اساتذۂ معہد بھی آپ کو تسلیمات مسنونہ عرض کرتے ہیں۔

والسلام

زبیر احمد ملی

لکھنؤ

۵ر نومبر ۱۹۸۶ء

حضرت مخدوم گرامی مولانا حبیب اللہ صاحب قبلہ مدظلہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا!

الرشاد پابندی سے مل رہا ہے، جس کے لئے مشکور وممنون ہوں۔ ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق آپ کے تجزیے بڑے ہی متوازن اور حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اداریوں کو میں نے "الرائد" کے اپنے کالم "نافذۃ علی الهند" میں بھی پیش کیا ہے، جو عرب ممالک کے اخبارات

میں بھی نقل ہوتے ہیں، خاص طور پر اخبار العالم الاسلامی میں۔ الرشاد کے اکتوبر ۸۶ء کے شمارہ میں "خدمت سلیمانی میں چند سال" تربیت سلیمانی کی ایک اچھی تشریح و تفسیر ہے۔

بار خاطر نہ ہو تو اسلامی فقہ دینی مدارس اور اق کی ذمہ داریاں عبادت و خدمت بھیجنے کے لئے دفتر کو ہدایت فرمادیں، عرصہ سے ان کتابوں کے مطالعہ کا اشتیاق ہے۔

والسلام

خادم

محمد یونس نگرامی ندوی

---

۴ راکتوبر ۱۹۸۶ء

مکرمی مجیب صاحب تسلیم!

خدابخش خطبات کے سلسلہ میں آپ کے فیصلے کا اور تاریخوں کا ایک مدت سے انتظار ہے، موضوع تو طے ہو ہی چکا ہے یعنی "فقہ اسلامی کا دائرۂ کار اور اس میں اجتہاد کی حیثیت"۔ اب آپ کی طرف سے تاریخیں مل جائیں تو آگے کا کام شروع کر دیا جائے۔ اکتوبر میں کوئی مناسب تاریخ رکھئے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا

عابد رضا بیدار

مشیر منزل، جامعہ نگر
نئی دہلی

۱۲ نومبر ۱۹۸۶ء

برادر محترم! السلام علیکم

پچھلے دو پرچوں سے الرشاد کی طباعت اور کتابت کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیے! اگرچہ ٹائیٹل رسالہ کی ثقاہت کے شایان شان نہیں ہے۔ سادہ ٹائیٹل رکھئے۔ اس وقت تو ٹائیٹل کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرے نمبر کا ادبی رسالہ ہے۔

تقسیم کے جو صاحب ذمہ دار ہیں انھیں توجہ دلائیے کہ ذرا غور سے پروف دیکھیں۔ ظاہر ہے آپ کے پاس اتنا وقت نہیں ہے لیکن جن صاحب کے سپرد یہ کام ہو وہ احتیاط برتیں۔ خصوصاً ناموں کے معاملے میں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ ناموں کو کتابت کے بعد آپ سے دوبارہ پوچھ لیا کریں کہ صحیح نام لکھے گئے ہیں یا نہیں۔ سید صاحب کے سلسلے میں آپ کے مضمون کو دو تین بار پڑھا۔ قضا بلکہ ای "حبیب منزل" والا معاملہ تھا نا، لیکن کتابت کی غلطیوں سے بڑی الجھن ہوئی، علی احمد کیانی کو دونوں جگہ (ص ۱۸) علی احمد کبھانی لکھا ہے، یا اسی طرح:

ص ۱۵۔ تین چار ساتھی نے طے کیا۔ ظاہر ہے آپ نے ساتھیوں لکھا ہوگا جو ساتھی رہ گیا۔

ص ۱۶۔ اس سفر کے چند طالب علمانہ یادیں قابل ذکر ہیں (کی ہونا چاہیے تھا)

ص ۱۷۔ اس لئے کہ غلبۂ قریش کی حکومت تھی۔ یہ لفظ مجھے نہیں معلوم۔ اس کے معنی مطلوب ہیں۔

ص ۱۸/۱۹۔ شام کو بچہ سے تنہائی میں فرمایا، دونوں جگہ مجھ کے بجائے بچہ لکھا ہوا ہے۔

ص ۲۰۔ حزم و یقین کے بجائے جزم و یقین۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مجھے ہی صحیح لفظ نہ معلوم ہو۔

ص ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۴۵ میں گجرات کے سفر میں گئے۔ حالانکہ یہ اکتوبر ۱۹۴۹ کی بات ہے،

ص ۲۶۔ دیباپہ کے بجائے دیباچہ۔

دوسرے مضامین میں دیکھ نہیں پایا، پہلے آپ والا مضمون پڑھا، یہ باتیں کسی اعتراض کی غرض سے نہیں ہیں، کہیں آپ برا مان جائیں۔

فقط والسلام

آپ کا خادم

مشیر الحق

نسیم ظہیر اصلاحی غازیپوری

نئی کتابیں

اقوال سلف مرتبہ مولانا قمر الزماں صاحب بانی و سرپرست مدرسہ بیت المعارف الہ آباد تقطیع ۱۸/۲۲ کاغذ و کتابت بہتر، صفحات ۲۸۸، قیمت ۲۱ روپے

ملنے کے پتے:-

۱ــ مکتبہ عزیزیہ ۵۰۳ بخشی بازار الہ آباد ، (۲) مکتبہ افضل المعارف وصی آباد الہ آباد

۳ــ مکتبہ اشرفیہ ۳۶ محمد علی روڈ بھنڈی بازار بمبئی ۳ ۔

بزرگوں اور علماء و مشائخ کے اقوال و احوال اور معمولات و ملفوظات کو جمع کرنا اور ان کے علمی اور عملی زندگی میں استفادہ کرنا ہمارے اسلاف کا قدیم ترین طریقہ رہا ہے چونکہ اہل اللہ کا کلام کتاب و سنت کا ترجمان اور انوار باطن سے معمور ہوتا ہے اس لئے اس کے اندر ایسی دلسوزی اور اثر انگیزی ہوتی ہے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ایسے بہت سے مجموعے عربی، فارسی اور اردو زبان میں موجود ہیں، جن میں سلف صالحین کے اقوال و احوال جمع کئے گئے ہیں، انہی میں امام عبدالوہاب الشعرانی متوفی ۹۷۳ھ کی شہرۂ آفاق کتاب "طبقات الکبری" بھی ہے، جس میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر دسویں صدی ہجری کے اوائل کے بیشتر صحابہ کرام، تابعین و تبع تابعین اور علماء و مشائخ کے ایسے مفید اور موثر اقوال جمع کئے گئے ہیں جو بقول فاضل مرتب " ان کے ہر ہر قول کو اگر روح شریعت اور جوہر طریقت کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا"

یہ کتاب شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی بہت پسندیدہ اور محبوب کتاب تھی آپ

اسے اپنی مجلس میں پڑھوانے کا اہتمام کرتے تھے، بقیۃ السلف مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ العالی بھی اس کتاب کے مواد و مضامین کو بہت پسند فرماتے ہیں اسی لئے اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت کا اظہار فرمایا، چنانچہ مولانا قمر الزماں صاحب (جو مذکورہ دونوں بزرگوں کے مسترشد ہیں) نے اس کتاب کی عام فہم انداز میں تلخیص و ترجمہ کردیا بیچ بیچ میں فوائد اور کچھ دوسرے مضامین کا حسب ضرورت اضافہ بھی کردیا ہے، اور ابتدا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اقوال وارشادات بھی برکت کیلئے شامل کردیئے ہیں پھر دسویں صدی ہجری کے بعد کے مختلف اکابر علماء و مشائخ کے ارشادات و معمولات آخر میں شامل کر کے "اقوال سلف" کے نام سے ایک ایسی کتاب تیار کر دی جو بقول مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ، انشاء اللہ عوام و خواص سبھی کیلئے بیحد نافع اور مفید ثابت ہوگی"

نقشِ حریت

از مولانا محمد حنیف صاحب ملی شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں
تقطیع $\frac{18}{24}$، کاغذ و کتابت و طباعت بہترین، خوشنما ٹائیٹل، صفحات ۵۶، قیمت ۸/ روپیہ۔ ناشر مجلس علم و ادب اسلام آباد مالیگاؤں۔

انگریزوں نے جونہی سرزمین ہند پر اپنا قدم جمایا اسی وقت سے مسلمانوں نے اور خاص طور پر علماء نے ان کے خلاف جہاد شروع کردیا تھا، کانگریس تو بہت بعد میں جنگ آزادی میں شامل ہوئی، مسلمانوں نے انگریزوں کے تسلط کے پہلے دن سے ہی ان کو ملک سے نکال باہر کرنے کیلئے اپنی ہر چیز کی بازی لگادی تھی، اور وہ مسلسل ڈیڑھ سو برس تک وطن کی آزادی کیلئے دار و رسن کی مصیبتیں جھیلتے رہے اور قید و بند اور ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہے، مسلمانوں کی انہی قربانیوں کی تفصیل اس کتاب میں بہت مختصر مگر نہایت شستہ و شیریں زبان، دلکش اور موثر انداز بیان میں پیش کی گئی ہے، اس ضمن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام، علماء کی سرفروشانہ خدمات، برٹش امپائر سے محاذ آرائی ریشمی رومال کی تحریک کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے، اس تحریک کے نتیجے میں معرض وجود ہونے والے قومی و ملی اداروں کے پس منظر پر بھی قدرے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان علماء وزعماء کا بھی کسی قدر تذکرہ ہے جنہوں نے اس تحریک حریت میں کلیدی رول ادا کیا ہے، اس سلسلہ میں غیر مسلم لیڈروں کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات بھی جگہ جگہ نقل کئے گئے ہیں، اور خاص طور پر اس گوشہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے آج کا متعصب ذہن وقلم نظر انداز کر دینے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے، تاریخ کے اس صبر آزما اور نازک ترین دور میں اپنے اسلاف کے اعلیٰ کردار، اولوالعزمی اور ان کی جرأت وعزیمت کو جاننے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ عام لوگوں کیلئے مفید اور اثر انگیز ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ۔

ندائے فضلاء یہ ایک دو ماہی رسالہ ہے جو مولانا جمیل احمد صاحب نذیری اور مولانا احمد الراشد صاحب کی ادارت میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارکپور سے ۳ ماہ قبل نکلنا شروع ہوا ہے، یہ قصبہ جہاں اپنی صنعت وحرفت میں مشہور ہے وہیں علمی ودینی حیثیت سے بھی اس کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے "ندوۃ الفضلاء" یہاں کے علماء وفضلاء کی ایک تنظیم ہے، زیر نظر رسالہ اسی کا آرگن اور ترجمان ہے، اس بنا پر پوری توقع ہے کہ یہ رسالہ علمی ودینی رعنائیوں کے ساتھ انشاء اللہ تادیر قائم رہے گا، ورنہ رسالہ نکالنا تو بہت آسان ہے مگر اس کو باقی رکھنا اور چلانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ رسالہ کا معیار نہ بہت خشک علمی اور تحقیقی ہے کہ عام لوگوں کیلئے اس سے استفادہ ممکن نہ ہو اور نہ ہی بالکل سطحی اور روایتی ہے کہ اس کا مطالعہ پڑھے لکھے آدمی کی طبیعت پر گراں ہو، بلکہ متوسط علمی معیار کے ساتھ مہذب اور صحتمند صحافت کا آئینہ دار، دین کے بنیادی افکار ونظریات کا داعی ومعلم اور بامقصد صحافت اور عالمانہ وقار کا اچھا نمونہ ہے۔

کتابت وطباعت دونوں متوسط درجہ کی ہیں، سائز $\frac{20}{26}$، قیمت فی پرچہ ۵/ روپیہ سالانہ چندہ ۲۵/ روپیہ ہے، ذیل کے پتہ پر طلب کیا جا سکتا ہے۔

مینیجر دوماہی "ندائے فضلاء" مبارکپور اعظم گڈھ یوپی

ٹوٹے ہوئے تارے از شاہ محمد عثمانی صاحب، تقطیع $\frac{20}{26}$ کاغذ کتابت وطباعت معیاری، قیمت ۳۰/ روپیہ مجلد مع خوشنما گردپوش

ناشر عثمانی پبلشنگ ہاؤس ۱۲۱ بی بلاک ذاکر باغ اوکھلا روڈ نئی دہلی۔

شاہ محمد عثمانی صاحب صوبہ بہار کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، قومی اور ملی جذبے سے سرشار جب انھوں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو تحریک آزادیٔ ہند کی صدائے بازگشت ہر طرف سنائی دے رہی تھی اس لئے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور تحریک آزادی میں ایک سپاہی کی طرح شامل رہے، دورانِ تعلیم طلبا اور نوجوانوں میں اصلاحی اور دعوتی کام بھی کرتے رہے، بعد میں مولانا ابوالکلام صاحب کے مشورہ سے رفاہی اور خدمت خلق کے کاموں کی طرف اس کا رخ پھیر دیا، پھر طالب علمی کے بعد سیاسی دلچسپیوں، رفاہی کاموں دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں اور صحافی مشغولیتوں سے وابستہ رہے اس لئے انہیں اپنے دور کی بہت سی تحریکی، سیاسی، صحافی اور علمی و دینی شخصیتوں کو دیکھنے، سننے اور ان کیساتھ رہنے کا موقع ملا، اور انہیں ان سے بہت سے تجربات اور مشاہدات بھی ہوئے، زیر نظر کتاب میں فاضل مؤلف نے انہی شخصیتوں سے اپنی ملاقات کا حال اور تاثرات پیش کئے ہیں، اس مجموعہ میں کئی شخصیتیں ایسی ہیں جن پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں تاہم ان مضامین سے انکی بعض خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے اور بعض نئے پہلو بھی سامنے آتے ہیں، ان میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا، لیکن فاضل مؤلف نے ان کی صلاحیتوں اور خصوصیات کی بنا پر ان پر بھی قلم فرسائی کی تاکہ نئی نسل ان کے نام اور کام سے واقف رہے فاضل مؤلف نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میرے مضامین میں پھولوں کی خوشبو بھی ہوگی اور کانٹوں کی چبھن بھی، جس کیلئے معذرت خواہوں اگر میرے مضامین کو مکمل طور پر بغور پڑھا گیا تو امید ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی"۔

چونکہ اس کتاب میں زیادہ تر ایسی شخصیتوں کا تذکرہ ہے جن کا تعلق کانگریس سے رہا ہے یا تحریک آزادی میں شریک رہی ہیں، اس لئے ان کے حالات بیان کرنے سے پہلے کانگریس اور اس کی تحریک کا ایک اجمالی تعارف بھی درج ہے۔ مقدمہ سے پہلے مؤلف کتاب کے صاحب زادے پروفیسر محمد حسن عثمانی صاحب نے

فاضل مؤلف کا تعارف کرایا ہے جس میں ان کے آباو اجداد، شجرہ نسب اور اہل خاندان سے بحث کی ہے۔ پھر ان کی ابتدائی تعلیم اور اس عہد کی سرگرمیوں کو بیان کرنے کے بعد زندگی بھر کی ان کی مختلف مشغولیتوں، ذاتی اوصاف و خصوصیات اور پھر سفر حجاز اور مکہ میں ان کے مستقل قیام وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، اس کتاب میں ۵۷ ممتاز شخصیتوں کے سلسلہ میں اپنے تاثرات اور تجربات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

كفاك علمًا بالعربية

یہ مولانا عبد الحمید صاحب رحمانی علیہ الرحمہ کی ایک اہم تالیف ہے، جو ابتدائی عربی پڑھنے والے طلبہ کیلئے لکھی گئی ہے، اس کے کئی حصے ہیں، یہ کتاب بالکل نئے انداز سے لکھی گئی ہے اور عربی اصول و قواعد اور گردانوں کی بھرمار لگانے کے بجائے قواعد کی طرف ہلکا اشارہ کر کے مثالوں کے ذریعہ اسے واضح کرنے اور طلبہ کے ذہن میں بٹھانے کی بہترین کوشش کی گئی ہے، چنانچہ جو بات بہت مشکل سے سمجھائی جا سکتی تھی اسے مثالوں کی مدد سے بڑی آسانی سے سمجھایا گیا ہے مولانا نے اس میں قواعد کو سمجھانے اور ذہن نشیں کرانے کا نیا راستہ اور طریقہ ایجاد ہے جو انہی کا حصہ ہے، یہ کتاب بیک وقت پڑھنے، سمجھنے، اور لکھنے اور بولنے کیلئے معاون ثابت ہوگی، یہ کتاب ابتدائی طلبہ کو پڑھانے اور ابتدائی درجات میں پڑھانے والے اساتذہ کے مطالعہ کے لائق ہے اس سے ان کو اپنے درس و تدریس میں مدد حاصل ہوگی۔ "معہد ملت" مالیگاؤں ضلع ناسک مہاراشٹر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ اور علم حدیث

یہ مولانا محمد حنیف صاحب ملی کا ایک مقالہ ہے جسے موصوف نے بھیونڈی کے ایک سیمینار میں پیش کیا تھا۔ اس مقالہ میں شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خدمات حدیث اور اس میں ان کی انفرادی حیثیت پر عام فہم انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، شاہ صاحب کی بوقلموں شخصیت کے ایک گوشہ کی جھلک اس کتابچہ کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

قیمت ۲۰ روپیہ ہے، مولانا محمد حنیف صاحب ملی شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں

سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پیغمبری کام

یہ ۵۰ صفحے کا ایک رسالہ ہے جس میں عام اسلامی زندگی میں برتے جانے والے معمولات کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ذکر واذکار کی فضیلت، دعوت و تبلیغ کے آداب، عبادات و معاملات کے طریقے اور اہمیت، عدل و وفا، صدق و صفا، نرم مزاجی، معافی و رحمدلی، حسن اخلاق، صلہ رحمی، خاندان اور میاں بیوی کے باہمی حقوق، غیروں سے ملنے اور تعلقات رکھنے کے آداب، اصول، گالی، گلوچ، ظلم و ستم اور طعن و تشنیع سے پرہیز، اور ذاتی زندگی میں کام آنے والی چیزیں مثلاً صفائی و ستھرائی، کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، پہننا اوڑھنا، بات چیت آداب مجلس، آداب صحبت، آداب سفر وغیرہ پر مشتمل ایک مفید رسالہ ہے، جو عام لوگوں کے مطالعہ اور استفادہ کیلئے اچھی چیز ہے۔ جناب حکیم حفیظ اللہ صاحب قاسمی اس کے مرتب ہیں اور ادارہ اشاعت سنت مدرسہ مفتاح العلوم ہندوستانی مسجد بھیونڈی ضلع تھانہ مہاراشٹر سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ قیمت ۴ روپیہ ہے۔

مختصر نصابِ اصلاحِ نفس

صوفی مولانا محمد الیاس صاحب جوش مالیگاؤں کے ایک بزرگ صوفی اور پیر و مرشد ہیں موصوف نے اپنے ارادتمندوں کیلئے کچھ معمولات مرتب کر دیئے ہیں۔ اسی کو عام سالکین طریقت کے اصلاح نفس کیلئے مفید سمجھ کر خانقاہ امدادیہ مالیگاؤں نے شائع کر دیا ہے، یقیناً اس سے عام لوگوں کی اصلاح اور اپنے نفس کے سدھار میں مدد حاصل ہوگی۔ قیمت ۳ روپیہ ہے، خانقاہ امدادیہ، امداد گنج آگرہ روڈ مالیگاؤں کے پتہ سے منگوائی جا سکتی ہے۔

شہر اعظم گڈھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارے کے شعبے اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں۔

ا۔ عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت و جلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ۲ درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ :۔ تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درسگاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے۔ جس پر کم از کم ۵۰ لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنے کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی، اے میں اور فضیلت پاس کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ایم۔ اے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں۔ (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

۲۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہیئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہو جاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ۱۰ شوال سے داخلہ شروع ہو جاتا ہے اور ۲۰ شوال تک ختم ہو جاتا ہے۔

Regd. No. Azm. / [illegible]
Regd. No. R. N[illegible]
Phone : 2481
DECEMBER 1986
MONTHLY JAM[illegible]UR RASHAD
AZAMGARH 276001 (U.P.) INDIA